ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

کھڑکی سے بالکنی اور بازار تک

یہ بات بہت اطمینان کی ہے کہ آپ انگریزی کے اُستاد ہونے کے باوجود اردو میں افسانے تحریر کر رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ دنیا جو یک سماجی ہو چکی ہے‘ جسے صارفیت کا سماج بھی بنایا جا رہا ہے جس میں ہم قوتِ خرید رکھتے ہیں تو خریدار‘ بہ صورت دیگر بکنے والی شے...... میں نے اس کتاب کے چوبیس افسانے تفصیل سے پڑھے ہیں۔ بیشتر افسانوں میں آپ نے اس آدمی کا کرداری تجزیہ کیا ہے جو ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے بالآخر صارفیت کے سماج کی شے بن گیا۔ آپ کے افسانوں میں وہ معصوم آدمی جھلک رہا ہے جسے اس تبدیلی کی خبر نہیں۔ ایسے آدمیوں سے ملاقات‘ خوشگوار تجربہ تو نہیں مگر اس کی معصومیت جان کر ایک بار پھر حیرانی ہوتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کے ہر افسانے پر تفصیل سے بات کی جائے مگر آپ کا ہر افسانہ آپ کے شعور کی ترجمانی خود کر رہا ہے۔ چلبلے‘ تیکھے اور مختصر فقروں میں معنی کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر ترسیل کی راہ ہموار کر رہی ہیں۔

آپ کے افسانوں کی ایک قاریہ .... سائرہ غلام نبی

دستیابی: سویرا پبلی کیشنز N-56‘ بلاک 6‘ پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس‘ کراچی۔

○

ادبی محفلیں

فریدہ حفیظ کے ان کالموں کی تاریخی حیثیت تو مسلمہ ہے۔ اُنہوں نے راولپنڈی‘ اسلام آباد کے جڑواں شہروں کے ادبی حلقوں‘ انجمنوں اور سرگرمیوں کو نہایت سلیقے کے ساتھ اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ وہ ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ کمال فریدہ حفیظ کا یہ ہے کہ وہ جڑواں شہروں راولپنڈی‘ اسلام آباد تک محدود نہیں رہیں اور نہ انہوں نے ادب کو دیگر فنونِ لطیفہ سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے کالموں کے اس خوبصورت مجموعے میں آپ کو ادب کے ساتھ مصوری‘ موسیقی‘ تھیٹر و اسٹیج‘ ریڈیو‘ ٹیلی ویژن اور فنونِ لطیفہ سے متعلق دیگر شعبوں اور اداروں کی سرگرمیاں بھی دکھائی دیں گی......محمد منشایاد

دستیابی: نیشنل بک فاؤنڈیشن‘ اسلام آباد۔

○

بارہ قباؤں کی سہیلی

ان کی غزل میں زمین کی مٹی پر آسمان چھایا ہوا ہے۔ شعر کے مضامین آسمان سے اُترتے ہیں لیکن اس کے مضامین نہال زمین سے اُگتے ہیں کانٹوں کے ساتھ لہلہا کر زندگی کرتے ہیں اور کئی اقسام کی حیرتیں جگاتے چلے جاتے ہیں......انور سدید

عذرا پروین کی شاعری مجھے ایک ناتراشیدہ ہیرے جیسی لگتی ہے۔ عذرہ کے خیال کی ندرتِ بیان کی حلاوت اور احساس کی شدت نے مجھے باندھے رکھا جس کے زیر اثر میں الف تا یے پورا مجموعہ پڑھنے پر مجبور ہو گیا......مظفر حنفی

جب میں عذرا پروین کی نظمیں پڑھتا ہوں تو نسائی نزاکت و لطافت کی جگہ مزاحمت و مقاومت کے رویہ سے خوشی ہوتی ہے۔ ایک ایسی باغیانہ سوچ‘ جو منفی اور مثبت سوچ کی نفی کرتے ہوئے ایک نئی سوچ سے پورے معاشرے کو بیدار کر دیتی ہے......حقانی القاسمی

دستیابی: ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس‘ وکیل سٹریٹ‘ کوچہ پنڈت‘ لال کنواں‘ دہلی‘ بھارت۔

○

زندگی کے ساتھ ساتھ

N.P.R- 063

چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو

چہارسُو

چہارسُو چہارسُو

جلد۱۹؛ شمارہ: ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۰ء

مجلسِ مشاورت

قارئین چہارسُو

زرِ سالانہ

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

''مشکل کُشا''

بارِ الٰہ!
مشکل گھڑی سے
ہم کو بچا

مانا ہم میں
گھنگار بھی
خطاوار بھی ہیں
مجرمِ انسانیت
منکرِ اسلاف بھی ہیں

وہ جن کے سروں سے
سایہ اُٹھا
سینچا لہو سے
اثاثہ لُٹا
ویراں ماؤں کی
گودیں ہوئیں
سر سے بیٹیوں کے
آنچل ڈھلا

سہا بہنوں نے
بھائیوں کا غم
باپوں کے آنگن میں رقص
موت کا ہوا

وہ تیرے جفا کار بندے
وہ تیرے
حیا کار بندے
وہ تیرے
بے ریا اور
جان نثار بندے
تجھ سے مدد چاہتے ہیں
مقصود اُن کو اب بھی
تیری رضا ہے
تیرے در سے
آس اُن کو لگی ہے
تو ہی اُن کا
مشکل کُشا ہے!!!

۔ بے دل بے دلی ۔

بانی مدیرِ اعلیٰ — سید ضمیر جعفری

مدیرِ مسؤل — گلزار جاوید

مدیرِ معاونین — بینا جاوید، فاری شا، محمد انعام الحق

چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو

رابطہ: 537، ویسٹریج-III، راولپنڈی۔فون: 92-51-5462495 فیکس: 5490181 ای۔میل: chaharsu@gmail.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

''اندازِ دلبری''

ہے اُس کے چہرے پہ اندازِ دلبری کیا خوب
ہوا ہے کوچۂ یاراں میں اس لئے محبوب

نہیں ہے گرمئ حالات سے گرفتہ وہ
کہ راہ ورسم میں اُس کی ہیں نفرتیں معیوب

وہ محفلوں میں خلوص و ادب کا پیمانہ
ہے دردمند دلوں میں ہراک ادا مرغوب

ہزار آئے مقامِ جنوں سنبھالا ......دِل
کسی نگاہِ ذر- و-جاہ سے نہیں مغلوب

ادب، شعور، فراست کا خوب رُونقاّش
ہر ایک نقش، نئے زاویئے، نیا اسلوب

بساطِ نقد ونظر پہ ہے کاظمی ۔ لازم
جہانِ رنگِ سخن میں ہے لازمی۔ مطلوب

وہ مسکرا کے بھی عرفاؔن غم چھپاتا ہے
وہ ایک چہرہ ہے کردار کا کھلا مکتوب

عرفان عابدی
(کراچی)

○
○○
○○○

قرطاسِ اعزاز
نقاّش کاظمی
کے نام

○○○
○○
○

"چاندکی دہلیز"

شعرونیہ رضوی

(آسٹریلیا)

نام: سیدحسبی اللہ کاظمی
تخلص: نقاش کاظمی
والد: سید فصیح اللہ کاظمی (مصنف اردوئے فصیح)
والدہ: سیدہ خورشید کاظمی
پیدائش: ۲۶فروری ۱۹۴۴ء
مقام: :جون پوریوپی انڈیا
شریک حیات: :گلزار فاطمہ (ایم۔اے)
اولاد: بیٹی شعرونیہ رضوی (مقیم ملبورن آسٹریلیا)
سیدرامش کاظمی (ایم۔بی۔اے مقیم انگلینڈ)
ڈاکٹرسیدعلی دانش کاظمی (ڈینٹل سرجن کراچی)
پتہ: 405/A بلاک 3 نقاش کاظمی روڈ گلشن اقبال کراچی
فون: 021-34801737
فیکس: 021-34966883
موبائل: 0300-2705354
ای میل: naqqash_Kazmi@yahoo.com
تعلیم: ایم۔اے (لسانیات) ایم،اے اردو (ادبیات)
ایم۔اے (سیاسیات) ایل ایل بی۔کراچی یونیورسٹی

اضافی قابلیت:
ٹی۔ای۔اینڈ۔ڈبلیو۔ایس (پاکستان) ٹیلی کیمونیکیشن
ایس۔ای۔ایس۔درجہ اول (سندھ) ایجوکیشن

مصروفیات:
چیئرمین لائبریری وادبی کمیٹی آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی
سیکریٹری پاکستان رائٹرز گلڈ (صوبہ سندھ)
رکن مجلس شوریٰ ہمدرد پاکستان
رکن عالمی شاعر کمیٹی ساکنان شہر قائد کراچی
سابق ڈویژنل انجینئر ٹیلی فونز (پی،ٹی،سی،ایل)
سابق لیکچرار شعبہ اردو۔ (ضیاءالدین میموریل کالج کراچی)
سابق لیکچرار ونگراں شعبہ اردو (سراج الدولہ کالج کراچی)
سابق Co-examiner (انٹرمیڈیٹ بورڈ کراچی)
سابق مدیر "برگِ گل" (سرسید نمبر برائے نصاب اردو ایم۔اے سال آخر جامعہ کراچی)

تصنیفات
۱ چاندنی اور سمندر (شاعری)
۲ رخ سیلاب (شاعری)
۳ رنگِ سفر (شاعری)
۴ دامن گل (شاعری)
۵ افروایشیائی ادیبوں کے مسائل اوران کا پس منظر (نثر)

زیرطبع:
۱ آدھی زبان کا آدمی (شاعری)
۲ میراث اور سرخیاں (ادبی تنقید)
۳ رنگ برنگ (بچوں کے لیے نظمیں)
اس کے علاوہ قریب تین صد مضامین مطبوعہ وغیر مطبوعہ

سیاحت:
بسلسلہ ادبی تقریبات، مشاعرے ونظامت، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، انگلینڈ، متحدہ امارات اورایران وغیرہ

اعزازات وانعامات:
صدراتی انعامات:
بدست غلام اسحٰق خان صاحب صدرِپاکستان (کراچی)
بدست فاروق لغاری صاحب صدر پاکستان (اسلام آباد)
بدست آصف علی زرداری صاحب صدر پاکستان (لاڑکانہ)
نشانِ اردو برائے امن (۱۹۹۸) اردو سوسائٹی آسٹریلیا، سڈنی۔
اردو دنیا خدمت ایوارڈ (۲۰۰۰) صوبائی گورنمنٹ، ٹورنٹو، کینیڈا۔
جدید اردو تحریک ایوارڈ (۲۰۰۰) نیویارک، امریکہ۔

☆

مرثیہ

(اکیسویں صدی اور حسینی مشن)

نقاش کاظمی

(۱)

دل کی فضا ہے سرد کچھ آتش نوائی کر
اٹھ انقلابِ وقت کی تو رہنمائی کر
مظلوم کائنات کی حاجت روائی کر
آوازِ حق اٹھے جو کہیں ہم نوائی کر
تاریک راستوں کو اجالا شناس کر
بڑھ بڑھ کے جلوۂ رخِ شب بے لباس کر

(۲)

پیاسی زمیں پہ نور کا دریا بہائے جا
جلتی فضا میں سوچ کی فصلیں اُگائے جا
کاندھوں پہ زندگی کی صلیبیں اُٹھائے جا
مقتل میں جسم و جان کے پرچم اُڑائے جا
سر کر سپردِ تیغ جہاں کربلا بنے
بندے کی کیا مجال کہ مثلِ خدا بنے

(۳)

وہ دشتِ نینوا ہو کہ دربارِ ملکِ شام
مردانِ حق کی شان، کہ ہوں تیغ بے نیام
راہِ وفا میں موت سے ہوتے ہیں ہم کلام
رکتے نہیں کبھی ہو جنہیں الفتِ امام
سینوں میں اپنے تیر ستم کو اتار کے
انسانیت کو بخش گئے دن بہار کے

(۴)

بزم جہاں میں شاہِ شہیداں کی شان ہے
صحنِ فضا میں سرخ پھریروں کی آن ہے
چادر سروں کی مثلِ رخِ بادبان ہے
جب تک بدن میں عزمِ حسینی جوان ہے
زنداں میں اٹھ کے پاؤں کی زنجیر توڑ دے
انگڑائی لے کے ظلم کی شمشیر توڑ دے

(۵)

آزاد رہ کہ بیعتِ فاسق نہ کر قبول
تاریخِ کربلا کا سبق ہے یہی اصول
خاموشیوں میں ظلمتِ شب کھینچ لے نہ طول
نعرہ لگا کہ ہم ہیں نئی صبح کے رسول
کیوں انتظار محشرِ عالم تباہ کا
ہو گا یہیں حساب ثواب و گناہ کا

(۶)

یہ تیر کیا ہے، رنگِ جفا کا اشارہ ہے
مشقِ ستم کے نام کا اک استعارہ ہے
اور آسمانِ وقت کا ٹوٹا ستارہ ہے
مانا کہ عشق و عاشقی کا گوشوارہ ہے
لیکن کمانِ جور پہ چڑھ جائے تو غضب
خونخوار بھیڑیئے کی طرح ہے حسب نسب

(۷)

ہاں تیر ہی تو ہے جو دلوں کے لئے ستم
ہاں تیر ہی تو ہے جو ہوا کے لیے قسم
ہاں تیر ہی تو ہے کہ نکلتا ہے جس سے دم
ہاں تیر ہی تو ہے کہ ہوئی آنکھ جس سے نم
ہاں تیر موجِ خوں کے لیے اک مثال ہے
ہاں تیر کیا ہے صرف کماں کا کمال ہے

(۸)

ہاں دورِ نو میں تیر و کماں کا کہاں وجود
جنگوں کے عہدِ نو میں بہت بڑھ گئیں حدود
اخلاق و اعتبار و وفا کے نہیں قیود
عالم تمام جبر کے آگے بصد سجود
میداں میں اب تو جنگ کے بارود آ گئے
بادل بموں کے طاقت وقوت پہ چھا گئے

(۹)

میزائلوں نے تیر کو نابود کر دیا
اب ''راکٹوں'' نے خانۂ تلوار بھر دیا
''روبوٹ'' موجدوں نے یہ کیسا بشر دیا
''ایٹم'' نے اب لڑائی کو تازہ ہُنر دیا
منظر کہاں سے لائیں ضعیف آسمان کا
اب صرف ذکر رہ گیا تیر وکمان کا

(۱۰)

اب پانیوں کی جنگ فضاؤں کی جنگ ہے
''سٹلائیٹوں'' کی جنگ خلاؤں کی جنگ ہے
آلودہ تابکار ہواؤں کی جنگ ہے
انسان کے سروں پہ بلاؤں کی جنگ ہے
لیکن وہ جنگ جو شہہ کرب و بلا لڑے
مستقبلِ حیات میں اب کوئی کیا لڑے

(۱۱)

کچھ لوگ ہیں یزید کا جھنڈا لئے ہوئے
آباء تھے جن کے خونِ حسینی پیئے ہوئے
کچھ لوگ اب بھی ہونٹ ہیں اپنے سیئے ہوئے
کچھ لوگ دامنوں میں ہیں صحرا لئے ہوئے
کچھ لوگ ہیں حسینؑ کا اونچا کئے علم
ہر چند ان کے ہاتھ بھی ہوتے رہے قلم

(۱۲)

اس قافلے میں پھول سے اصغرؑ نہیں ہیں اب
قاسمؑ نہیں ہیں اب علی اکبرؑ نہیں ہیں اب
عباسؑ سے علیؑ کے دلاور نہیں ہیں اب
ہاں پشتِ ذوالجناح پہ سرورؑ نہیں ہیں اب
اب سروری کو عابدؑ بیمار آ گئے
اور آئینہ میں کوچۂ و بازار آ گئے

(۱۳)

بعدِ حسین منہ پہ تمانچوں کی بات ہے
تاریخ پوچھتی ہے کہ وہ کس کی ذات ہے
شعلہ بداماں جس کے لئے کائنات ہے
کیا کربلا میں شامِ غریباں کی رات ہے
اُس شب کتابِ نور کے اوراق جلتے تھے
اہلِ حرم بھی خوف سے خیمے بدلتے تھے

(۱۴)

یوں آج ہو رہا ہے یہ میرا سخن تمام
یہ مرثیہ ہے محسنِ انسانیت کے نام
ہر سال یوں ہی ہوتے رہیں سب سے ہم کلام
اَے صاحبو! دعا ہے یہی میری صبح وشام
ہر کربلا شہیدوں کے اک بانکپن کی ہو
اکیسویں صدی بھی ''حسینی مشن'' کی ہو

ایمان گوارا نہیں کرتا

فیصل عظیم (کناڈا)

سید فصیح اللہ کاظمی نام، فصیح تخلص، گڑھ۔ ضلع الہ آباد یوپی (ہندوستان) ۱۳ جولائی ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی تعلیم بچپن میں حاصل کی۔ علمی وادبی صحبت کی تلاش میں کم عمری میں ہی گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور لکھنؤ میں تعلیم مکمل کی اور ۱۹۱۴ء یوپی کے شہر جونپور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ شمیم کے مدیر مقرر ہوئے، وہیں رہائش اختیار کی اور وہیں کے ایک معزز گھرانے میں شادی کرلی۔ ادب وصحافت کی ناقدری کی بناء پر خاطر خواہ ذریعہ معاش کی تلاش میں ۱۹۱۵ء میں ایسٹ انڈیا ریلوے میں ملازم ہوئے اور پٹنہ عظیم آباد میں رہائش اختیار کرلی اور زندگی کا بیشتر حصہ وہیں گزارا۔ ۲۴ سال کی عمر میں ۱۹۱۹ء میں اردو کی ایک کتاب ''اردوئے فصیح'' مرتب کی جو بارہ سال سے زائد عرصے تک پٹنہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل رہی جس کی پہلی اشاعت ۱۹۱۹ء، دوسری اشاعت ۱۹۲۲ء اور تیسری اشاعت ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ اس اثناء میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ اس زمانے کے کئی علمی وادبی شخصیتوں سے ملاقاتیں اور خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ ڈاکٹر محمد اقبال سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ اور خط وکتابت ہوتی رہی (جو اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی کئے گئے) دوسرے ذاتی اور مراسلاتی دوستوں کی حیثیت سے شمس العلماء نواب امداد امام اثر اکبر الہ آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، نیاز فتحپوری، جگر مرادآبادی، نواب نصیر خیال ٹرسٹی محمڈن کالج علی گڑھ، حسین شہید سہروردی کے ماموں اور والد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۵۰ء میں پاکستان آگئے اور کراچی میں رہائش پذیر ہوئے اور ۳ فروری ۱۹۶۲ء کو کراچی میں ہی وفات پائی۔ معاشی حالات زیادہ سازگار نہ ہونے کی بناء پر کئی کتابیں شائع نہ ہوسکیں اور ہندوستان میں ہی تلف ہوگئیں۔ ''پیام و سلام'' اور ''میں کون ہوں'' کے مسودے موجود ہیں جو ان کے صاحبزادگان کے پاس ہیں، کبھی کبھار شعر بھی کہتے تھے۔ غیر مطبوعہ کلام کا مجموعہ بھی موجود ہے طبیعت کی لاأبالی پن کی بناء پر زیادہ تر کلام ضائع ہوگیا۔

لاہور......۱۰۔ جولائی ۱۹۱۶ء

مکرمی تسلیم۔

آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے۔ حافظ شیرازی کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ میری مثنوی اسرارِ خودی کا ایک جزو ہے جو حال میں فارسی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں خواجہ حافظ کے تصوّف پر اعتراض ہے۔

میرے نزدیک تصوّف وجودی مذہب اسلام کا کوئی جزو نہیں بلکہ مذہبِ اسلام کی مخالف ہے۔ اور یہ تعلیم غیر مسلم اقوام سے مسلمانوں میں آئی ہے۔ صوفی عبداللہ صاحب اس خیال کے اظہار سے قال سے حال میں آگئے مگر یہ ایک خالص علمی اور تاریخی بحث ہے جس میں تاریخ و آثار سے مدد نہیں چاہیے۔ گالیوں سے کام نہیں چلے گا۔ صوفی عبداللہ صاحب نے گالیوں کی روش اختیار کی ہے اس کا جواب مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ تصوّف پر جو میرے خیالات ہیں ان کا اظہار میں متعدد مضامین میں کرچکا ہوں جو وکیل اخبار (امرتسر) میں شائع ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو اس بحث میں دلچسپی ہو تو وکیل کے وہ تمام نمبر ملاحظہ فرمائیے یہ مضامین گو لوگوں کے اعتراضات کا جواب ہیں۔

اور مضمون بھی لکھ رہا ہوں۔ صوفی صاحب کا رسالہ مدہوشی، بے خودی میں نے نہیں دیکھا۔ اگر آپکو ضرورت نہ ہو تو ارسال فرمادیجیے میں دیکھ کر واپس کردونگا۔ والسلام۔

آپ کا خادم محمد اقبال

لاہور......۱۴۔ جولائی ۱۹۱۶ء

مکرم بندہ۔ السلام علیکم۔

آپ کا مرسلہ پیام امید ملا۔ یہ رسالہ میرے پاس موجود ہے۔ واپس ارسال خدمت کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ایک اور نمبر ارسال کرتا ہوں۔ میں نے ان دونوں پر حاشیے مختصر لکھ دیئے ہیں۔ اگر آپ کچھ لکھنا چاہیں گے تو آپ کو ان نوٹوں سے مدد ملے گی اور تلاش سندات کی زحمت نہ اٹھانی پڑے گی۔

تصوّف کے متعلق میں خود لکھ رہا ہوں، میرے نزدیک حافظ کی شاعری نے بالخصوص اور عجمی شاعری نے بالعموم مسلمانوں کی سیرت اور عام زندگی پر نہایت مذموم اثر کیا ہے اسی واسطے میں نے ان کے خلاف لکھا ہے۔ مجھے امید تھی کہ لوگ مخالفت کریں گے اور گالیاں نہ دیں گے لیکن میرا ایمان گوارا نہیں کرتا کہ حق بات نہ کہوں شاعری میرے لیے ذریعہ معاش نہیں کہ میں لوگوں سے ڈروں آخر میں انسان ہوں اور سمجھ سے غلطی ممکن کیا یقینی ہے۔ نہ ہمہ دانی کا دعویٰ ہے نہ زبان دانی کا۔

افسوس ہے کہ مثنوی کی کوئی کاپی اب موجود نہیں۔ پانچ سو کاپیاں شائع ہوئی تھیں جو زیادہ تر احباب میں تقسیم ہوگئیں۔ اب کوئی کاپی باقی نہیں ورنہ ارسال خدمت کرتا۔ والسلام۔

آپ کا خادم محمد اقبال

لاہور......۲۳۔ فروری ۱۹۱۷ء

مکرم بندہ۔ السلام علیکم۔

آپ کا نوازش نامہ مل گیا جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ بہت عرصہ ہوا پیام امید ایک دفعہ دیکھا تھا۔ اس کے بعد ملاحظہ سے نہیں گزرا۔ اعتراضات کا تعلق جہاں تک زبان سے ہے اس کا رشتہ و واسطہ قائم ہوسکتا

ہے۔ یہاں ''سرودرفتہ'' تھااور وہی رہنا چاہیے۔

امید ہے کہ اربابِ فکرونظراس عاجزانہ گزارش پرخاص توجہ فرمائیں گے۔ جواب آسانی سے ہوسکتا ہے مگراس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ باقی رہے مطالب وہ زمانہ خود سمجھادے گا۔

جس تحریر کی بناپروہ آپ پرلائیل کا مقدمہ دائرکرنا چاہتے ہیں میری نظر سے کسی رسالے یا اخبار میں نہیں گزری' اگر پڑھوں تو قانونی اعتبار سے اس کے متعلق رائے دے سکتا ہوں۔ آپ کے پاس پیامِ امید کی وہ اشاعت ہوتو بھیج دیجیے۔ میں بڑی خوشی سے اپنے علم اور سمجھ کے مطابق رائے دونگا۔

افسوس ہے کہ میرے پاس بہت سی نظمیں نہیں ہیں' اب مجموعہ مرتب کرنے کی کوشش میں ہوں کہ اشاعت کروں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام۔

مخلص محمد اقبال

لاہور......۲۲۔جولائی ۱۹۱۹ء

میں نے مسٹر فصیح کی کتاب ''اُردوئے فصیح'' کا سَرسری مطالعہ کیا ہے۔ نثر اور نظم کے اقتباسات احتیاط کے ساتھ منصفانہ طور سے جمع کئے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ موئف نے اپنی تالیف میں بڑی محنت کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بلاشبہ ان کی کتاب اُردو کے طلباء کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

محمد اقبال

بیرسٹرایٹ لاء

☆

''رختِ جنوں''

عظیم تر ہیں وہ سب پیڑ دھوپ میں نقاش
مسافروں کے لیے جو کھڑے ہیں سارا دن

O

کہہ دو کہ ہر ایک شہر میں شب خون ہی مارے
اب فوج کی قسمت میں تو لشکر ہے نہ ملنا

O

بات کرو نقاش تو سطریں سچائی کی ہوں
جب بھی کوئی شعر کہو تو اچھی بحر کے بیچ

O

منا رہے ہیں جو کچھ لوگ جشن موسم دار
انہیں بتاؤ کہ اب رات جانے والی ہے

O

کس سے چھپتا ہے خون کا لہجہ
میرے قاتل' نشان بولتا ہے

O

ممکن ہے بیماری دل کی صورت اور کوئی ہو جائے
جب تک یارو جان مسیحا حال ہمارا جانے گا

O

نقاش سمجھنا کہ یہی رخت جنوں ہے
جب قطرۂ خوں دیدہ بیدار سے اترے

ترے چراغ کی لو جل رہی ہے سانسوں میں
قدم قدم پہ ترے نام کا اجالا ہے

O

سب دیدہ و دل فرش کیے بیٹھے ہیں کب سے
پھر زخم کوئی ناوک دلدار سے اترے

O

غیروں کی طرح آنا غیروں کی طرح جانا
یہ بھی کوئی آنا ہے یہ بھی کوئی جانا

O

اس پار بھی چاہو تو رہ رہ کے مہک لینا
اب صحن میں پھولوں کی دیوار اٹھانا ہے

O

پھولوں کی طرح کھل کے جو پل بھر ہے نہ ملنا
اس ڈھنگ کے ملنے سے تو بہتر ہے نہ ملنا

O

دل ملنا تو اک حادثۂ وقت ہے' لیکن
بچھڑی ہوئی چاہت کا مقدر ہے نہ ملنا

O

یہ خواہش بھی پوری ہوگی سر پر ایک گلاب کھلے
لیکن ہر موسم کے تازہ کانٹوں سے بھر جاؤ گے

حسن انتخاب: اقبال بھٹی (برمنگھم' برطانیہ)

براہِ راست ......

ذیل کی سطور میں صاحبِ ''قرطاسِ اعزاز'' کی مناسبت سے تحسین وآفریں سے مملو الفاظ واحساسات کثرت سے رقم ہوتے رہے ہیں' اس بار خدا معلوم کیوں ہمارے دل، دماغ میں مشترکہ طور پر ستائش کا ایک بھی لفظ تحریر نہ کرنے کا ارادہ باندھا ہے! اس بار ہماری خواہش ہے کہ ہم فن اور فنکار کو آپ کے روبرو کر کے درخواست گذار ہوں کہ جناب نقاش کاظمی کی نصف صدی پر محیط فنی ریاضت اور اُس کے ثمر میں ہمارے انتخاب کا مطالعہ' ملاحظہ اور محاکمہ کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنائیے!! آپ کا فیصلہ ہمارے لیے نہ صرف قبول بلکہ لائقِ احترام بھی ہوگا جس کی روشنی میں مستقبل کی راہیں روشن اور کشادہ ہونے کی قوی امکانات ہیں!!!

......**گلزار جاوید**

☆ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ کے شعور کی آنکھ کراچی میں واہوئی ہے' کچھ آبا اور خاندانی پس منظر کا بیان ضروری ہے؟

☆☆ میرے شعور کی چشم بینا یقیناً کراچی جیسے شہر میں واہوئی جو پاکستان کا تجارتی' صنعتی اور ثقافتی شہر ہونے کے ساتھ ساتھ اس وقت کا دارالحکومت بھی تھا۔ جہاں علمی' ادبی اور تعلیمی سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔ اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں معاشرے سے وجود اور وجود سے شعور متعین ہوتا ہے لہٰذا اسکول سے کالج اور کالج کی سطح سے یونیورسٹی تک میرے وجودی احساس نے مجھے شعور اور بامعنی شعور عطا کیا جس سے میں زندگی کی شاہراہ پر کبھی آہستہ روی اور کبھی تیز گامی کے ساتھ علم و عمل اور تخلیق و تعمیر کا پشتارہ سنبھالے رواں دواں رہا۔ میرے اس سفر میں میرے اساتذہ میرا ذوقِ مطالعہ' وقت کی سنگینیاں اور والدِ محترم سید فصیح اللہ کاظمی کی خصوصی تربیت توشۂ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ والد صاحب یوں تو ایسٹ انڈیا ریلوے میں ملازم تھے لیکن ان کی کتاب ''اُردوئے فصیح'' کلکتہ ایجوکیشنل بورڈ کے تحت پٹنہ یونیورسٹی (بہار) کے انٹرنس کے کورس میں تقریباً 12 سال تک شامل رہی۔ والد صاحب کا تعلق گڑھ مانک پور الٰہ باد سے تھا اور والدہ محترمہ خورشید کاظمی کا یوپی شہر جون پور سے تھا۔ آباؤ اجداد ایران سے ہندوستان آکر بسے تھے جن میں سے کچھ کا تعلق سیاست' وکالت' عدالت سے تھا اور کچھ کا سروکار زراعت سے تھا۔ البتہ تمام لوگ اعلیٰ ذوق کے حامل تھے۔ ہم خاندان میں 5 بہنیں اور 4 بھائی تھے۔ جن میں سے ایک بھائی اور ایک بہن اللہ کو پیارے ہو گئے اور اب تو والد والدہ بھی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا والد صاحب علمی وادبی ذوق رکھتے تھے سو اسکول میں داخل ہونے سے قبل ہی دینی تعلیم کے علاوہ آمدن نامہ' گلستان و بوستان کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کی بانگِ درا بھی پڑھا دی تھی۔ اب میرا مختصر سا خاندان ہے۔ بیگم گلزار فاطمہ (ڈبل ایم اے) بیٹی۔ شعرونیہ ندیم رضوی سائنٹسٹ' مصورہ بھی ہے۔ مقیم ملبورن آسٹریلیا، بڑا بیٹا علی رامش کاظمی MBA تعلیم انگلینڈ چھوٹا بیٹا ڈاکٹر علی دانش کاظمی ڈینٹل سرجن مقیم کراچی۔

☆ والدین کی زبانی ہجرت کے اسباب ازاں بعد احساسات سے بھی آگاہی دیجیے؟

☆☆ والد صاحب ریلوے کی ملازمت سے ریٹائر ہو گئے اور ہمارے ننھیال جون پور آ بسے لیکن بڑے بھائیوں اور والد صاحب کو زمینداری وغیرہ سے دلچسپی نہیں تھی اور ہندوستان میں ملازمتوں کا فقدان تھا لہٰذا بڑے بہنوئی اور بہن کی ایما پر 1953 میں پاکستان آ گئے چونکہ وہ لوگ پہلے ہی پاکستان آ چکے تھے۔ بڑے بھائیوں کو کافی تگ و دو کے بعد ملازمتیں ملیں جو کبھی چھوٹ جاتیں ابتدائی دنوں میں ملک کی یہی صورتحال تھی۔ البتہ ہجرت کے دلدوز اور دردناک حالات سے براہ راست واسطہ نہیں پڑا۔ پاکستان آکر بمبئی بازار کھارادر میں اپنی بہن کے ساتھ رہے پھر ''اشرافیہ'' کے ایک گروپ کے ساتھ کچے پکے مکانوں میں رہے اور رفتہ رفتہ حالات بہتر ہو گئے۔ چونکہ میں والدین کے ساتھ جون پور سے بمبئی ریل سے آیا تھا اور بمبئی سے کراچی پانی کے جہاز سے۔ لہٰذا مجھے ریل اور سمندر کا سفر ابھی تک یاد ہے۔

سمندروں کے سفر سے تو یونہی لوٹ آئے
ہماری پیاس بجھائی وفا کے صحرا نے

☆ سخنوری اور سخن سازی کا آغاز کب اور کس تحریک پر ہوا؟

☆☆ ادب' موسیقی' مصوری' خطاطی' فنکاری کا موسم تو فطری' پرداخت کے اندر ہی موجود تھا۔ جو باری باری عمرِ رواں کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو ظاہر کرتا رہتا سو 11-12 سال کی عمر میں سخنوری اور سخن سازی نے احساسات کے اظہار کو وسیلہ بنانا چاہا جس میں شاعری کو فوقیت حاصل ہوئی۔ ابتدائی اظہار و ابلاغ کے لیے کسی تحریک کی ضرورت نہیں پڑی البتہ آگے چل کر تحریک برائے تحریک نے اثر ڈالا اور اظہاری وسیلے کا رخ تبدیل ہو گیا۔

بینائی کا کوئی تو محرک ہو نقاش
دید آئے گی کیسے بنجر آنکھوں میں

☆ باقاعدہ رہنمائی اور ترقی کی منازل میں معاونت کب کب اور کہاں سے حاصل ہوئی؟

☆☆ دلچسپ بات یہ ہے کہ والد صاحب اور بڑے بھائیوں نے ہمیشہ شاعری کی مخالفت کی لیکن ادبی نشستوں' مطالعہ اور کتب بینی نے شاعری کے دیئے کی لو کو ہمیشہ بڑھاوا دیا۔ ترقی کے منازل طے کرنے میں بین الصوبائی مشاعروں مقابلوں کی فضا اور آگے بڑھنے کی تمنا نے رہنمائی کی اور مشق

EXERCISE نے سخن وری کو صقیل کرنے میں مہمیز کا کام دیا۔ ہاں ابتدائی دنوں میں اگر کسی نے میرے کلام کو سن کر یا پڑھ کر کوئی مشورہ دیا اور مزاج نے قبول کیا تو میں نے اس مشورہ کو رد نہیں کیا۔

☆ سید حسبی اللہ کاظمی کو نقاش کاظمی کا لبادہ کب اور کس طریق پر پہننا پڑا؟

☆☆ اول اول سید حسبی اللہ کاظمی نے ''کاظمی'' کو تخلص کے طور پر استعمال کیا لیکن فرسٹ ایئر میں آ کر ضرورت پڑی کہ باقاعدہ تخلص اختیار کیا جائے۔ لہٰذا بہت غور ہوا' دوستوں نے بھی نظر دوڑائی مگر کچھ بنائے نہ بنی۔ ایک دن میں اپنے ایک دوست کے ستھ ایک فوٹو گرافر کی دوکان کے سامنے سے گذر رہا تھا جہاں سائن بورڈ پر لکھا تھا ''عکاس'' ان دنوں میں شاعری کے ساتھ خطاطی' مصوری (PAINTING) اور ڈرائنگ بھی کرتا تھا۔ میں نے سوچا ''نقاش'' تخلص رکھا جائے۔ پھر دوستوں کے درمیان بات رکھی اور کافی غور وخوص کے بعد نقاش طے ہو گیا۔ اب نقاش کاظمی سے قبل چند سال نقاش انقلابی بھی استعمال ہوا۔ ''نقاش'' کی بحث میں اس بات پر زور دیا گیا کہ تخلص میں ''قاف'' اور ''شین'' کی ادائیگی مشکل ہو گی جبکہ میں عوام' مزدور' انقلاب اور تحریکوں کا شاعر بن رہا تھا۔ میں نے یہ جواز پیش کیا کہ غالب کا ''غ'' اقبال کا ''ق'' جوش کا ''ش'' اور فیض کا ''ف'' ادا ہو سکتا ہے تو ہمارا بھی نون' قاف' الف' شین۔ ادا ہو سکے گا۔

☆ دو ناموں کی بدولت شخصیت پر دوہری رنگت یا دوہرے اثرات کس حد تک مرتب ہوئے؟

☆☆ علم الاعداد یا NUMEROLOGY کے اعتبار سے اگر دو ناموں کے اعداد موافق ہوں تو بہتر اور اگر مخالف ہوں تو منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن اتفاق سے میرے دونوں ناموں کے اعداد آپس میں مثبت رویے کے حامل ہیں۔ البتہ کبھی کبھار یہ ضرور ہوا کہ کوئی کام ٹھیک ہوتے ہوتے خراب ہو گیا یا کوئی کام خراب ہوتے ہوتے اچھا ہو جاتا۔ دونوں ناموں کے اثرات کے زیر اثر نفع ونقصان کا سودا طے کرتے ہوئے زندگی کا سفر ہوتا رہا لیکن میں سینٹرل فارورڈ کھلاڑی کی طرح گیند کو ہمیشہ گول تک پہنچانے میں کامیاب رہا۔ چونکہ مجھے جہد مسلسل پر یقین رہا تھا۔ دفتری ماحول میں میں سید حسبی اللہ کاظمی اور باہر کی فضا میں نقاش کاظمی ہوتا۔ لیکن نقاش کاظمی میرے ذات سے کائنات تک کے سفر پر حاوی رہا۔

☆ پہلے شعری مجموعے کی آمدن کس قدر رہوئی اور کس جذبے کے تحت مادرِ علمی کی نذر کی گئی؟

☆☆ اس وقت (1979) کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے کراچی یونیورسٹی کے امدادی فنڈ میں سابق طالب علموں سے ایک روپیہ فی کس امداد دینے کی اپیل کی۔ میں نے اپنے ایک دوست کے تعاون سے شعری مجموعہ ''چاندنی اور سمندر'' شائع کیا اور اسے جامعہ کراچی کو نذر کر دیا چونکہ میں بھی ایک سابق طالب علم تھا۔ مجموعہ کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ میں نے کوئی حساب نہیں مانگا۔ مذکورہ مجموعہ کلام میں بڑی اہم نظمیں اور غزلیں شامل تھیں یہاں تک کہ جامعہ کراچی پر کہی جانے والی پہلی نظم بھی! کتاب کا انتساب بھی ''گلزار جامعہ'' کے نام تھا۔

☆ نیشنل سٹیڈیم کراچی' بیس ہزار کا مجمع اور کتاب کی رونمائی کی تفصیل اور وجوہات کے علاوہ احبابِ ادب کے تاثرات کی بابت ارشاد فرمایئے؟

☆☆ ساکنانِ شہر قائد کے زیر اہتمام نیشنل اسٹیڈیم کراچی میں سالانہ عالمی مشاعرہ منعقد ہوتا ہے جس میں 20-15 ہزار سامعین ہوتے ہیں۔ میں چونکہ مشاعرہ کمیٹی کا رکن ہوں لہٰذا موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ''رخِ سیلاب'' کا تعارف ہوا اور رونمائی کی گئی اور صاحب صدر کو کتاب پیش کی گئی۔ احباب ادب میں یہ اقدام حسد نہیں بلکہ رشک کی نظر سے دیکھا گیا شاید یہی وجہ ہے کہ اس مجموعہ کلام کے اب تک چار ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ جس میں بغیر اجازت ایک ایڈیشن بھی شامل ہے۔ یہ امر بھی محل نظر آتا ہے کہ ویلکم بک پورٹ کے ریکارڈ پر یہ پہلا شعری مجموعہ ہے جو اس ادارہ نے شائع کیا تھا

☆ آپ اردو شاعری کی تمام اصناف میں مہارت کے حامل ہیں قلبی سکون اور اطمینان کس صنف کی تخلیق میں زیادہ آیا کرتا ہے؟

☆☆ نظموں میں۔ اس کے بعد غزلوں میں۔

☆ غزل کے مستقبل اور مزاج مثلاً وحشی اور نیم وحشی کی بابت آپ کا حسنِ ظن کیا ہے؟

☆☆ معلوم نہیں فاضل نقاد نے غزل کو ''وحشی'' سے کیوں تعبیر کیا غزل نہ وحشی ہے نہ نیم وحشی دو مصرعوں میں مکمل اظہار کا سلیقہ ہے۔ اور سلیقہ وحشی نہیں ہوا کرتا میں نظم کا شاعر ہوتے ہوئے بھی یہ کہہ سکتا ہوں کہ جب تک مشرقی شاعری زندہ ہے غزل بھی نغمہ ریز رہے گی۔

☆ نظم کی سمت نمائی بھی کچھ زیادہ اطمینان بخش نہ ہے' نظم معریٰ' پابند نظم' آزاد نظم' نثری نظم وغیرہ کی بابت بے اطمینانی بڑھنے اور اسے کم کرنے کی بابت اپنے خیالات سے مستفید فرمایئے؟

☆☆ اردو ادب میں نظم کی سمت نمائی یقینی طور پر کچھ زیادہ نہیں اسکی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ اردو میں ''نظم'' گوئی کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہے مقابلتاً یونان وروما کے۔ اس کے باوجود اردو کے نظم نگاروں نے نئی نئی جہتیں تلاش ضرور کی ہیں جن کا آغاز مثنوی گویوں کے بعد آزاد' حالی اور شبلی سے ہوتا ہوا اقبال' جوش' فیض اور راشد تک آتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا نظم معریٰ (BLANK VERSE) اور آزاد نظم (FREE VERSE) ن۔م راشد نے بڑی نظمیں کہیں ہیں جبکہ راہی معصوم رضا نے ''اٹھارہ سو ستاون'' لکھی جمیل الدین عالی بھی ''انسان'' کے عنوان سے لکھے جا رہے ہیں۔ جبکہ پابند نظموں کے بہت سے شاعر پیدا ہوئے جیسے خواجہ الطاف حسین حالی اور جوش ملیح آبادی علامہ اقبال وغیرہ۔ نثری نظم یعنی PROSE POEM نے ابھی تک کوئی اہم کارنامہ انجام نہیں دیا۔ جبکہ

میرے مطالعے کے مطابق سجاد ظہیر نے 1957 سے قبل نثری نظم پر کافی محنت کی تھی۔اردو نظم کے معاملے میں واقعتاً بڑی بے اطمینانی ہے جس کو کم کرنے کیلئے مجھ سمیت تمام شعراء کو بڑی جانفشانی کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ ہمارے شاعر نظم کو بہت سرسری اور فن آسانی کی شاعری کیلئے برتتے ہیں۔

☆ ہائیکو' ثلاثی' ماہیا اور دیگر بے شمار نئی اصناف کی جانب نوجوان شعرا کی توجہ کس طرح کے امکانات ظاہر کررہی ہے؟

☆☆ ہائیکو' ثلاثی اور ماہیا نئی نسل کے طبع سخن میں شامل ہے لیکن انہیں بھی بہت زیادہ سنجیدہ حیثیت حاصل نہ ہوسکی۔ ہائیکو طرز سخن جاپانی ادب سے آ رہی ہے جو کہ تین مصرعوں 5-7-5 ارکان پر مشتمل ہیں۔مثلاً

تو مت آیا کر
پہروں ٹھہرا رہتا ہے
آنکھوں میں منظر

ثلاثی بھی تین مصرعوں کی شاعری ہے جسکی ایجاد کا سہرا حمایت علی شاعری کے سر ہے

تو بھی معصوم ہے مریم کی طرح
میں بھی تنہا ہوں خدا کی مانند
آمٹا دیں یہ تفاوت یہ جمود

رہا سوال ماہیے کا تو ماہیا پنجابی' کشمیری اور ہندکو زبانوں میں گایا گیا لیکن اس صنف کے مجموعے گذشتہ 50 کی دہائی میں مرتب ہوئے۔جبکہ اردو میں چراغ حسن حسرت اور اختر شیرانی وغیرہ نے ماہیے لکھے۔لیکن انہیں گیت کی شکل دیدی۔یہ بھی تین مصرعوں کی شاعری ہے جس کا ''میٹر'' اب بھی زیر بحث ہے مثلاً

باغوں میں پڑے جھولے
تم بھول گئے ہم کو
ہم تم کو نہیں بھولے

ممکن ہے کمپیوٹر کے اس مختصر نویس عہد میں یہ چھوٹی چھوٹی نظمیں کچھ رنگ دکھا جائیں۔

☆ پہلے زنانہ' مردانہ ادب کی تخصیص ہوا کرتی تھی' اب لاہوری' کراچی اور پشاوری ادب کے در بھی وا ہوتے جا رہے ہیں۔آپ کے خیال میں ہوا کا رخ کس جانب ہے؟

☆☆ میں اس سوال سے اتفاق نہیں کرتا جس انداز سے سوال اٹھا ہے بلکہ یہ کہوں گا کہ پاکستان اور بھارت کے طرز سخن' ڈکشن اور لفظیات و معنیات میں واضح فرق ہے۔ہاں تاریخ کا مادی شعور رکھنے والے اذہان زبان' ادب اور کلچر کے تاریخی و جغرافیائی معاملات کو سمجھ سکتے ہیں۔ادب کو ہوا کا رخ تو یونان و روما' عرب و عجم' مشرق و مغرب' پاک و ہند اور پھر علاقائی ادب کے حوالوں سے متعین ہوگا ہی۔چونکنے کی بات نہیں۔

☆ مزدوروں کے عالمی ترانے کا ترجمہ کب اور کس تحریک پر کیا؟

☆☆ مزدوروں کے عالمی ترانے ''انٹرنیشنل'' کا منظوم ترجمہ 1972 میں کیا۔جبکہ ذوالفقار علی بھٹو دور میں یکم مئی محنت کشوں کے عالمی دن کے طور پر منایا جانے لگا تھا یہ نظم یا ترانہ

یہ جنگ آخری ہے بس اب آخری ہے جنگ
اٹھو سزائے جھوک کے نادار قیدیو
اٹھو زمیں کی گود کے نحیف ساکنو
اٹھو کے آنے والا ہے انصاف کا چلن
یہ جنگ آخری ہے

یہ ترانہ دنیا کی ہر زبان میں موجود تھا اور یکم مئی کو دنیا بھر کے مزدور جب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو یہ ترانہ گاتے ہیں۔ پاکستان کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے یہ ترانہ گایا جاتا تھا۔ترانے کی دُھن اور آرکسٹرا بھی مزدور رہنماؤں کا COMPOSE کیا ہوا ہے۔

☆ آپ کی اپروچ کے ڈانڈے ترقی پسندی یا مارکیسیت سے کس طور ملتے ہیں؟

☆☆ میں اوائل عمری سے ہی مزدوروں' کسانوں اور محنت کشوں کی حکومت کے قیام کے حق میں رہا جسے سیاسی طور پر ''عوامی جمہوریت'' کی اصطلاح (TERMS) سے جانا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی تحریروں' تقریروں اور عملی زندگی میں ایک ادبی اور سماجی کارکن کی حیثیت سے ''طبقاتی جدوجہد'' (CLASS STRUGGLE) کا حامی ہوں جس کی تعبیر حقیقی آزادی' حقیقی انصاف اور حقیقی امن کی صورت میں دیکھنا چاہتا تھا۔اور یہی مارکسزم کے اصولوں کی بنیاد ہے۔ یہاں ایک بات اور ضروری ہے کہ طبقاتی جدوجہد میں لاطبقاتی (CLASSLESS) معاشرے تک مارکس کے سائنسی کلیئے ''جدلیاتی مادیت'' DIALECTICAL MATERIALISM پر اعتماد رکھتا ہوں۔ مارکسیت کے بارے میں میرے نظریات میری کتاب ''افروایشیائی ادیبوں کے مسائل اور ان کا پس منظر'' میں بہت واضح ہیں جو کہ میرے افکار کو مہمیز عطا کرتے ہیں۔

☆ ''ایک دنیا دم توڑ رہی ہے دوسری جنم لے رہی ہے سے اشارہ کس جانب ہے؟

☆☆ یہ جملے میں نے اپنے شعری مجموعے ''چاندنی اور سمندر'' کے پیش لفظ میں لکھے تھے۔سیاق و سباق دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔یہ تو ہر دور میں ہوتا ہے گذشتہ سماج اپنی اقدار ختم کررہا ہوتا ہے اور جدید سوسائٹی وجود میں آنا شروع کرتی ہے۔سو لکھتے وقت محسوس ہو رہا تھا سائنسی تہذیب اپنی ایجادات کے ساتھ قائم ہو رہی ہے اور معاشرتی تہذیب ختم ہو رہی ہے اور انسان کے قدم

مائیکروویوکمیونیکشن سے لے کر چاند کی سطح پر پہنچ چکے ہیں۔

☆ نقاش کاظمی کے حقیقی شاعرانہ مزاج نے بیانیہ شاعری کے عذاب سے بچالیا ہے۔آپ کی بابت کہے گئے یہ جملے بیانیہ شاعری کو تحقیر کے درجے پر نہیں پہنچادیتے؟

☆☆ میری بابت کہے گئے یہ جملے ''چاندنی اور سمندر'' کا مقدمہ تحریر کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے لکھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب بیانیہ شاعری کے حق میں نہیں لیکن اس سے تحقیر مقصد نہیں ہے بلکہ مجھے تو اپنے بارے میں یہ جملے جان کر کہ ''نقاش کاظمی کو اس کے حقیقی شاعرانہ مزاج نے۔۔۔اور پھر آگے ہوں بھی ہے کہ نقاش نے اپنا ایک لہجہ بنالیا ہے اور بقول میر لہجے کو مرمر کے پالنا پڑتا ہے۔

☆ آپ کی بابت کمٹمنٹ کی بات بڑی شدومد سے کہی جاتی ہے، استراحت کے ساتھ اپنی کمٹمنٹ اور آئیڈیالوجی کی بابت آگاہی دیجیئے؟

☆☆ دراصل میرے بارے COMITMENT کی بات اس لئے کہی جاتی ہے کہ میں ٹریڈ یونین تحریکوں، انجمن ترقی پسند مصنفین اور افروایشیائی ادیبوں کی انجمن سے وابستہ رہا ہوں اور اب تک ہوں۔آئیڈیالوجی کے روشن خیالی اور ترقی پسندانہ انداز سخن رکھتا ہوں اور انقلابی نظمیں یعنی ادب برائے معاشی مساوات اور ادب برائے سماجی انقلاب کے نظریے کو مشعل راہ رکھتا ہوں۔اور ان نظریات کی ترویج واشاعت میں پیش پیش ہوں تفصیل کے لیے پھر دعوت دیتا ہوں۔میری شاعری کی اور نثری کتاب کا مطالعہ کیا جائے۔

کرو نہ غم کہ ضرورت پڑی تو ہم دیں گے
لہو کا تیل چراغوں میں ڈالنے کے لیے

سروں کی فصل جو تیار ہے تو کیوں نہ کٹے
بہت ہے عہد جوانی تو کیوں ہو عمر دراز

الٹ دے بڑھ کے بساطِ نظام کار جہاں
تو انقلاب زمانہ کا انتظار نہ کر

وغیرہ وغیرہ

☆ نقاش کاظمی جس قبیلے کے آدمی ہیں اُس کی طنابیں کٹ چکی ہیں اُس کے شہہ سوار بکھر چکے ہیں،اس جملے کا مفہوم ہمارے قاری تک درست طور پر پہنچادیجئے؟

☆☆ دیکھئے طنابیں کٹ چکی ہوں یا شہہ سوار بکھر چکے ہوں۔نظریہ اور آئیڈیالوجی ایک دم زمیں بوس نہیں ہوتا۔کوئی حکومت، سلطنت یا ریاست ختم ہوئی ہے نہ کہ ضرویات۔جس المیہ کی جانب آپ اشارہ کررہے ہیں اس موقع پر میں نے ایک نظم ''اہل قلم کا نیا عہد نامہ'' کہی تھی

جب تک کہ جہان ظلمت میں
ایک ایک ستمگر باقی ہے
ہم ردّ جفا میں لکھیں گے
ہم ردّ بلا میں لکھیں گے

یا

بدن زخمی ہے خیمے جل چکے ہیں
نئی اک کربلا ہے اور میں ہوں

جب تک استحصالی، آمرانہ اور عالمانہ قوتیں باقی رہیں گی بقول شخصے مراہاتھ بھی سوالا کھ کا رہے گا۔

اس سلسلے میں یہ بھی عرض کردوں کہ ''رجعت پسندی قوتیں'' یہ سمجھتی ہیں کہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ تحریکیں محض ''روس'' سے ہی وابستہ ہیں۔ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ کرہ ارض پہ کم از کم سو سے زائد ممالک ہیں جہاں ان جن خیالات کے حامل تحریکی عمل جاری وساری ہے۔

☆ آپ کو فیض کے خاندان کا شاعر کہنے والوں نے آپ کی ذمہ داریوں میں اضافہ نہیں کردیا، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ جملہ احباب کو توقعات پر کسی قدر پورا اترے ہیں؟

☆☆ آپ کا سوال بجا ہے کہ مجھے فیض احمد فیض کے خاندان (SCHOOL OF THOUGHT) کا شاعر کہنے والوں نے میری ذمہ داریوں میں اضافہ کردیا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی ذمہ داریوں کی بجا آوری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔میں نے عمل اور تخلیقی دونوں سطح پر حتی المقدور کوششیں کی ہیں اور احباب دانش کی توقعات پر پورا اترنے کے بارے میں تو دوسرے ہی فیصلہ کرسکتے ہیں۔

☆ آپ کے ہاں مجازؔ، سردار جعفری، مصطفےٰ زیدی کا فنی احساس تلاشنے والے آپ کو ہسٹری کا چوتھا شاعر تو نہیں گردانتے؟

☆☆ دراصل انقلاب اور رومان کی شاعری کا آغاز ہی مجازؔ سے ہوتا ہے لیکن سردار جعفری کی گھن گرج اور مصطفےٰ زیدی کے جدید اسلوب نے نظم نگاری کی صنف میں مجھے بے حد متاثر کئے رکھا۔

☆ جو لوگ آپ کی شاعری کو انسان دوستی سے تعبیر کرتے ہیں کیا وہ کراچی میں انسانیت کی تذلیل سے بے خبر ہیں؟

☆☆ ایک ترقی پسند، روشن خیال اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں ہونے والی انسان دشمنی کے خلاف آواز اٹھانے والے شاعر کو محض کراچی جیسے شہر میں لاکر پٹخنی دینے کی ادا مجھے اچھی نہیں لگی۔کرہ ارض پر انسانیت کی تذلیل جہاں جہاں بھی ہوتی ہے نقاش کاظمی کا دل وہیں دھڑکتا ہے۔''بولو یہ جنازہ کس کا ہے'' نظم ''سوال''، اور متعدد نظمیں یا آپ کی توجہ کے لیے غول کے بے شمار اشعار مثلاً:

لے اڑی سارے رنگ و بوشہر کی نا سمجھ ہوا
کر گئی دل کو پھر لہو۔ شہر کی نا سمجھ ہوا

☆ ایک خیال یہ بھی ہے کہ آپ اپنے ہم عصروں کی طرح انتظار کی طویل قطار میں کھڑے ہیں، کونسا انتظار کس کا انتظار کیا کراچی یا پاکستان میں رہ کر امن، آشتی، خوش حالی، بھائی چارہ کے خواب دیکھے جاسکتے ہیں؟

☆☆ جناب عالی مستقبل پر نظر رکھنے والے ہمیشہ انتظار کی قطار میں ہی کھڑے رہتے ہیں۔ میں ہر دور کے خواب دیکھنے والوں کی طرح حالات سے مایوس نہیں ہوں۔ اور امن، آزادی، انصاف کا خواہاں ہوں۔ میں نے اپنی نثری تصنیف میں چند اصطلاحیں استعمال کی ہیں یعنی ''بین الاقوامی امن''، ''بین الاقوامی آزادی''، ''حقیقی انصاف'' اور ''بین الاقوامی حب الوطنی'' وغیرہ تفصیلات کے لیے مطالعہ فرمائیں ''افروایشیائی ادیبوں کے مسائل اوران کا پس منظر''

☆ آپ کی اس رائے سے اختلاف کی بہت گنجائش ہے کہ آپ اپنے عہد کے اُن تمام ذہنوں سے متاثر ہیں جنھوں نے ادبی، سماجی، سیاسی تبدیلیوں کی راہیں ہموار کی ہیں، ہمارے خیال میں تو پہلے سے استوار راہیں بھی بہت حد تک محدود کردی گئی ہیں؟

☆☆ زمان ومکان کے ارتقائی مراحل میں اختلاف کی گنجائش تو ہر مرحلہ پر موجود ہوتی ہے۔ خواہ کسی قسم کی سائنس SCIENCE کیوں نہ ہو آپ کا یہ سوال مبہم ہے۔ اپنے عہد کے ذہنوں سے مراد کمیٹی چوک اور لیاقت آباد سے تعلق رکھنے والوں سے مراد نہیں بلکہ عالمی سطح کے اذہان کی جانب اشارہ ہے۔

☆ فکر واظہار کے حوالے سے آپ فیض، سردار جعفری، ساحر، کیفی اور مجروح سے متاثر نظر آتے ہیں، سوال پھر وہی اُٹھتا ہے کہ جہاں آپ اور ہم رہتے ہیں وہاں کس کو فکر واظہار کی آزادی میسر ہے؟

☆☆ جہاں آپ اور ہم رہتے ہیں۔ وہاں ان دنوں آزادی اظہار پر کوئی پابندی نہیں ہے اور ہمارا تو میڈیا بھی خود مختار ہے خواہ صوبائی خودمختاری ملے یا نہ ملے۔

☆ آپ کی نفاست، نزاکت، تفکر، تعقل اور زبان وبیان کی روایتوں سے ادب کے محدود حلقے کے علاوہ معاشرے کو ابھی تک کس طرح کے فوائد پہنچے ہیں؟

☆☆ یہ سوال آپ نے بہت بر وقت اور بہت بہتر اٹھایا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ معاشرے سے مارشل لاء ڈکٹیٹرشپ اور ظلم و ستم کے خاتمے کے لیے دیگر اہل قلم کے ساتھ ہماری آواز بھی شامل ہے۔ اسی طرح شام، نمی بیا، جنوبی افریقہ، فلسطین، ایران اور درجنوں ممالک کی آزادی کیلئے قلم اٹھانے والوں میں یہ بندہ ناچیز بھی شامل رہا ہے۔ میرے مجموعہ کلام ''رخ سیلاب'' کے (4 ایڈیشن) کی نظمیں اور غزلیں منہ بولتا ثبوت ہیں۔

☆ کہنے والے کہتے ہیں کہ نقاش کاظمی کا مقصد محض اچھی شاعری نہیں اس سے سوا ہے، ہمارے قاری کو لفظ سوا کی ''روح'' اور اُس میں کامیابی کے تناسب سے ضرور آگاہ کیجئے؟

☆☆ آپ نے صحیح فرمایا۔ اچھی شاعری تو ادب کا حصہ ہے ہی لیکن اس سے سوا جو ادیب کی رائے ہے وہ انقلاب، آزادی اور حب الوطنی کی راہیں استوار کرتی ہے۔ میری بے شمار نظمیں مثالاً پیش کی جاسکتی ہیں۔ پچھلے سوالوں میں اس کا جواب دیا جاچکا ہے ملاحظہ ہوں۔ مطبوعہ نظمیں۔ شکست حوصلہ، شب۔ کالا سورج۔ پتھراؤ، شیشہ وسنگ۔ ہنوئی کی بادصبا۔ نئی دنیا کے معمار۔ انٹرنیشنل۔ بڑی جنگ کا رمز، صفیں درست کرو۔ ہم لوگ پہردار بھی۔ اپنی جنگ رہے گی۔ ترسی ہوئی رات کا ماتم لہو کا الاؤ۔ چراغ تلے۔ ایک مکالمہ غالب سے۔ شاخِ زیتون۔ نیمبیا کی تحریک آزادی کے نام۔ ایک فلسطینی بچے کی فریاد۔ چمکیلے موسموں کا آخری منظر۔ خون کا حوالہ۔ مارکوس کی سزا۔ نیا بنجارہ نامہ۔ وغیرہ وغیرہ۔ کامیابی کے تناسب کا تو دعویٰ نہیں لیکن ونتیام آزاد ہوا۔ فلسطین قائم ہوا، نیلسن منڈیلا یاسر عرفات ہو چی مہنہ فتح مند ہوئے۔ ایوب خاں، مارکوس، ضیاالحق شہنشاہ ایران رخصت ہوئے۔

☆ آپ کے بارے زبانی اور تحریری اظہار خیال میں نوجوان کا لفظ کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ آپ نہیں سمجھتے کہ آپ فنی بلوغت کے دور میں داخل ہو چکے ہیں؟

☆☆ دراصل میں نے نوجوانی میں ہی ایک طوفانی رفتار REVOLUTIONER FORCE کے ساتھ اپنا ایک مقام بنایا VOICE OF YOUTH کا خطاب حاصل کیا۔ اور دنیا بھر سے بے شمار عوامی اعزازات حاصل کیے۔ لہٰذا وہ تاثرات ابھی تک ذہنوں پر قائم ہیں اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے اپنا کام ابھی ختم نہیں کیا۔

☆ نقادین ادب کا آپ کی جانب استحقاق کے مطابق توجہ نہ دینا بھی تعجب طلب امر ہے؟

☆☆ نقادانِ ادب سے آپ کی کیا مراد ہے؟ میرے نزدیک تو اس عہد میں نقاد رہے بھی کہاں۔ لیکن میں نے بے شمار اساتذہ کے اقتباسات آپ کی خدمت میں پیش کیے ہیں۔ اگر ان کی وقعت نقادانِ ادب کی بنتی ہے تو یہی آپ کے سوال کا جواب بھی ہے۔

☆ اردو زبان، ادب اور شاعری کی بابت آپ کے ذہن میں مستقبل کا نقشہ کیسا بن رہا ہے نیز ذاتی حوالے سے ارادے اور اہداف کیا ہیں؟

☆☆ اردو زبان وادب کا نقشہ مستقبل میں عالمگیریت کا حامل ہے البتہ رسم الخط شاید قائم نہ رہے۔ پاک و ہند کے باہر اردو بولی اور سنی جارہی ہے لیکن پڑھی اور لکھی نہیں جارہی ہے۔ ہماری تو خواہش ہے کہ اردو زبان وادب اپنے اصل رنگ وروپ میں ترقی کی منازل طے کرے میں نے اردو ادب کے ساتھ اردو لسانیات میں بھی ماسٹر کیا ہے لہٰذا حوصلے بلند ہیں۔ حال ہی میں براعظم آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، فیجی، تسمانیہ وغیرہ میں ''اردو'' کا جائزہ لے کر آیا ہوں۔

''اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ''

ڈاکٹر فرمان فتح پوری
(کراچی)

نقاش کاظمی اپنے عہد کے نہایت معتبر شاعر ہیں۔ حلقۂ عام سے لے کر خاص تک اُن کی مقبولیت و محبوبیت یکساں ہے اور ان کے ہم عمروں اور ہم عصروں کے لیے واقعی قابلِ رشک ہے۔ اس مقبولیت و محبوبیت کے اسباب ان کا وسیع مطالعہ اور ان کی تعمیری سوچ ہے۔ ان کا لہجہ انقلابی و رومانی ہے اور ان کا اسلوبِ سخن ساحرانہ ہے، اُن کی شخصیت اور فن کا ایک نمایاں وصف یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کی اونچ نیچ کے حوالے سے اپنے آپ کو ماضی و حال سے یکساں جوڑے رکھتے ہیں، اپنے پڑھنے والوں کو جینے کا حوصلہ دیتے ہیں اور تابناک مستقبل کی نوید سناتے ہیں۔

نقاش کاظمی کے فکر و فن کے یہ وہ اوصاف ہیں جو اُن کے جملہ شعری مجموعوں سے نمایاں ہیں لیکن تازہ ترین مجموعہ جسے انھوں نے ''دامنِ گل'' سے موسوم کیا ہے، اُن کے جملہ اوصاف غزل سرائی کو نہایت جامعیت و اختصار کے ساتھ قاری کے سامنے لے آتا ہے۔

نقاش کاظمی نے ''دامنِ گل'' کا انتساب، میر، غالب اور فیض احمد فیض کے نام کیا ہے۔ یہ انتساب بے وجہ نہیں ہے۔ دامنِ گل کے مطالعے کے وقت، ورق ورق پر اس بات کے نشانات ملتے ہیں کہ شاعر نے میر، غالب اور فیض تینوں سے کسبِ فیض کیا ہے اور تینوں کے فکر و فن کا اثر قبول کیا ہے۔

میر کی شاعری کا نمایاں ترین وصف یہ ہے کہ وہ اپنی بات عوامی لہجے میں خواص تک پہنچاتے ہیں، گویا سہلِ ممتنع میں نغز گوئی، اُن پر ختم ہے، وہ بڑی سے بڑی اور گہری سے گہری بات کو آسان سے آسان لفظوں میں بیان کر جاتے ہیں۔

غالب کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ خیال آفرینی کے باوصف خود کو فکر و فلسفہ سے جوڑے رکھتی ہے۔

فیض کے یہاں میر و غالب کے رنگ یکجا ہو گئے ہیں اور ان کی یکجائی ایسے جدید اسلوب کو جنم دیتی ہے جو غزل اور نظم دونوں کے لیے یکساں کار گر و کار کشا رہتا ہے چناہ چہ فیض کی ساری نظمیں غزل نما اور ان کی ساری غزلیں نظم بردوش ہیں۔ یعنی اُن کی غزل کے اکثر اشعار، اپنی انفرادی حیثیت میں ایک مکمل نظم کا اور ان کی ہر نظم، غزل کے ایک دل گداز شعر کا لطف دیتی ہے۔

اب آیئے، میر، غالب اور فیض کے ان کمالات کو نقاش کاظمی کے دامنِ گل میں تلاش کریں اور یہ دیکھیں کہ نقاش کے پاس دامنِ گل کو مذکورہ بالا تین بڑے شاعروں کے نام سے انتساب کرنے کا جواز کیا ہے، دور نہ جایئے کتاب کے دوسرے ہی صفحے پر ایک نظر ڈالیے اور نقاش کاظمی کے اس سلیس ترین شعر کا لطف اٹھایئے۔

غیروں کی طرح آنا غیروں کی طرح جانا
یہ بھی کوئی آنا ہے یہ بھی کوئی جانا ہے

سہلِ ممتنع کا یہ وہ رنگ ہے جو میر تقی میر کے لیے مخصوص ہے اور جس کا اثر دامنِ گل کے ہر ورق پر صاف نظر آتا ہے۔

یہ تو نقاش کاظمی کے فکر و فن پر میر تقی میر کے اثرات کی ایک جھلک تھی، غالب کے فکر انگیز خیالات کی پرچھائیاں، نقاش کاظمی کے کلام پر اس سے بھی زیادہ ہیں۔ افسوس کے تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں صرف اتنا کہنا ہے کہ نقاش نے غالب کے اثرات کو تلمیحی انداز میں جس دل آویزی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ان کی فنکارانہ صلاحیت پر دلالت کرتا ہے مثلاً، نقاش کاظمی کے صرف دو شعر دیکھئے۔

ہم بھی بونے لگے غالب کی زمینوں میں غزل
کوئی سبزہ نہ رہا جب درو دیوار کے پاس

نقاش سمجھنا کہ یہی رختِ جنوں ہے
جب قطرۂ خونِ دیدۂ بیدار سے اُترے

انھیں پڑھ کر اور سن کر غالب کے یہ اشعار:

اُگ رہا ہے درو دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

تب شوق گراں مائیگی اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے

خود بخود ذہن کے اُفق پر اُبھر آتے ہیں اور غالب سے نقاش کاظمی کے اندازِ فیض رسانی کو نہایت خوش اسلوبی سے اجاگر کرتے ہیں۔

اب رہ گئی فیض احمد فیض کے اثرات کی بات تو مجھے کہنے کی اجازت دیجیے کہ قربِ زمانے کے سبب، نقاش پر فیض کے اثرات میر و غالب کے اثرات سے بھی زیادہ گہرے ہیں اور نقاش نے اشارات و تلمیحات کے پیرائے میں اپنی بات نہایت سلیقے سے کہہ دی ہے یہاں بھی صرف نقاش کے دو شعر دیکھئے:

تم نے ہر حلقہ زنجیر میں رکھ دی ہے زباں
یہ صدا سن کے بڑے حوصلے دل نے پائے

پسِ مرگ دامنِ کوہ میں کوئی جوش کو یہ خبر کرو
تپ شوق میں ترا فیض بھی یہ خبر اُڑی ہے کہ مرگیا

دوسرا شعر خصوصاً قابل توجہ ہے کہ یہ شعر اس ساری فضائے غم زدہ کو ہمارے سامنے لے آتا ہے جس میں جوش نے نہایت عالم کسمپرسی میں وفات پائی اور کراچی سے دور اسلام آباد کے ایک گوشے میں مدفون ہوئے جو لوگ جوش کی وفات کے المناک پس منظر کو تفصیل سے جاننا چاہتے ہوں وہ میری کتاب جوش و فراق میں دیکھ سکتے ہیں۔

یہ باتیں میں نے دامنِ گل کے انتساب کے حوالے سے کہی ہیں اور نقاش کاظمی پر میر و غالب و فیض کے اثرات کا جو ذکر کیا ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ نقاش کاظمی نے کسی کی پیروی یا تقلید کو سب کچھ جانا ہے۔ ہرگز ایسا نہیں ہے انھوں نے کچھ رنگیں دھاگے، اپنے بزرگوں کے فکر و فن سے ضرور لیے ہیں لیکن ان دھاگوں سے اپنے فکر و فن کا قالین خود آپ تیار کیا ہے۔ یہ قالین منفرد حیثیت کا ہے اور خالص نقاش کاظمی کا ہے۔

میر، غالب اور فیض کے ذکر سے تو صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ نقاش کاظمی ایک با مطالعہ، باخبر اور باشعور شاعر ہیں اپنے ماضی اور حال و مستقبل سب پر اُن کی نظر رہتی ہے وہ اپنے عہد کے مسائل حیات سے تو عملاً باخبر رہتے ہیں لیکن وہ شعوری طور پر جتنی دور تک اپنے مستقبل کو دیکھ سکتے ہیں اتنی ہی دور تک وہ اپنے ماضی پر بھی نظر رکھتے ہیں، نتیجتاً اُن کی شاعری، اپنے ماحول کے جملہ سیاسی، سماجی واقعات سے گتھی رہتی ہے اور ہم عمروں اور ہم عصروں سے لے کر اپنے عہد کے نوجوانوں اور بزرگوں تک سب پر یکساں اثر انداز ہوتی ہے اُن کے ہم عمر اور ہم عصر بجا طور پر اُن کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، نوجوان اُنھیں یوں پسند کرتے ہیں کہ انھیں آگے بڑھنے کے لیے نقاش کی شاعری سے روشنی ملتی ہے اور ان کے بزرگ و عمر رسیدہ حضرات ان کے کلام کی یوں داد دیتے ہیں کہ وہ انھیں اردو شاعری کے روشن مستقبل کی بشارت وضمانت دیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ نقاش کاظمی کی منتخب غزلیات کا زیر نظر مجموعہ ''دامن گل'' آج کی اردو شاعری اور شعری مطبوعات میں ایک گراں قدر اور خوشگوار اضافہ ہے۔ یہ مجموعہ صرف نقاش کے فکر و فن کو سمجھنے میں مدد نہیں دیتا بلکہ یہ اپنے عہد کی اردو شاعری کے جملہ رجحانات و میلانات کو آئینہ دکھاتا ہے اور آپ اس کی معرفت موجودہ اردو شاعری کے جملہ رویوں اور فنی جہتوں سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں، اپنے عہد کو کسی شاعر کی یہ دین معمولی نہیں غیر معمولی ہے، ہمیں اس دین پر شاعر کا شکر گزار ہونا چاہیے اور اسے جیتے رہنے کی دعائیں دینا چاہیے۔

☆

''گھر جانے کو جی چاہتا ہے''

خود اپنے دل کو جلاؤ تو کوئی بات بنے
پرائے گھر کو جلانا کوئی کمال نہیں

○

کوچۂ یار سے کچھ زخم وہ دل نے پائے
اب کے بھی موسم گل میں جو نہ سلنے پائے

○

ایک مدت ہوئی ہم تازہ بہاروں کے پھول
ایسے بچھڑے ہیں کہ اب تک نہیں ملنے پائے

○

اس لیے رشتوں کی کڑیاں ریزہ ریزہ ہو گئیں
اس نے اے نقاش مجھ کو ٹوٹ کر چاہا نہ تھا

○

چیخ کے ٹوٹے نہ دل سوکھی ٹہنیوں کی طرح
جو شاخِ گل کوئی لاؤ ہری بھری لاؤ

دن بھر کے بعد کس طرح چہرے ہوئے گلاب
میری طرح تو دھوپ میں کوئی جلا نہ تھا

○

پاؤں تھک جائیں تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے
اور پھر جاں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے

○

اب کے موسم بدلے گا تو لے کر آؤں گا
اس کے بدن کی ساری خوشبو اپنے ہاتھوں میں

○

اسی سوچ میں لوگ گم ہو گئے
یہ سیلاب اب کس کے گھر جائے گا

○

وہ جو مجرمِ ہوس تھے وہ ہوا ہوئے ہیں لوگو
مرا جرم بے گناہیٔ مجھے سنگسار کر دو

حسنِ انتخاب: **نازش فردوس** (راولپنڈی)

''ٹوٹ کر بکھر نہ سکے''

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی (●)

وہ لوگ جو مستقبل پر ایمان رکھتے ہیں۔نئی نسل سے خوف زدہ نہیں ہوتے۔نئی نسل تو اس مستقبل کی تعمیر کا وعدہ ہوتی ہے۔جس میں ان کے خوابوں اور آرزؤں کی نقش گری کا امکان ہوتا ہے۔میں تو سمجھتا ہوں کہ آرزؤ خواب حوصلۂ تعمیر،مستقبل کی نقش گری۔یہ سب سعادتیں ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی ہیں۔یہ زندگی کا سفر ہے۔اور اپنے اسی ایقان کے تحت میں نے اپنے طالب علموں سے ہمیشہ یہی کہا ۔

جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر!

اور نئی نسل نے کبھی کبھی اس چیلنج کو قبول کیا ہے؛ مگر گذشتہ بیس پچیس سال میں ہمارا''جواب'' بننے والوں کی تعداد کچھ ایسی نہیں جو ہماری تشنہ لبی کا جواب بن سکے۔نقاش ہمارے چیلنج کا ایک جواب ہیں!

نقاش کاظمی''چاندنی اور سمندر'' کے ذریعہ تجدید سفر کر رہے ہیں۔ نقاش نے جامعہ کراچی میں 1968ء میں داخلہ لیا۔اور 1970ء میں میرے جاپان جانے تک وہ شعبہ اردو کے طالب علم تھے۔جامعہ کے دوسرے شعبوں کے استاد شاید طلبہ کے Response کے بغیر بھی سلیقہ سے پڑھا لیتے ہوں مگر ادب کے استاد کے لیے یہ ممکن نہیں۔ادب کا استاد جب اپنی کیفیت سے ابھرتا ہے تو چہروں پر میر صاحب؛ غالب؛ اقبال اور خود اپنے خوابوں کا تاثر اور سایہ تلاش کرتا ہے۔کوئی سوچنے والا چہرہ؛ کوئی خواب دیکھنے والی آنکھ؛ زندگی کے حسن پر کوئی مسکرانے والا لب۔۔۔۔یہی اس کا انعام ہے ان دنوں جماعت میں پڑھاتے پڑھاتے میں نے نقاش کو دریافت کیا تھا۔اور پھر۔۔۔۔نقاش کی شاعری سے تعارف ہوا۔

نقاش کا زیر نظر مجموعہ''چاندنی اور سمندر'' جامعہ کراچی کے جشن سیمیں کے موقع پر جامعہ کے حضور ان کا نذرانہ ہے۔شاید ہی کسی جامعہ کو اس کے بیٹے نے ایسا نذرانہ پیش کیا ہو۔اردو کی حد تک میرے خیال میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا مجموعہ ہے۔یوں جامعہ کراچی کا ذہنی رشتہ ایک نئے عنوان سے مسلم یونیورسٹی سے استوار تر ہوا ہے۔(جامعہ کراچی کو میں پاکستان میں مسلم یونیورسٹی کا عکس نو سمجھتا ہوں؛ اس وقت تفصیل کی گنجائش نہیں۔)

اس مجموعہ کی تمام تر شاعری 1968ء سے 71-1970ء کے دور سے تعلق رکھتی ہے۔کئی نظمیں جامعہ کراچی اور کراچی میں طلبہ کی جدوجہد سے متعلق ہیں۔مثلاً''نذر جامعہ''؛''استقبال''؛''گام گام مقتل''؛''شکست حوصلۂ شب''۔

اس تیز تر جہان نو میں دس سال کی مدت میں سائنس کے نظریہ ہی نہیں بلکہ شاعری کے''وقتی لہجے'' بھی پرانے ہو جاتے ہیں۔میں نے نقاش کی یہ نظمیں اور غزلیں پڑھیں اور مجھے اس بات پر فخر کا احساس ہوا کہ اس کی شاعری میں بہار کی ہوا کی تازہ سامانی پوری طرح موجود ہے۔نقاش کے ہاں مجاز؛ سردار جعفری اور مصطفیٰ زیدی کا فنی احساس؛ اس کی اپنی انفرادیت اور نئی نسل کی نئی حسیت کے ساتھ یوں ہم آہنگ ہو گیا ہے کہ خود اس کا اپنا ایک لہجہ ابھر آیا ہے۔اسے ابھی اس لہجے کی پرورش کرنا ہے۔بقول فراق آواز کو مر مر کے پالنا پڑتا ہے۔

ایک بات اور کہتا چلوں۔پچھلے دنوں سردار جعفری آئے۔ان کے تازہ کلام کا ایک بڑا حصہ سن کر یہ محسوس ہوا کہ وقت کا فاصلہ کتنی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا ہے۔نقاش کو وقت کی اس رفتار کا احساس ہے؛ وقت پر اپنی کھری ذات اور آواز کے ذریعے ہی فتح پائی جا سکتی ہے۔خدا کرے یہ ہتھیار ہمیشہ نقاش کے ہاتھ میں اور اس کے ساتھ رہیں۔

''چاندنی اور سمندر'' اس مجموعے کے نام ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ واضح جانب داری اور کومٹ منٹ کا شاعر ہونے کے باوجود نقاش ادبی اصطلاحوں؛ رویہ اور اشاروں کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتا ہے۔چاندنی علم کا اشارہ ہے اور سمندر زندگی کا۔یہ چاندنی اپنی ذات کے جہاز میں سوار مسافروں کے لیے زندگی کے سمندر میں سمت نما بھی ہے۔ایک واضح نظریہ کے اس شاعر کو اس کے حقیقی شاعرانہ مزاج نے بیانیہ شاعری کے عذاب سے بچا لیا ہے۔غزل سے اس کے حقیقی لگاؤ نے اس کی نظموں میں ارتکاز کا حسن اور قوت پیدا کر دی ہے۔

''جامعہ۔۔۔۔میں تجھے نسلوں کا مقدر لکھوں''(نذر جامعہ)
''چلے گا حلقہ یاراں میں پھر سے دور نصاب''(استقبال)

اس ایک مصرع میں کسی اعلیٰ تعلیمی ادارے کی تمام تعلیمی زندگی اور سرگرمیاں سمٹ آئی ہیں۔یہاں علم کتابوں کا بوجھ نہیں ہے۔بلکہ پیار کا کاروبار ہے۔یہ دور سراب ہے۔اور یہ علم تنہائی کی مجہوری؛ اور زندگی سے دوری نہیں بلکہ ساتھیوں کی ہم عنانی و ہم رکابی میں معرفت حقائق کا نام ہے۔

نقاش نے اس تمہید کے لیے دو صفحات کی قید لگائی ہے۔

1970ء میں جاپان جاتے ہوئے نقاش نے ایک غزل سنائی تھی۔اس غزل کا یہ شعر اتنے برسوں تک میری زندگی میں نقاش کی قائم مقامی کرتا رہا ہے۔

غم فراق میں آنکھیں تو ریزہ ریزہ ہوئیں
جو آنسو شیشہ بنے؛ ٹوٹ کر بکھر نہ سکے

آج آٹھ سال بعد میں نے دوبارہ یہ غزل پڑھی اور میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جدید اردو غزل کے کسی انتخاب میں بھی یہ غزل آبرومندانہ مقام کی مستحق ہے۔

خدا کرے نقاش کا یہ سفر جاری رہے۔

بین الاقوامی فکر ونظر

حمایت علی شاعر

(کینیڈا)

نقاش کاظمی نے اپنے پہلے مجموعہ کلام ''چاندنی اور سمندر'' کے پیش لفظ میں ایک حقیقت بیان کی تھی ''ایک دنیا دم توڑ رہی ہے دوسری جنم لے رہی ہے اور ہم دونوں کے درمیان حیران اور پریشان کھڑے ہیں'' اور پھر ایک آخری جملہ اس کا یہ تھا ایسے میں کوئی کیا لکھے کیا پڑھے۔اس کشمکش سے گمان ہوا تھا کہ اس کی شاعری بھی کسی تذبذب کا شکار ہے۔یا پھر خارجی حقائق سے بے نیاز ہے۔

ہمارے عہد کے جدیدیوں کی طرح اپنی ذات کی بھول بھلیوں میں کھوئے ہوئے انسان کے اضطراب کا آئینہ ہوگی۔اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے کلام میں اضطراب تو ہے مگر یقین کہیں متزلزل نہیں۔اس کی وجہ غالباً وہ نصب العین ہے جو ایک مخصوص نظریہ حیات نے اسے عطا کیا ہے جب کوئی شاعر کسی نظریہ حیات کا پابند ہوتا ہے تو اس کی شاعری میں خطابت کا آ جانا فطری ہوتا ہے۔کہ یہ شاعری اپنے آپ سے باتیں کرنے کی بجائے دوسرے سے مخاطب ہوتی ہے۔

اس صورت میں شاعر پر سب سے بڑی ذمہ داری ابلاغ کی عائد ہوتی ہے' وہ ایسا پیرایہ اظہار اختیار کر ہی نہیں سکتا جو دوسرے کی سمجھ میں نہ آ سکے۔یا اس کی تفہیم اور تشریح کے لیے قاری کسی تیسرے آدمی کی ضرورت محسوس کرے۔

دوسرے الفاظ میں یہی شاعری راست گفتاری کی طرف راغب کرتی ہے۔راست گفتاری درباری اور جاگیردارانہ آداب مجلس کے نقطہ نظر سے شاید مناسب نہ ہو۔لیکن شعری خصوصیات سے آراستہ ہو تو کوئی عیب نہیں۔

نظیر اکبرآبادی سے حبیب جالب تک یہ بھی ایک انداز سخن ہے جو شاعری میں رائج رہا ہے۔یہ الگ بات کہ کوئی مصطفیٰ خان شیفتہ یا انتظار حسین' ان حضرات کو شاعر ماننے سے انکار کردیں اور پردہ بے پردہ استعاروں اور کنایوں کو اعلیٰ شاعری کی خصوصیات تعبیر کرتے رہیں۔

استعاروں کے لطف سے کون انکار کرسکتا ہے مگر سخن کی یہ ادا شاعر کی نفسیات کا بھی سراغ دیتی ہے اور حقیقت سے مکرنے کی ہمیشہ ایک راہ کھلی رکھتی ہے۔شاعر بڑی آسانی سے کہہ سکتا ہے کہ روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ غالب نے کہا تھا عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا۔ظاہر ہے جب مرد ہی نہ ہو تو نبرد کا کیا انکار۔ اردو شاعری کی تاریخ میں کہیں سے آیا ہو۔علامہ اقبال کے الفاظ میں

''تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا'' رخ سیلاب میں نقاش کاظمی نے کسی نقاد کا ایک جملہ شاید کسی مثبت رویے کے طور ''کوٹ'' کیا ہے۔''واضح جانبداری اور کمٹمنٹ کا شاعر ہونے کے باوجود ادبی اصطلاحوں اور استعاروں کو خوب سمجھتا ہے اس شاعر کو اس کے حقیقی شاعرانہ مزاج نے بیانیہ شاعری کے عذاب سے بچالیا'' بیانیہ شاعری کو عذاب سے تعبیر کرنا غور طلب ہے' کسی بھی زبان کی بڑی شاعری کو اٹھا کر دیکھئے وہ نہ صرف (Commitment) کی شاعری ہے بلکہ بیانیہ بھی ہے' دراصل بیانیہ کی ایک سطح وہ ہوتی ہے جسے ہم سپاٹ یا صحافتی کہتے ہیں۔

لیکن جس طرح صحافت' صداقت با کنار ہو کر اپنے عہد کا آئینہ بن جاتی ہے اسی طرح شاعری بھی سچ بول کر شاعر کو امر بنا دیتی ہے' ٹھیک ہے کہ بیانیہ شاعری میں حسن کاری کے امکانات کم کم ہوتے ہیں۔مگر جب وہ بے ساختگی روانی اور سادگی کے ساتھ سچائی کا اظہار کرتی ہے تو اس پر بڑی شاعری کے در کھل جاتے ہیں۔

شاعری بیانیہ ہو یا استعاراتی خطابیہ ہو یا خود کلامی یہ ایک تخلیقی رویہ ہے جو اپنی ادائے خاص سے شاعر کو بھی مسرت عطا کرتا ہے اور قاری کو بھی۔

نقاش کاظمی بلاشبہ کمٹمنٹ کے شاعر ہیں ان کا بیشتر کلام اپنے ہی محور کے گرد گھومتا ہے مسائل مقامی ہوں یا بین الاقوامی وہ اپنے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے تاثرات پیش کرتے ہیں۔

اس نظریہ سے قاری یا ناقد کو اختلاف ہو سکتا ہے۔شاعر کو اس اختلاف سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے اور میرا خیال ہے کہ نقاش ایک جرأت مند شاعر ہیں۔

ہم نے آنکھ کے پیچھے جا کر دیکھا ہے

''رخ سیلاب'' میں ان کی وہ نظمیں جو ساری دنیا کی طرف دیکھتی نظر آتی ہیں خاصی تعداد میں ہیں۔

(۱) ہنوئی کی باد صبا (۲) نئی دنیا کے معمار (یوم مئی کے حوالے سے) (۳) انٹرنیشنل (۴) ترسی ہوئی رات کا ماتم (ویتنام کے عوام کے فتح کے موقع پر) بڑا چانگشا بھی چپ ہے (ماؤزے تنگ کے انتقال پر) (۶) ایک مکالمہ غالب سے (ایران میں شہنشاہیت کے خاتمہ کے موقع پر ایک تاثر) (۷) شاخ زیتون (یاسر عرفات اقوام متحدہ میں) (۸) ایک فلسطینی بچے کی فریاد (۹) خون کا حوالہ (افریقہ کے شاعر بنجمن مولائس کی یاد میں) (۱۰) نمیبیا کی تحریک آزادی کے نام۔

یہ تمام نظمیں ان کا رشتہ بین الاقوامی فکر سے جوڑ دیتی ہیں۔اور وہ اپنے ملک کے ان شعرا کے درمیان نظر آتے ہیں۔جو زمانے بھر کے دکھوں کو گلے لگا چکے ہیں۔فیض صاحب کے ساتھ جن چند شعراء نے ان موضوعات پر لکھا ان میں ظہیر کاشمیری' ابن انشاء' حبیب جالب' احمد فراز' ثاقب بزمی' حسن حمیدی اور نقاش کاظمی کے علاوہ شاید دو چار اور ہوں' یہ شاعری کس معیار کی ہے۔شاعری

کے ابدی تقاضوں کی روشنی میں انہیں کوئی مقام دیا جاسکے گا یا نہیں۔ضروری نہیں کہ اس کا فیصلہ آج کیا جائے یا آج ہو جائے۔

ہم اس لیے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ یہ شاعری ہمارے اندر عالمی انسانی برادری کے دکھ درد کے لیے جگہ بناتی ہے۔اور ہمیں اس اجتماعی غصے میں شامل کرتی ہے جو اس صدی میں نہ سہی اگلی صدی میں کسی نہ کسی عالمی انقلاب کا پیش خیمہ ہو گا۔

یہ اعزاز ہمارے لیے کیا کم ہے کہ پچھلی صدی تک جو شاعری ہماری زبان میں ہوتی رہی جو اس صدی میں اپنی مخصوص فطری حدوں سے باہر نکل آئی ہے غالب کا اضطراب اقبال کا شعور بن گیا۔اقبال کا شعور جوش کے لہجے کی گھن گرج اور فیض کے لہجے کی نغمگی کے ساتھ دورِ حاضر کے دل کی دھڑکن بنا ہوا ہے۔

شاعری کی پرانی اصطلاحیں نئے معنی دینے لگی ہیں۔اب کوچہ دلبر کا راہ زن بنے تو بات بنے یہ شعر فیض صاحب کا ہے۔

اب کوچہ دلبر کا رہرو' رہزن بھی بنے تو بات بنے
پہرے سے عدو ٹلتے ہی نہیں اور رات برابر جاتی ہے

فیض کا فیضان پورے عہد پر محیط ہے۔فیض نے جو طرز فغاں قفس میں ایجاد کی تھی گلشن میں وہی طرز بیان ٹھہر گئی۔

ہندوستان میں ساحر اور سردار جعفری اور مخدوم جیسے شعراء نے اسے اپنایا۔اور پاکستان میں احمد فراز' رضی اختر شوق اور نقاش کاظمی تک اس سے فیضیاب نظر آتے ہیں اور یہ کوئی بری بات نہیں۔یہ فکری اور شعری حسب و نسب کے سلسلے ہیں جو اپنے تسلسل کو اعتبار عطا کرتے ہیں۔

نقاش کاظمی کی شاعری میں یہ فیضان قومی اور ملکی مسائل میں نہیں ذاتی مسائل کے اظہار میں بھی نظر آتا ہے۔ گلچہرہ کی واپسی' ماں کی یاد میں ہارٹ اٹیک' کا ڈیوگرام' درد کا ساز بنو اور پیار کی چتا وغیرہ ذاتی غموں سے آباد نظمیں ہیں۔

مگر یہ شدت' کہیں چیخ نہیں بنتی۔شاعر کی قوت ضبط بڑے سے بڑا دکھ برداشت کر جاتی ہے۔فیض صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے انہیں غصہ نہیں آتا اور اگر آ بھی جاتا ہے تو ان کی شاعری کبھی للکار نہیں بنتی۔ان کے باغیانہ لہجے کی انتہائی مثال ''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے'' یا پھر اے خاک نشینوں اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے۔جب تخت گرائے جائیں گے۔جب تاج اچھالے جائیں گے۔یہ کلام اپنی تمام تر بغاوت کے باوجود اقبال کے لہجے کا طمطراق اور جوش کی گھن گرج نہیں رکھتا۔

نقاش بھی کم و بیش اسی مزاج کے شاعر ہیں انہوں نے نظیر اکبر آبادی کی نظم بنجارہ نامہ سے فیض کا لہجہ ملاتے ہوئے نظم کہی ہے ''نیا بنجارہ نامہ''

اے صدر نشینو۔۔۔۔ تاجورو
اے آمرو جابرو بادشہو
اس وقت جو چاہو سو وہ کرو
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا
جب تاج اچھالے جائیں گے
جب تخت گرائے جائیں گے

ساری نظم بیانیہ ہے۔اور ایک ترانے کا انداز رکھتی ہے۔لیکن بیانیہ عذاب محسوس نہیں ہوتا اقبال نے بھی اس انداز کے نغمے لکھے ہیں۔

اپنی خودی پہچان اے غافل افغان ظاہر ہے کہ یہ بڑی شاعری بھی نہیں ہے۔لیکن اس کے بیج سے جب درخت اگ آتا ہے اور وہ ''خضر راہ''، ''مسجد قرطبہ'' اور ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' جیسی نظموں میں ڈھل جاتا ہے تو عظمت کے مینار طلوع ہوتے نظر آتے ہیں۔

شاعری کو ہر جذبے کا آئینہ دار ہونا چاہیے فکر میں جتنی وسعت ہو گی۔لفظ میں جتنی طاقت ہو گی۔اظہار میں جتنی شدت ہو گی۔تخلیق اتنی ہی بڑی ہوتی جائے گی۔

شاعری کے معیارات مقرر کرنے والے ناقدین کو ایسے بیانات سے گریز کرنا چاہیے۔شاعری زندگی کی طرح متنوع ہوتی ہے۔اپنے موضوعات میں بھی اپنے اسالیب میں بھی۔اس قسم کے بیانات شاعر کے اعتماد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔نقاش کاظمی کی شاعری بیانیہ بھی ہے اور استعاراتی بھی۔وہ اپنے آپ سے بھی بات کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی مخاطب ہوتے ہیں۔

چاندنی اور سمندر کے بعد رخ سیلاب خوب سے خوب تر کی طرف سفر کی ایک اچھی مثال ہے اور میں توقع کرتا ہوں کہ آئندہ اس سے اچھی مثالیں ہمارے سامنے آتی رہیں گی۔

☆

''فیض اور نقاش''

۱۹۷۰ء میں کراچی کے پیلس ہوٹل (اب اس جگہ شیرٹن تعمیر ہو گیا ہے) میں نقاش کاظمی کے ساتھ شام منائی گئی جس کی صدارت فیض احمد فیض نے فرمائی تھی۔۱۹۷۶ء میں ڈو میڈیکل کالج میں ''جنیریشن گیپ'' کے حوالے سے ایک ادبی سیمینار اور مشاعرے کا اہتمام ہوا۔جس کی صدارت نوجوان نقاش کاظمی نے کی تھی اور مہمان خصوصی فیض صاحب تھے۔

○

منفرد لہجے کا اظہار

ڈاکٹر بشیر بدر

(بھوپال، بھارت)

چاندنی اور سمندر سے میرا دلی تعلق ہے۔سمندر سے دوررہ کر بھی اس کی ایک موج ہوں اور چاندنی تمام سمندروں سے بڑا سمندر ہے۔میرے احساس اور میری سوچ کے ان دونوں سے عجیب عجیب رشتے ہیں میں کراچی پہلی بار آیا ہوں۔ذہنی طور پر یہاں کے شاعروں اور ادیبوں سے میری واقفیت بہت پرانی ہے۔میں اپنے ادبی سفر کے آغاز ہی سے یہاں کے ادبی رسائل میں لکھتا رہا ہوں۔ذرا دیر سے ہی سہی، مجھے اندازہ ہوجاتا ہے کہ ادبی وشعری افق پر کس کا ستارہ عروج پر ہے اور کون سے چاند سورج طلوع ہورہے ہیں۔

نقاش کاظمی کی نظموں کے تذکرے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ادبی حلقوں میں 71-1970ء کے آس پاس شروع ہوگئے تھے۔میں ایم۔اے کر کے ریسرچ کررہا تھا اور شعبہ اردو میں بحیثیت استاد کام کرنے کے باوجود بالکل نئے لکھنے والوں، شاعری کے عاشقوں کا بشیر بھائی تھا سوآج بھی ہوں۔علی گڑھ کی تازہ دم نئے شاعروں اور شعر وادب کی نئی آوازوں نے مجھے شعبہ اردو کے استاد لکچرر، ڈاکٹر وغیرہ کے معزز روپ میں کبھی بھی اپنے سے دور نہیں کیا۔یہ میری خوش قسمتی تھی اور آج بھی ہے جب میں علی گڑھ یونیورسٹی سے دور میرٹھ یونیورسٹی چلا گیا ہوں۔اس لیے میری نقاش کاظمی سے غائبانہ طور پر شاعری کے ان عاشقوں کے وسیلے سے جلد ہی غائبانہ ملاقات ہوگئی تھی جو اپنی عمر اور یونیورسٹی کے ماحول کے لحاظ سے شاعری میں ان احساسات اور تجربات کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے ہیں جس کا تعلق یونیورسٹی کے مسائل اور ماحول سے ہو۔

نقاش کاظمی یونیورسٹی کے طلباء کے شاعر کی حیثیت سے متعارف ہوئے اور یہ ان کی سلامت روی، فنی بصیرت اور خلوص کا ثبوت ہے کہ ان مخصوص موضوعات میں کسی طرح کی جذباتیت اور ضرورت سے زیادہ مقامیت ان کی اس دور کی کاوشوں میں نہیں ہے بلکہ اپنے طالب علمانہ مسائل سے تحریک حاصل کرتے ہوئے انہوں نے اپنے تجربوں کو زندگی اور شاعری کے پس منظر میں قبول کیا اور اس کا شعری وفنی اظہار کیا ہے۔اس طرح شاید یہ اردو کا پہلا مجموعہ ہے جس میں ایک یونیورسٹی کے طالب علم نے عشقیہ اور اس سے کہیں زیادہ غیر عشقیہ تجربات کو شعری تجربات کا کامیاب اظہار دینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

یونیورسٹی میں اپنے طالب علمی کے زمانے میں بھی ان کے فکر وفن نے زندگی اور دنیا کو سمجھنے اور برتنے کی کوشش کی ہے اور اس کے بعد سے آج تک اور خاص کر حالیہ چند برسوں میں ان کی شاعری میں مزید خوبیاں روز بروز پیدا ہوتی جارہی ہیں۔وہ اپنی فکر اور اپنے اسلوب کے انداز سے اس لب و لہجے کے شاعر ہیں جو زندگی کے تجربوں کو شعری تجربے بنا کر اس کے فنی اظہار پر یقین رکھتے ہیں اس لیے ان کی غزلوں میں تمام تر تفکر، تعقل کے باوجود احساس کی صداقت، نزاکت اور نفاست کی تطہیر ہے۔زبان و بیان کی زندہ روایتوں کے احترام کے ساتھ وہ جدید غزل اور جدید نظم کے عصری مزاج اور آہنگ میں اپنا لہجہ تلاش کرنے میں کامیابی حاصل کرتے جارہے ہیں۔

نقاش کاظمی کی غزلوں میں زندگی دھوپ کے سفر میں سورج سر پر اٹھائے خوابوں اور یادوں کے چاندنگر کی طرف رواں دواں ہے۔''چاندنی اور سمندر'' کا یہ شاعر بلاشبہ دھوپ اور انسانوں کے جنگل میں خود کو تلاش کررہا ہے، اس لیے ان کی شاعری میں رات کے خوبصورت خواب بھی ہیں اور دن کی گرمیاں اور سرگرمیاں بھی ہیں۔

نقاش کاظمی نے غزلوں اور نظموں کے ساتھ نعت بھی لکھی ہیں۔وہ اصناف کے بنیادی مزاج سے واقف ہیں اور کئی آئینوں میں اپنے فکر وفن کا منفرد چہرہ سنوار رہے ہیں۔

نقاش کاظمی کی غزلوں کے خوبصورت اشعار ان کے منفرد لہجے کا اظہار ہیں نظموں اور گیتوں میں وہ اپنے آپ کو بڑی کامیابی سے تلاش کررہے ہیں۔

نقاش کاظمی اردو کے نئے شاعروں میں ایسے اہم شاعر ہیں جن کی شہرت ہندوستان کے ادبی حلقوں میں پہنچ چکی ہے، اور وہ چند ان نوجوان شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جن کے اشعار محبت اور احترام سے سنے اور پڑھے جاتے ہیں۔

''سفید رنگ کی تلوار''

محمود شام
(کراچی)

نقاش کاظمی میرے صرف ہم عصر ہی نہیں۔گلشن اقبال میں ''ہم بلاک'' بھی ہیں،ہم ایک ہی بلاک میں رہتے ہوئے آسماں کے ستم برداشت کررہے ہیں فائرنگ کی آوازیں سنتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ اب ستم آسمان سے برسنے کی بجائے زمین سے ہی اگ رہے ہیں۔زمیں کے حوالے سے ٹوٹنے والے قہر آسمان سے نازل ہونے والے عذابوں سے زیادہ جان لیوا ثابت ہورہے ہیں۔

''رنگ سفر'' زمیں سے زمیں گھر سے گھر بدلنے کے نتیجے میں پیش آنے والے خوش لباس مصائب اور ابتلاؤں کی کہانی ہے۔

اس سفر میں کچھ کوس میں بھی نقاش کے ساتھ تھا۔ان کا سفر زیادہ طویل تھا۔اور اس دوران ان کے محسوسات نے' جذبات نے' اس سے بھی طویل تر جو سفر کیا۔اس میں ظاہر ہے کہ میں شریک نہیں تھا۔اور اس خطرناک اور گھمبیر سفر میں کوئی بھی کسی کا شریک سفر نہیں ہوسکتا۔ہر حساس ذہن رکھنے والے اور صاحب درد کو یہ سفر اکیلے ہی کرنا پڑتا ہے۔اس اکیلے سفر میں دل و دماغ کو جن طوفانوں اور بحرانوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ انتہائی اذیت ناک ہوتے ہیں۔لیکن وہی ادبیات عالیہ کو جنم بھی دیتے ہیں۔

نقاش کاظمی اپنی سوچ کے حوالے سے جس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اس کے خیمے کی طنابیں کٹ چکی ہیں۔اس کے شہہ سوار بکھر چکے ہیں۔لیکن وہ مسائل وہ تضادات' وہ کشمکش جن کے خاتمے کے لیے اس سوچ نے ایک صورت اختیار کی تھی وہ دنیا کے ہر گوشے میں اب بھی اسی طرح موجود ہیں۔طبقات میں بلندی اور پستی' امارت اور غربت اسی طرح فاصلے رکھتے ہیں۔کچھ آنکھیں آج بھی بہت روشن اور مسکراتی دکھائی دیتی ہیں۔کچھ آنکھیں آج بہت سپاٹ اور حیرت سے پھٹی نظر آتی ہیں۔کچھ ملبوسات آج بھی بہت چمکتے دمکتے اور چہروں کی شان بڑھاتے ہیں۔کچھ چہرے آج بھی نیم برہنگی کو زیب تن کئے سوالیہ نشان بنے زمین پر خودرو پودوں کی طرح نمو پاتے اور دم توڑتے رہتے ہیں۔

خیمہ لاکھ اکھڑ چکا ہو۔شہہ سوار بکھر چکے ہوں۔یہ سوچ اب بھی موجود ہے۔یہ سوچ کسی اور نام سے پہلے بھی موجود تھی۔ہر صاحب فکر اس درد میں مبتلا رہتا ہے کہ بعض چہروں پر درد اور پریشانی کیوں ہے۔انسان قدرت کا عظیم ترین شہ کار ہے۔اشرف ترین مخلوق ہے وہ اپنے ہی انسانوں کے ہاتھوں ذلت اور پستی کا شکار کیوں ہوتا ہے۔

یہ سوچ ''رنگ سفر'' کے خالق کو اس دیار میں بھی مغلوب کئے رکھتی ہے۔جہاں سے اس سوچ کے خلاف ریاستی سطح پر مزاحمت کی منصوبہ بندی کی جاتی رہی۔اور نقاش کاظمی کے قبیلے کے خیمے اکھاڑنے میں کامیابی اسی منصوبہ بندی کا حصہ شمار کی جاتی ہے۔اس نیک عمل کو نقاش کاظمی کے آپ کے اور میرے بعض ہم وطن بھی اپنا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔لیکن جس سرزمین پر ہم نے یہ کارنامہ انجام دیا۔وہاں آج انسان انتہائی تلخ اوقات سے دوچار ہے۔بی بی سی' پی ٹی وی' سی این این' ژی ٹی وی پر اپنے اس ہمسائے کی حالت زار دیکھی نہیں جاتی۔

واشنگٹن ڈی سی کے ''سفید محل'' کے سامنے پہنچ کر نقاش کاظمی جیسی سوچ رکھنے والوں کا جی تو مظاہرہ کرنے کو چاہتا رہا ہے لیکن نقاش کاظمی ایک تخلیق کار ہیں۔انہوں نے ایک خوبصورت اور گہرا تاثر چھوڑنے والی نظم لکھ کر ایک دائمی مظاہرے کا سماں پیدا کردیا ہے۔

سفید رنگ کی تلوار کو بلند کئے
کہ جیسے نوک سناں آسماں کے سینے میں
بدست ظلم لہو رنگ ہو کے اترے گی
ادھر دیار نگاراں میں اک سفید محل
ہے جس کے دست ہوس میں نظام نو کی کلید
کہ جس کے ناخن انگشت پر ہے سارا جہاں
وہی سفید محل آج مسکراتے ہوئے
ہماری آمد پُر لطف پر ہے طعنہ زناں
کہ دور تھے تو بڑی ہجو میری لکھتے تھے
قریب آ جو گئے ہو تو کس خیال میں ہو

یہ سوچ کسی طرح صاحب فکر کا ساتھ چھوڑ نہیں سکتی۔اس سوچ کے لیے کسی ویزے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی امریکی کسٹم کے زیرک اور تیز افسر اس سوچ کو تیسری دنیا کے مسافروں کے رخت سفر میں تلاش کر کے ضبط کر سکتے ہیں۔

''رنگ سفر'' میں یہ سوچ کبھی اک موج تہ نشیں کی طرح گرم سفر رہتی ہے۔کبھی سطح آب پر آجاتی ہے۔کبھی شعوری طور اور کبھی لاشعوری طور پر مشاہدات کا ملبوس بن جاتی ہے۔

''مجسمہ آزادی'' دیکھ کر ان کا رد عمل دیکھئے۔

مگر وہ آپ ہی اک دھند میں ہے لپٹی ہوئی
کسی کو کیسے سنائے نوید آزادی
جو مڑ کے دیکھ لی اس نے صدائے جادوگراں
تو ہو گئی ہے فقط پتھروں کی شہزادی

''اقوام متحدہ کی عمارت میں چند لمحے'' صاحب ''رنگ سفر'' نے ہمارے ساتھ ہی گزارے تھے۔ہم جب اس عمارت کے برآمدوں' گیلریوں سے گزر رہے تھے اس عمارت کی بلندیوں کو دیکھ رہے تھے۔بوسنیا کے مستقل مندوب جو اب وہاں کے وزیر خارجہ ہیں۔ان سے مل رہے تھے تو ہمیں اس وقت احساس نہیں تھا کہ نقاش کاظمی کے

ذہن میں کیا کشمکش ہے۔ان کی فکر کس کیفیت سے دوچار ہے۔اب ان کی نظم کی ایک ایک سطر یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ صرف کنکریٹ کی بنی اس عمارت کے درودیوار دریچوں برقی سیڑھیوں اور برآمدوں کو نہیں دیکھ رہے تھے۔وہ اقوام متحدہ کی تاریخ کے اوراق سے گزر رہے تھے۔مظلوم قوموں کی چیخیں سن رہے تھے محکوم انسانوں کی حسرتیں دیکھ رہے تھے۔بالا دست قوموں کی چیرہ دستیاں محسوس کر رہے تھے۔عالمی اقلیت کے مقابلے میں اکثریت کی بے بسی کا قریب سے مشاہدہ کر رہے تھے۔

کہ زیست شعلہ بداماں ہے
اس عمارت میں
لہو میں ڈوبی ہوئی
خون میں نہائی ہوئی

برسوں سے ذہن کو بیدار کرنے والی سوچ اس دیار میں ''رنگ سفر'' میں ایک مزاحمت کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔لیکن مانٹریال' ٹورنٹو' نیاگرافال کے مشاہدوں میں صاحب ''رنگ سفر'' پر اتنی حاوی نہیں ہوتی۔یہاں میز کے گلدان پر تازہ گلاب کھلتے ہیں۔ساز وصدا کا جمال ہے۔سارے بدن کے خطوط روح سے لبریز تر سازوں کی لے تیز تر ہے۔ناچ کی چہکار ہے۔ناچ کی مہکار ہے' نئی نئی ترکیبیں اصطلاحیں' استعارے جنم لیتے ہیں۔ادب برائے ادب کے مکتب سے تعلق رکھنے والے کینیڈا میں لکھی گئی ان نظموں میں زیادہ کشش محسوس کریں گے۔مگر سچ یہ ہے کہ وہ بہت کچھ لکھنے کے باوجود وہ کچھ نہیں لکھ پائے جو وہ لکھنا چاہتے تھے۔جبکہ کولمبس کی نئی دنیا میں داخل ہوتے ہی وہ بہت کم لکھنے میں بہت کچھ لکھ جاتے ہیں۔ان نظموں میں ایک آغاز بھی ہے اور ایک بھرپور انجام بھی۔فکر انگیزی بھی' اور عبرت آموزی بھی۔

اس طویل سفر کا حاصل تین غزلیں بھی ہیں۔ 22 نظموں کے مقابلے میں صرف 3 غزلیں۔

نظم لکھنے والے حضرات شاید برا مانیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ واقعات' مشاہدات اور محسوسات کو غزل کے پیکر میں ڈھلنے کے لیے طویل آنچ کی ضرورت ہوتی ہے۔نظم میں شعری تجربہ نیم پختہ بھی رنگ جمالیتا ہے۔غزل کا شعر بننے کے لیے ہر تجربے کو کئی آنچوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

تب کہیں ہوتی ہے اک مصرع تر کی صورت

میں اپنی بات کو ''رنگ سفر'' میں شامل ایک غزل کے ان اشعار پر ختم کروں گا جو کینیڈا امریکہ میں ہونے والے مشاعروں میں بھرپور داد وصول کرتے رہے۔

نئی رتوں میں بڑی حیرتوں کا منظر ہے
ہوا کے دوش پہ سورج کے ساتھ چلنا بھی
تلاش رزق میں سب ہجرتوں میں شامل ہے
زمیں' زمین سے اور گھر سے گھر بدلنا بھی'

''دل کی بات''

تتلیاں سوچ کی پھولوں میں بھرے رس کے لیے
رات بھر ذہن کے گلدان پہ منڈلاتی رہیں

O

ہم لوگوں کے پھول سے چہرے پیاسے ہیں
اور گلدان میں ریت کا سوکھا دریا ہے

O

گونج رہی ہے مجھ میں اب تک اس کی تیز آواز
ٹوٹنے والوں کے لہجے تو دھیمے لگتے ہیں

O

روز جس سمت سے ہنستے ہوئے پھول آتے تھے
آج آنگن میں اسی سمت سے پتھر آیا

O

یا تو دریا بھی کسی طور نہ آتے تھے قریب
اور دن آئے تو قدموں میں سمندر آیا

O

ایک روز میں بھی کہہ گیا بچوں سے دل کی بات
اب کیا ملے گا ٹوٹے کھلونوں کو جوڑ کر

O

ستم گری کی ابھی تو تمہاری باری ہے
کبھی تو آئے گا تم دیکھنا ہمارا دن

O

کسی کی یاد میں نقاش ہم نے ایک تصویر
اندھیری رات کی دیوار پر بنالی ہے

O

جسم میں کشتیاں سی تیرتی ہیں
روح میں بادبان بولتا ہے

O

مجھ کو لگتی ہے اپنی ہر آواز
جیسے خالی مکان بولتا ہے

حسنِ انتخاب: **عینی عقیل** (لاہور)

حقوق انسانی کا شاعر

سحر انصاری

(کراچی)

نقاش کاظمی ہماری شاعرانہ روایت کے اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔جن کی شاعری اپنے عوام اور اپنے گردوپیش کی زندگی سے اثرات کو قبول کرتی ہے۔اور پھر اس کی مغیث کو تبدیل کرنے میں خاطر خواہ حصہ لیتی ہے۔

سرکاری ریکارڈ سے قطع نظر خود اپنے بیان کے مطابق نقاش کاظمی 11 جولائی 1943ء کو یوپی کے مشہور شہر جونپور میں پیدا ہوئے۔گویا دوڈھائی ماہ بعد وہ بھی کہہ سکیں گے کہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔

لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے چہرے مہرے فعالیت مستعدی اور ادبی سرگرمیوں کی نسبت سے کالج یا یونیورسٹی کے وہی نوجوان نظر آتے ہیں جنہیں ان کے ہم عصروں نے ''صدائے جواناں'' یا ''وائس آف یوتھ'' کا خطاب 1969ء میں دیا تھا۔اس نصف صدی میں شعوری زندگی کا قابل قدر حصہ نقاش کاظمی نے ہمارے ماحول میں بسر کیا۔اس کی کہانی اس مدت میں پروان چڑھنے والی ہر نسل کی مشترکہ کہانی ہے۔حالات کا تغیر کبھی مساعد اور کبھی نامساعد، عام زندگی میں زردار اور نادار کی جنگ یہ ایسے مسائل ہیں جن کے لیے کسی پارٹی کا ممبر ہونے یا کسی نظریہ کی باقاعدہ تبلیغ اور تحصیل کا حصہ بننے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

ہمارے معاشرے میں کوئی تو کمی ہے کہ اقبال اور جوش اور ان کے بعد آنے والے ان شعراءادبا نے اس کی بہتری کے لیے مسلسل سوچا اور لکھا ہے جو سماج اور انسانی تاریخ کے حقیقی زاویوں پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔

اولمپک کھیلوں میں دوڑتا ہوا کھلاڑی مشعل اپنے بعد آنے والے کھلاڑی کو دے دیتا ہے اور یہ سلسلہ نور آگے بڑھتا رہتا ہے۔

لیکن اس نصف صدی میں پروان چڑھنے والی نسل کے پاس اپنے ساتھیوں یا اپنے بعد آنے والی نسل کو منتقل کرنے کے لیے کوئی روشن مشعل نہیں۔

بلکہ چراغ تہہ داماں ہے جس کے بجھ جانے کے اندیشے ہر وقت موت کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں۔نقاش کاظمی نے اپنے معاصرین میں اپنی پہچان اور شناخت یہ بنائی ہے کہ شروع ہی سے وہ اس کوچہ کے شیدائی ہیں۔جس کے بارے میں فیض احمد فیض نے واشگاف الفاظ میں کہہ رکھا ہے کہ۔

جو راہ ادھر کو جاتی ہے
مقتل سے گزر کر جاتی ہے

کیریر بنانے والے معاشرے میں خطرات کو دیدۂ ودانستہ قبول کرنا اور منفی قوتوں کے خلاف مسلسل اعلان جنگ کرتے رہنا کوئی آسان کام نہیں۔

جوش اور فیض سے حبیب جالب اور خالد علیم تک کے شعراء کو اس تناظر میں ایک نظر دیکھ لینا ہی کافی ہے۔

نقاش کے ہم عصروں میں سے کئی ایک نے اپنے لیے بڑا محفوظ اور بے گزند راستہ منتخب کر رکھا ہے لیکن چونکہ نقاش کی روح مضطرب نے ایک ایسی فضا کی تلخی کو شدت سے محسوس کیا ہے جو جبر، شدت آمریت، غیر جمہوری رویوں سے اکثر و بیشتر عبارت رہی ہے۔اس لیے وہ اپنے راستے سے کبھی ہٹتے نہیں نقاش کے ذہن وضمیر کا کرب ان اشعار میں پوری طرح نمایاں ہے۔

بدل گئیں ہیں کتابیں سبق کچھ اور ہوئے
گرا ہے جتنا لہو شامل نصاب ہوا

کرو نہ غم کہ ضرورت پڑی تو ہم دیں گے
لہو کا تیل چراغوں میں ڈالنے کے لیے

یہی ہے شہر وفا میں دلیل آمد شب
نظارے جاں سے گئے قتل آفتاب ہوا

سنان وخنجر وشمشیر ڈھالنا ہوں گے
یہ آستیں نہیں اب سانپ پالنے کے لیے

وہ ہاتھ کاٹ دو نقاش جو بڑھے ہیں ادھر
جنوں کے پاؤں میں زنجیر ڈالنے کے لیے

امیر شہر نے ملبوں کی تمنا میں
تمام شہر کے لوگوں کو بے لباس کیا

اب کے بہت رچے گا ہری مہندیوں کا رنگ
دیکھو تو اپنے پاؤں کی زنجیر توڑ کر

یہ پوری نسل کا المیہ ہے نقاش نے زندگی کی درسگاہ میں یہی نصاب پڑھا ہے۔جس پر نوجوانوں کے زندہ لہو کے چھینٹے ہیں۔اس لیے ہرگز تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ نقاش کی شاعری عہد حاضر کی خونچکاں داستان سے اپنے استعارے اخذ کرتی ہے طبقاتی جنگ ترقی پذیر شعور، محنت کش طبقے کے مسائل جمہوریت امن آشتی جیسے موضوعات نقاش کی شاعری میں بار بار ابھرتے ہیں۔

''ستاروں کی انجمن''

(جناب نقاش کاظمی کے کلام سے مختصر انتخاب)

عطیہ سکندر علی
(سکھر)

منظر روح پرور☆

(ایک نعتیہ نظم)

BREATH TAKING SCENE

سلسلے نور کے تاریکی میں تاحدِ نگاہ
آج بھی روح کے صحراؤں کو گرماتے ہوئے
ساری دنیا کی بصارت سے گزر جاتے ہیں
قمقمے ہیں کہ ستاروں کا کوئی جشنِ نزول
آسمانوں سے زمینوں کی سجاوٹ بن کر
سینۂ خاک پہ ادراک ہوا جاتا ہے۔۔
ملکۂ حسنِ ازل زیورِ نورستہ سے
اس طرح نور کی سچائی سے آراستہ ہے
موتیاں جیسے پروئی ہوں ہر اک منظر میں
ابرقی رنگ میں سمٹا ہے دیارِ عربی
اور انسان کی تعمیر سے تہذیب تلک
کہکشاں بن کے چمکتا ہے پیمبر گا جہاں۔۔
یہ جہاں تم بھی ذرا ذہنِ رسا سے دیکھو
اور چاہو تو تمنا کی فضا سے دیکھو
ہم نے دیکھا ہے یہ منظر بڑے طیارے سے
دشتِ امکان سے باہر کسی سیارے سے

☆ رات کو ہوائی جہاز کے اترنے سے پہلے جدہ شہر کے طواف کا ہوائی منظر نامہ

○

کہتے ہیں اس کو لوگ ترے نام کا درخت
آنگن میں جو لگا ہے نیا آم کا درخت

میں خوش گماں بہت تھا مگر مجھ پہ ٹوٹ کر
ایک اور آپڑا نئے الزام کا درخت

مُرجھا گئی ہے ساری نئی کونپلوں کی کوکھ
اب پھل کہاں سے دے دلِ ناکام کا درخت

میں جب بھی لوٹتا ہوں پرندوں کے ساتھ ساتھ
حیرت سے دیکھتا ہے مجھے شام کا درخت

تنہا کھڑا ہوا ہوں میں اپنی تلاش میں
گلشن میں جیسے گوشۂ گمنام کا درخت

انسان، آدمی کی ہی تکمیلِ ذات ہے
پودے کی ابتدا سے ہے انجام کا درخت

اک لمحہ عکسِ چشمِ غزالاں تو من کے دیکھ
یہ تُو ہے یا بہشت میں بادام کا درخت

نقاش کتنے نام محبت نے لکھ دیئے
شاید ترا بدن ہے بڑے کام کا درخت

○

زندگی کی آنکھ سے اوجھل نظارہ ہوگیا
عمر کی سرحد پہ رُکنے کا اشارہ ہو گیا

آسماں کی سمت سارے شب کے سیّارے ہوئے
میرا ساتھی شام کا پہلا ستارا ہو گیا

عادتاً ہی اُس کی اس جانب تھی نظرِ التفات
ہم سمجھتے تھے کہ شاید وہ ہمارا ہو گیا

تم تو ساری زندگی پیاری زمیں کی جان تھے
دور پھر کیوں آج دریا کا کنارا ہوگیا

بے خطر اس شوخ کی یادوں کو لے کر چلے دیئے
اس سفر میں یوں رفاقت کا سہارا ہوگیا

زیست میں ہر ہر قدم پر جاں سے ہم گذرا کیے
لوگ سب سمجھے یہ آسانی گذارا ہوگیا

کشتیِ امیّد کو ساحل کی پروا ہی نہ تھی
"جس جگہ پہ جا لگی وہ ہی کنارا ہوگیا"

چھوڑیئے نقاشِ تشبیہات کے معمول کو
لفظ تو اک اک غزل کا استعارا ہوگیا

☆

☆ ذوق اس بحرِ فنا میں کشتیِ عمرِ رواں
جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہوگیا

شکستِ حوصلۂ شب

یہی ہے شہرِ وفا میں دلیلِ آمدِ شب
نظارے جاں سے گئے قتلِ آفتاب ہوا
بدل گئی ہیں کتابیں سبق کچھ اور ہوئے
گرا ہے جتنا لہو شاملِ نصاب ہوا
بزورِ جبر وستمِ شہرِ دلبراں کی قسم
جو شہریار تھا وہ موردِ عتاب ہوا

عجیب موسمِ گل ہے برہنہ پا ہے بہار
دلوں میں سوگ کا عالم نظر فسردہ اُداس
نکلتے دیکھے ہیں رستوں پہ اہلِ دل کے جلوس
تھکے تھکے سے قدم اور تار تار لباس
روش روش پہ سجاؤ صداقتوں کے چراغ
جگہ جگہ سے بجھاؤ چراغ حسرت و یاس

سَروں کی فصل جو تیار ہے تو کیوں نہ کٹے
بہت ہے عہدِ جوانی تو کیوں ہو عمر دراز
ہمیں خبر تھی کہ سڑکیں بنیں گی مقتلِ جاں
کہ تم پڑھو گے جنازوں کی غائبانہ نماز
طریقۂ طلبِ انتقام یہ تو نہیں
بدلنے ہوں گے حریفوں سے جنگ کے انداز
شکستِ حوصلۂ شب زیادہ دور نہیں
یہ کہہ رہی ہے شہیدوں کی گمشدہ آواز

صحیح ہے کہ ہر اک گُل یہاں ہے جان بلب
مگر قبائے بہاراں کو تار تار نہ کر
غریبِ صبح کے کاسہ میں کچھ اُصول تو ہیں
امیرِ شب سے اجالوں کا کاروبار نہ کر
الٹ دے بڑھ کے بساطِ نظامِ کارِ جہاں
تو انقلابِ زمانہ کا انتظار نہ کر

ہم امن چاہتے ہیں

اک ہاتھ میں قلم ہے
اک ہاتھ میں علم ہے
اک پاؤں ہے زمیں پر
اک چاند پر قدم ہے
ہم جنگ کے ہیں دشمن
ہم امن چاہتے ہیں

اس کرۂ زمیں پر
اک پیار کا سماں ہو
ظلم وستم سے بچ کر
انسان شادماں ہو
ہم جنگ کے ہیں دشمن
ہم امن چاہتے ہیں

ہر خطۂ زمین اب
پھولوں کی سرزمیں ہو
رنگوں سے روشنی سے
روشن ہر اک جبیں ہو
ہم جنگ کے ہیں دشمن
ہم امن چاہتے ہیں

کھیل آگ اور خوں کا
اب ختم ہوتو بہتر
پیغامِ امن عالم
ہر اک بشر کے لب پر
ہم جنگ کے ہیں دشمن
ہم امن چاہتے ہیں

ملکوں کی سرحدوں پر
کچھ ایسی یاریاں ہوں
افواج کے بجائے
پھولوں کی کیاریاں ہوں
ہم جنگ کے ہیں دشمن
ہم امن چاہتے ہیں

○

اپنی بخشش وہ بصد نازو ادا چاہتا ہے
اور سرکار سے بس میری سزا چاہتا ہے

تیرا بیمار نہ دارو نہ دوا چاہتا ہے
سوئے افلاک مگر دستِ دعا چاہتا ہے

کوئی تو چاند کی دہلیز پہ رکھتا ہے قدم
اور کوئی خاک پہ نقشِ کف پا چاہتا ہے

میں وہ آنسو ہوں کہ بن بن کے سدا قطرۂ خوں
یم بہ یم چشم تمنا سے گرا چاہتا ہے

شہر میں حبس کا موسم ہو تو ہر زندانی!
صحنِ زنداں میں فقط تازہ ہوا چاہتا ہے

اتنی دنیا ہوئی ویراں کہ دلِ دیوانہ
کوئی خوشبوٗ کوئی شبنم نہ صبا چاہتا ہے

میں بھی کرنے لگا اب کوئے رقیباں کا طواف
تو جو کہتا تھا کوئی مجھ سے سوا چاہتا ہے

اب تو آنکھوں سے برسنے لگا دل ہو کے لہو
اور کیا مجھ سے ترا دستِ حنا چاہتا ہے

گردشِ جاں ہوا جاتا ہے مرا پیکرِ خاک
دشتِ وصحرا میں بگولہ سا اٹھا چاہتا ہے

سر پہ نقاشِ چمکنے کو ہے اک قوسِ قزح
دیکھیں کیا رنگ نگاہوں پہ کھلا چاہتا ہے

☆

○

ساری خشکی اور سمندر آنکھوں میں
ڈوبے گا اب کونسا منظر آنکھوں میں

کوئی اس کو ہجر کہے یا محرومی
کاٹا ہم نے عمر کا پتھر آنکھوں میں

آڑی ترچھی شکنیں ڈسنے لگتی ہیں
چبھتا ہے اب خالی بستر آنکھوں میں

راتوں میں ہیں موتی، شبنم، ستارے، پھول
مٹی، ریت اور دھوپ ہے دن بھر آنکھوں میں

ہم جھیلوں کی گود میں بسنے والے لوگ
کیسے اتریں اس کی سمندر آنکھوں میں

دائرے گننے والا شخص نہیں مانا
پھینک رہا ہے چن چن کنکر آنکھوں میں

دفتر جاؤ تو بیوی، بچے اور مسائل
گھر میں رہو تو سارا دفتر آنکھوں میں

بینائی کا کوئی تو محرک ہو نقاش
دید اگے گی کیسے بنجر آنکھوں میں

کارڈیوگرام

جہاں میں ہوں وہاں ازراہِ رسمِ دل داری
ہر ایک حلقہ بہ حلقہ چلا ہی آتا ہے
مگر جو آنہیں پاتا وہ دل کے طاقوں میں
نہ جانے کیسے لہو کے دیئے جلاتا ہے

دیئے لہو کے جلیں یا کہ مشعلِ جاں کے
ستم کی راہ میں شامل ہے ہر جراحتِ دل
بہ دستِ رنگِ حنا، پھول خواہشوں کے پیام
کہ وہ جفا پہ ہو نازاں تو میں وفا پہ خجل

یہ ای۔ سی۔ جی بھی عجب ہے، عجب ہے ''کارڈیوگرام''
جو سارے بند دریچوں کو کھول دیتا ہے
میں چپ ہوں پر مرے دل میں جو ایک تہلکہ ہے
وہ دردو زخم کا ہر نام بو ل دیتا ہے

○

وحشت کا ایک لمحہ

جب ستاروں کی انجمن نہ رہی
پھول کھل گئے وفاؤں کے
دن بھی۔ تاریکیوں میں ڈوب گیا
رات بھی سانپ کی طرح آ کر
میرے سینے پہ لوٹ جاتی ہے
کیا خبر ہے بچھڑنے والے کو
ایسا عالم بھی۔ مجھ پہ گذرا ہے
ہر سلگتی فضا کی زلفوں کو
ہر مہکتی ہوا کے ہونٹوں کو
میں نے۔
وحشت میں چومنا چاہا

○

لے اُڑی سارے رنگ و بوُ شہر کی ناسمجھ ہوا
کر گئی دل کو پھر لہو شہر کی ناسمجھ ہوا

ہم نہ رہے تو دیکھنا ' کس پر کرے گی نازوہ
تنہا پھرے گی کو بہ کوُ شہر کی ناسمجھ ہوا

مشقِ ستم کو صبح شامُ تاک رہی ہے دیر سے
کون سا اب چراغ تو 'شہر کی ناسمجھ ہوا

میں بھی ہوں نفرتوں کے بیچ تو بھی ہے قتل گاہ میں
کاٹ نہ دے رگِ گلو ' شہر کی ناسمجھ ہوا

دل کی ہلاکتوں سے ہے ساری فضا دھواں دھواں
کس کو کرے گی سُرخروُ شہر کی ناسمجھ ہوا

شعلۂ جاں کو جاں بلبُ چھوڑ کے آ کھڑی ہوئی
آتشِ گل کے روبروُ شہر کی ناسمجھ ہوا

عشق عذاب ہو گیاُ روٹھ گئیں محبتیں
جب سے ہوئی ہے دو بدوُشہر کی ناسمجھ ہوا

آنکھ کھلی تو صبح عدم برسرِ عام کہہ گئی
خلوتِ شب کی گفتگو ' شہر کی ناسمجھ ہوا

موسمِ گل کے واسطے کاش کہ تیرے دل میں ہو
سالِ رواں کی آرزوُ شہر کی ناسمجھ ہوا

☆

○

نہ رہنما کی طرح اور نہ راہبر کی طرح
کھڑے ہوتے ہیں سبھی سنگِ رہگذر کی طرح

جو دور تک ترے ہونے کا کچھ پتا نہ چلا
نگاہ لوٹ گئی آہِ بے اثر کی طرح

وہ زخم تھا تو گوارہ چشم ولب کی مثال
مگر وہ پھیل گیا درد کے شجر کی طرح

لہو لہو ہے مگر خود کو روکتا بھی نہیں
یہ کون ہے مرے پہلو میں ہمسفر کی طرح

کوئی پیامُ کوئی پھول یا کوئی خوشبو؟
کھڑا ہوں میں درِ جاناں پہ نامہ بر کی طرح

گیا تو سارے معانی خَلا میں چھوڑ گیا
وہ میری ذات میں تھا حرفِ معتبر کی طرح

مرا مکاں تو مقابل تھا زلزلوں کے مگر
لرز رہا تھا کوئی مجھ میں بام و در کی طرح

سو اب حقوق بشر زیر پا ہوئے نقاش
تمام اہل خرد اب ہیں سنگ و در کی طرح

☆

اہلِ قلم کا نیا عہد نامہ

سب شیشۂ جاں ریزہ ریزہ
سب قریۂ دل ٹکڑے ٹکڑے
سب درد کے رشتے یکساں ہیں
یہ دکھ کا نگر ہم سب کا ہے
یہ زخم تو اب مشترکہ ہے
سب شیشۂ جاں ریزہ ریزہ
سب قریۂ جاں ٹکڑے ٹکڑے
لیکن قفسِ مینا میں
سانسوں کا تسلسل باقی ہے
کیا غم ہے کہ اک دل ٹوٹ گیا
دلدار مگر سب زندہ ہیں
ہر جسم سلامت ہے اب تک
ہر جسم میں ترے رقصاں ہیں
ہر جسم میں سورج روشن ہے
ہر چاند کا چہرہ کندن ہے
کیا غم ہے کہ اک دل ٹوٹ گیا
دلدار تو سب تابندہ ہیں
سب لوح و قلم رخشندہ ہیں
ہر ذہن اندھیرے جنگل میں
اک جلتا بجھتا جگنو ہے
لیکن......وہ جو سب کچھ توڑ گیا
وہ سامریوں کا جادوگر
جو ظلمتِ شب کا بانی ہے
طاقت بھی وہی قوت بھی وہی
آگے تو بڑھو کمریں تو کسو
دھرتی کے امیں سب مل جل کر
اُس ظلمتِ شب کے سینے کو
اب چاک کریں اب چاک کریں
جب لوح و قلم رخشندہ ہیں
کیوں؟ اہلِ قلم اس سوچ میں ہیں؟
اب کیا لکھئے۔اب کیا پڑھئے
جب تک کہ جہانِ ظلمت کا
ایک ایک ستمگر باقی ہے
اے سارے جہاں کے مظلومو
اے بزمِ جہاں کے انسانو
اے روشنیوں کے دیوانو
ہم ردِّ جفا میں لکھیں گے
ہم ردِّ بلا میں لکھیں گے

☆

میری گنتی

وہ پتھر تھا
اُس کی آنکھیں
اُس کے ہونٹ بھی
پتھر کے تھے
میں نے ان میں
روح بھری اور جاں کھینچی تھی
پھر وہ اپنی شریانوں میں
سُرخ لہو کا ایندھن پا کر
میری گنتی بھول گیا

☆

تصویر

کبھی کبھی تو
میں آئینہ دیکھنے کے بجائے
ڈرائنگ روم کی تنہائیوں میں سمٹی ہوئی
تمہارے حُسن کی۔تصویر دیکھ لیتا ہوں

○

جب کبھی دیوار کا لہجہ سفر کرنے لگے
آدمی اینٹوں کی گہرائی میں گھر کرنے لگے

کون سا عہدِ وفا ہے لوگ خونِ خلق سے
عشق کی ہاری ہوئی بازی کو سَر کرنے لگے

رقصِ بسمل دیکھ کر مقتل میں تلواروں کے پیچ
ہم بھی اپنے خوں سے پیراہن کو تَر کرنے لگے

کیا عجب عہدِ ستم پرور ہیں دیوانوں کی فوج
زندگی خاموش لمحوں میں بسر کرنے لگے

پل بہ پل محلِ نظر ہے شانِ رسمِ عاشقی
زخم سینے کا سیا ماتھے کو دَر کرنے لگے

اوڑھ لی تعبیر کی مٹی کسی نے اور ہم
خواب کی صورت خلاؤں میں سفر کرنے لگے

اپنا فن نقاشؔ رکھئے گا بچا کر جہل سے
اب تو دنیا کا ہنُر سب اہلِ زر کرنے لگے

☆

امرتا پریتم کے لئے۔ایک نظم

کہاں ہوتم
کہ۔جلاؤ کوئی چراغِ وفا
کہاں ہوتم
کہ اٹھاؤ محبتوں کے علم
کہاں ہوتم
کہ دکھاؤ سیاہ رات میں راہ۔
تم اب کے آؤ......تو آگے بڑھیں گے،ہم
کچھ اور
تمہی سے سیکھیں گے امروز کیا ہے فردا کیا
تمہی سے سیکھیں گے پھر،ہم
نشاطِ امن کی راہ
کہ تم نے ایک زمانے کو روشنی دی ہے
وہ روشنی کہ جو اہلِ قلم کی آبرو ہے
وہ آگہی جو زبانوں کی زندہ خوشبو ہے
جو تم نہیں ہو تو دھندلا گئیں ہیں۔روشنیاں
جو تم نہیں ہو تو کجلا گئیں ہیں۔چاندنیاں
کہ تم ہی پریت کی وارث تھیں
شعلوں پر شبنم
اُمرتا۔پریتم
امرتا پریتم۔

☆

اقوام متحدہ کی عمارت میں چند لمحے

FEW MOMENTS WITH UNO/BUILDING

لہو میں ڈوبے ہوئے
خون میں نہائے ہوئے
جگر سنبھالے ہوئے
اپنی لاش اٹھائے ہوئے
تمام اہلِ بصیرت!
سوال کرتے ہیں
کہ نسل آدم وحوا
مہیب شعلوں میں
کہاں تلک
تپش جنگ کے
بگولوں میں
حیات نو کے لئے
''بھیک''
سردخانون سے
''قیام امن'' کا
کشکول لے کے مانگیں گے......
یہ ''امن'' وہ ہے
جو مظلوم کی امانت ہے
یہ ''امن'' وہ ہے
جو انسان کی ضمانت ہے
مگر جو ظلم
روا ہے نحیف قوموں پر
مگر وہ مشق ستم
ساری زندہ نسلوں پر
مگر وہ برش شمشیر
موج گل کے خلاف
تمہاری
''مجلس اقوام''
کا ترانہ ہے
کہ جس کی شہ پہ
پر فاختۂ نشانہ ہے
کہ راکٹوں سے
فضاؤں کا جسم روشن ہے
کہ زخمِ زخم
یہ میزائلوں سے
تن من ہے
کہ زیست شعلہ بداماں ہے
اس عمارت میں
کہ جرم۔ جرم ہے اب
امن کے خیانت میں
یہ کون ہیں
جو سر بزم آ کے ناچتے ہیں
یہ کس نشاط سے
قبریں بنانا چاہتے ہیں
یہ بھیڑیئے ہیں
جو سب کو
چبانا چاہتے ہیں......
خطیب قوت عالم
نظام نو کے نقیب
جواب دو کہ یہ کیوں
دندناتے پھرتے ہیں
یہ کیوں تمہاری
سیہ مجلسی عمارت میں
ستم کی رات کا
پرچم اٹھائے پھرتے ہیں
کہ زیست شعلہ بداماں ہے
اس عمارت میں
لہو میں ڈوبی ہوئی
خون میں نہائی ہوئی

☆

O

آسیب کے جب دیکھنے والے نکل آئے
معصوم درختوں پہ بھی جالے نکل آئے

اے ماں کبھی تجھ پر جو کوئی وقت پڑا ہے!
میداں میں تری گود کے پالے نکل آئے

جگنو مجھے جنگل میں دکھاتے ہوئے بولا
لے دیکھ ترے چاہنے والے نکل آئے

تعبیر کے پیروں میں تو کانٹے ہیں مسلسل
آنکھوں میں ترے خواب کے چھالے نکل آئے

کہتے ہیں کہ اس بار دسمبر نہیں آیا۔!
پھر کیسے دھنک رنگ دوشالے نکل آئے

سقراط بھی، عیسیٰؑ بھی حسین ابن علیؑ بھی
مقتل میں مرے کتنے حوالے نکل آئے

ہم نے جو کہا ''سچ'' کی قسم کھاؤ تو کچھ لوگ!
ہاتھوں میں لئے زہر کے پیالے نکل آئے

جب رسم چلی چُپ کی تو ہونٹوں پہ لگا کر
ہم گھر سے نئے طرز کے تالے نکل آئے

حیراں ہوں مُدیروں کا جہاں قحط پڑا ہوا
نقاشؔ وہاں کتنے رسالے نکل آئے

☆

ملّی نغمہ

باغوں سے ہرا پرچم
خوشبو سے بھرا پرچم
آکاش کے تاروں میں
دھرتی کے نظاروں میں
ہم اونچا رکھیں گے
ہم اونچا رکھیں گے......باغوں سے ہرا پرچم

ہاں قوم کی آنکھوں کے
ان چاروں چراغوں کو
اور عزم ویقیں سارے
مٹّی سے کئے وعدے
ہم زندہ رکھیں گے
ہم زندہ رکھیں گے......باغوں سے ہرا پرچم

اس باغ کے مالی کا
ہر پھول تجلّی کا
پُر امن مقاصد کا!
اور علم و ترقی کا......!
ہم تازہ رکھیں گے
باغوں سے ہرا پرچم

☆

منتخب ہائیکوز

غم سے اماں

غم سے اماں ہے
یاحیُّ - یا قیّومُ
وردِ زباں ہے

زلزلہ ۸ فروری

تڑپی خاکِ شمال
نسلیں ملیا میٹ ہوئیں
جب آیا بھونچال

ڈیم کے پانی میں

کھینچا تانی میں
بستی ساری ڈوب گئی
ڈیم کے پانی میں

خودسوزی

ہم ہی قاتل تھے
اپنے ناداں دل خاطر
ہم ہی قتل ہوئے

میرے عہد کی مکھی

مکّھی شہد کی ہے
زہر اُگلتی رہتی ہے
میرے عہد کی ہے

دھنک کا راستہ

آؤ رنگ بنیں
دور دھنک کے رستے پر
تتلی سنگ چلیں

گویم مشکل

سکھ کا سپنا بھی
کتنا مشکل ہے یارو
گھر میں رہنا بھی

سچائی کا رشتہ

کچھ انجانے خواب
صدیوں سے ہمرشتہ ہیں
برگد اور تالاب

زخموں کے پھول

زخم یہ کل کے ہیں
دل کی جھیلوں کے اوپر
پھول کنول کے ہیں

تازگی بہاروں کی

پیلے سر کنڈے
دلدل میں بھی تازہ ہیں
کچھوؤں کے انڈے

نیا سبق

فن یہ بھی سیکھیں
مچھلی والا توڑے گا
جھینگوں کی مونچھیں

اردو کی خوشبو

دل، تتلیٔ جگنو
سڈنی میں بھی پھیل گئی
اردو کی خوشبو

☆

سپاہ آزادی کا انقلابی مجاہد

نقاش کاظمی

ظلم خواہ زمانہ قدیم میں ہو، از منہ وسطےٰ میں ہو یا دورِ حاضر میں ظلم ہی کہلاتا ہے۔ ظلم وستم کے قوانین مطلق العنانی، جبر واستبداد اور سامراجی اقدامات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے، مکاری وعیاری کے مدّ مقابل سینہ سپر۔۔۔۔ ہو جانے والی شخصیتیں تاریخ میں ہمیشہ انقلابی کردار کے نام سے یاد کی جائیں گی۔ وہ شخصیتیں سقراط کی ہوں کہ عیسےٰ ابن مریم کی، حسین ابن علیؑ کی ہوں یا حسین فاطمی کی، بھگت سنگھ کی ہوں یا لوممبا اور وان ترائے کی، ہم ان تمام محترم افراد کی سچائی کی تاریخ مرتب کرنے والوں سے الگ تھلگ نہیں رکھ سکتے۔ ہر دور میں گزرنے والے ستم بالائے ستم کے شکار افراد جب لوٹ کر ایک مرتبہ ماضی کے کینوس پر ان تاریخ ساز کرداروں کی جانب دیکھتے ہیں تو پتھر بن جانے کی بجائے انکے رگ وپے میں بھی ظلم کے خلاف بغاوت، انقلاب اور بیداری کا لہو تیزی سے گردش کرنے لگتا ہے۔ ان کے سینے میں بھی ایک عظیم جذبۂ حریت کسی آتش فشاں کی طرح پھوٹ پڑتا ہے۔ آج کے اس دور میں بھی ہم ان کارناموں کو بھلانے کے لیے تیار نہیں جو حق وصداقت اور آزادی ومساوات کے نفاذ کے لئے اور ملوکیت واستعماریت کے مقابلے میں سرانجام دیئے گئے۔

اس مضمون میں ہم جس بلند حوصلہ، سرفروش اور جنگجو کردار کا ذکر کرنے والے ہیں۔ وہ ہے برِعظیم کی سپاہ آزادی کا ایک انقلابی مجاہد جو سالہا سال تک فرنگی سامراج کے جذبہ مطلق العنانی، جبر واستبداد اور وطن پر غاصبانہ قبضے کے خلاف نبرد آزما رہا ہے جس کے لئے اسے بار بار ایام اسیری اور قید وبند کے مصائب کو گلے لگانا پڑا۔ اس ''بطل حریت'' کا نام حسرت موہانی (سید فضل الحسن) ہے، جس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کی دفتری زبان میں مخصوص نشاندہی کیلئے نمبر تین کہا جاتا تھا۔ جب حسرت موہانی کی نقل وحرکت کی نگرانی کے سلسلے میں ایک جگہ کے ''قانون نافذ کرنے والے ادارے'' آپس میں خفیہ پیغامات کا تبادلہ کرتے تو صرف نمبر تین کا ہی اشارہ یا علامت یا ہندسہ استعمال کیا کرتے تھے۔

مولانا حسرت موہانی ہمیشہ سے ہی رکاوٹوں، سختیوں اور مشکلات کی تسخیر کو ہی اپنے لئے امتیاز اور خوشدلی کا باعث تصوّر کیا کرتے تھے۔ اس بناء پر حسرت موہانی کی شخصیت متضاد کیفیات کی حامل رہی۔ بچپن میں ریاضی اُن کا پسندیدہ مضمون تھا اور جوانی میں شاعری اور قربانیاں۔ حسرت جہاں عالم تھے وہاں عامل بھی تھے۔ انہوں نے علم کو عمل کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اپنی تحریکوں کو آگے بڑھایا۔ انھوں نے جتنا عظیم کام شاعر کی حیثیت سے کیا اس سے کہیں زیادہ بڑا اور زندہ جاوید رہنے والا کام ایک انقلابی اور غاصب حکومت کے باغی کی حیثیت سے کیا۔ انھوں نے ایک دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ عملی طور پر جو کچھ کیا اس کی وجہ سے آج انہیں ''سیاسی نظام حیات'' اور ''دستور العمل'' رکھنے والے اکابرین اور صاحبانِ علم وتدبّر کی صف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

حسرت موہانی اپنی اوائل عمری سے ہی وطن پرستی اور حرّیت پروری کے جذبہ سے سرشار تھے اور برطانوی سامراج کے ہندوستان میں غاصبانہ قبضے کو زبردست ناپسندیدگی بلکہ نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں ہی انگریزوں کے خلاف نعرے لگائے اور ان کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا۔ اسی زمانے میں وہ دوسرے طلبہ کو بھی ''مادر وطن'' کی آزادی سلامتی اور خود مختاری کی جدوجہد کے لئے آمادہ کرتے تھے۔

حسرت ۱۸۷۵ء میں ہندوستان کے ایک قصبہ موہان میں پیدا ہوئے اور مڈل کا امتحان پورے صوبہ میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تو ان کی قابلیت اور صلاحیتوں سے متاثر ہو کر سر ضیاء الدین نے انہیں علی گڑھ کالج میں بلوالیا جہاں سے انھوں نے سنہ ۱۹۰۳ء میں بی۔اے پاس کیا۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ حصول مقاصد میں پیش کسی طرح کی بھی دشواری سے نہیں گھبراتے تھے اور کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کو پا لینے کی جستجو میں تمامتر مصائب ومشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے۔ کہتے ہیں اُن کی طبیعت میں شروع سے ہی ضدی پن اور ہٹ دھرمی پائی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی مشہور ہے کہ:

> ''حسرت موہانی جب علی گڑھ میں داخل ہوئے تو انہوں نے پیسے جمع کر کے ایک بانسری خریدی اور اسے اپنے ہوسٹل کے کمرہ میں بجایا کرتے تھے۔ جس پر کچھ طالب علموں کو اعتراض ہوا کہ اس طرح ان کے پڑھنے میں خلل واقع ہوتا ہے۔ حسرت کو اس بات پر سخت غصہ آیا لیکن وہ خاموش رہے۔ اب حسرت کو جب بانسری بجانے کا شوق اُٹھتا تو بیت الخلاء میں چلے جاتے اور خوب بانسری بجاتے دوستوں نے دریافت کیا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ حسرت نے جواب دیا! اپنے کمرہ میں بجاتا ہوں تو لوگوں کے پڑھنے میں خلل آتا ہے اور لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ اس لئے جب میرا دل چاہتا ہے تو میں یہاں آجاتا ہوں۔ یہاں تو کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا اور نہ کسی کے مطالعہ میں خلل۔''

بچپن کی اس آزادی اور خود پسندی نے آگے چل کر حریت پسندی اور باغیانہ رجحان کی صورت میں جنم لیا اور اسی جذبہ کے تحت ان کی طبیعت اکثر بے چین رہا کرتی تھی۔ زمانہ طالب علمی میں حسرت نے علی گڑھ کالج کے کئی عہدے سنبھالے اور انجمن اردوئے معلّٰی کے معتمد اور مہتمم بھی رہے۔ اس وقت تک حسرت کی شہرت دُور دُور تک پہنچ چکی تھی، اسی دوران ایک مشاعرہ کے انعقاد کے سلسلے میں کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر مارلین (جو کہ انگریز زیادہ اور استاد کم تھا) سے ایک مسئلے پر اختلاف پیدا ہو جانے کے بعد کالج سے نکال دیا گیا لیکن

بعد میں کچھ لوگوں کی سفارش پر امتحان کا فارم کالج سے ہی بھیجا گیا۔

کالج سے نکلنے کے بعد ۱۹۰۳ء میں انہوں نے نے علی گڑھ سے ہی اپنے مشہور ''ادبی وسیاسی'' رسالے ''اُردوئے معلّیٰ کا اجراء کیا۔ جو بیلاگ سیاسی اور ادبی مبصّر ہونے کے اعتبار سے عوام میں بے حد مقبول ہوا۔ ۱۹۰۸ء میں اسی پرچہ میں ایک مضمون بعنوان ''مصر میں انگریزوں کی پالیسی'' شائع ہوا۔ اس مضمون کو اُس وقت کی انگریزی حکومت نے باغیانہ قرار دیا اور صاحب مضمون کا نام دریافت کرنے کا نوٹس دیا اور بہت زور ڈالا گیا لیکن حسرت موہانی نے مضمون نگار کا نام ظاہر کرنے سے صاف انکار کیا اور اپنی ضد پر اڑے رہے۔ (بعد میں جناب جلیل قدوائی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ یہ مضمون عبدالحق صاحب کی اُردو اور فضل امین کی انگریزی کا خلاصہ تھا جو اقبال سہیل صاحب نے مرتب کیا تھا) اس انکار پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ اور حسرت موہانی کو ڈیڑھ سال قید با مشقت اور پانچسو روپے جرمانے کی سزا دی گئی جبکہ اُردوئے معلّیٰ کی ماہانہ آمدنی بمشکل پچاس ساٹھ روپے ہوتی تھی ۔

نہ تجھے کرم سے ہے واسطہ نہ ہے درگزر ہی کا حوصلہ
کس اُمید پر ترے رُوبرُو کوئی اعتراف خطا کرے

حسرت بڑے راسخ العقیدہ اپنی دُھن کے پکّے تھے اور اس طرح جلنے والے چراغوں کو طوفان کے شدید سے شدید تر جھونکے نہ کبھی بجھا سکے ہیں نہ بجھا سکیں گے۔ بلکہ حسرت کے اندر روشن ہونے والے اس چراغ کی لَو نے پہلے الاؤ پھر آتش فشاں جیسی صورت اختیار کر لی جو کسی طرح بھی برطانوی حکومت کے جبر وستم کی یخ بستہ ہواؤں سے بُجھائے نہ بُجھی اور حسرت موہانی سیاست اور ادب کے محاذ پر ایک نا قابلِ تسخیر کوہ گراں کی طرح اٹل رہے۔

بی۔اے پاس کر کے بجائے اس کے کہ حسرت کہیں کلکٹری یا دوسری اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں چلے جاتے انہوں نے قوم کی خدمت اور ادب کی ترویج واشاعت کو اپنا نصب العین بنایا جبکہ ان کے دوسرے ساتھی فارغ التحصیل ہونے کے بعد بڑے بڑے عہدوں پر بآسانی فائز ہوگئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کالج کے پرنسپل مسٹر مارلین اور جناب محسن الملک کی نظرِ عنایت جس پر ہو جاتی وہ ان کے ایک جنبشِ ابرو پر فرش سے عرش پر پہنچ جاتا۔ ان تمام حالات کے باوجود حسرت نے ''سچائی کی عظمت''، ''مظلوم کی حمایت'' اور حق پرستی کو اپنا شعار بنایا اور ساری زندگی غربت افلاس عتاب اور سادگی میں بسر کی۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ انگریزوں کی قید بامشقت حقیقت میں ''بامشقت'' ہی ہوتی تھی۔ ایسا نہیں ہوا کہ وہ گریجویٹ تھے تو قید میں ''اے کلاس'' مل جاتی۔ یا سیاسی رہنما تھے تو ''ایئر کنڈیشنڈ'' کمرہ مل جاتا۔ نہ کسی سے ملنے کی اجازت ہوتی تھی نہ کچھ لکھنے لکھانے کی سہولت۔ اندازہ لگایئے کہ جب ڈیڑھ سال قید بامشقت کے لئے حسرت موہانی کو جیل میں داخل کیا گیا تو ان کے پاس صرف یہ سامان تھا، ایک لنگوٹ، ایک جانگیہ ایک کرتہ اور ایک ٹوپی پہننے کو۔ ایک ٹکڑا ٹاٹ کا اور ایک کمبل اُوڑھنے بچھانے کو، ایک لوہے کا بڑا لوٹا اور ایک چھوٹا

(اُردوئے معلّیٰ ۴ اگست ۱۹۰۸ء) جیل میں حسرت موہانی قید تنہائی میں رہے اور روزانہ ایک من گندم چکی میں پیسنا پڑتی تھی اور اسی صورتحال اور یادگار موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حسرت نے ''حسیات'' سے متعلق یہ لافانی اور مشہور زمانہ اشعار کہے ۔

ہے مشق سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اک طرف تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

جو چاہے سزا دے لو تم اور بھی کُھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جیل میں خراب آٹا ملنے کی وجہ سے کچھ قیدی حسرت کے پسے ہوئے آٹے میں سے تھوڑا بہت چرا لیتے تھے جس کے عوض حسرت کو پانچ بیدفی سیر کے حساب سے مزید سزا دی جاتی۔ جیل کی اس طرز کی زندگی نے مولانا کو سخت مشکلات پر بہ آسانی قابو پالینے والا، بہادر، نڈر اور ڈٹ کر مقابلہ کرنے والی شخصیت بنا دیا۔ اور ان کے اندر ایک نئے عزم کا انسان تخلیق کیا۔ صحیح معنوں میں اسی زمانہ قید وبند نے حسرت کے کردار کو تاریخ کا طبقاتی کردار بنانے میں مدد دی اور حق کی حمایت میں آواز بلند کرنے میں استقامت بخشی۔ یہ بات بھی ناقابل فراموش ہے کہ اس دور کے سیاسی قیدیوں میں حسرت پہلے قیدی تھے جنہیں قید تنہائی برداشت کرنی پڑی۔

ممتاز نقاد پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے جن کو حسرت سے والہانہ لگاؤ تھا، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''حسرت اپنے زمانہ اور اپنے دور کی نہایت سچی اور کھری پیداوار تھے اور اپنے زمانے کے ان اماموں میں سے تھے جن کی گنتی بارہ تک بھی نہیں پہنچتی۔''

مجنوں گورکھپوری نے ان خیالات کے اظہار میں کسی دُروغ گوئی یا عقیدت کے اندھے پن سے کام نہیں لیا بلکہ آزادیٔ ہند کی اس عظیم انقلابی شخصیت کی صحیح معنوں میں تعریف کی ہے۔ اس اعتبار سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حسرت ان چند عظیم انسانوں میں سے ایک تھے جن کی انسانیت نواز سیاسی بصیرت نے ان کی شاعری اور بالخصوص غزل کی صفات کو آدمیت کی منزل سے انسانیت۔۔۔۔ کی چوٹی پر پہنچانے کا فرض ادا کیا۔ چونکہ وہ کوئی مفکّر نہ تھے لہٰذا شاعری کو دل کی آواز اور غزل کو دھڑکنوں کا قدم ساز بنا کر چلنے کی کوشش کرتے رہے ۔

اے وہ کہ تجھے شوق ہے تحسین سخن کا
میرا جو کہا مان تو حسرت کی غزل دیکھ

حسرت موہانی اور اُردوئے معلےٰ اس زمانے میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں مقبولیت خاص وعام حاصل کر چکے تھے۔ بہت سے صاحب ثروت اور ممتاز حضرات بھی دونوں کو بڑا قابل احترام سمجھتے تھے اور ان سے دلچسپی بھی رکھتے تھے۔ لیکن کھل کر اُردوئے معلّیٰ سے تعلق ظاہر کرنے میں خوف محسوس

کرتے تھے۔ان میں زیادہ تر تعداد مسلمانوں کی ہی تھی اس لئے کہ اس قدر پابندیوں اور ہدایتوں کے باوجود یہ پرچہ اپنی پالیسیوں میں لچک اور تبدیلی پیدا کرنے پر تیار نہ تھا۔اور یہی نعرہ لگائے جارہا تھا کہ ملک کی تمام تر خرابیوں کا واحد علاج ''بیرونی طاقت سے آزادی حاصل کرنا ہے''۔ جسے زبردست مقابلے' دلیرانہ جدوجہد' قربانیوں اور شہادتوں کے ذریعے حاصل کرنا ہوگا۔

۱۹۲۱ء میں احمد آباد کے مقام پر کانگریس کے اجلاس میں حسرت موہانی نے ''آزادیٔ کامل'' کی تجویز پیش کی تو مہاتما گاندھی نے اس قرارداد کی مخالفت کی۔اس کے بعد مولانا نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کرلی اور اس زمانہ میں جبکہ کانگریس اپنے اجلاس میں سلطنت برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا ''ریزولیشن'' پاس کیا کرتی تھی۔حسرت موہانی نے زبردست طریقے سے ہندوستان میں پریس اور صحافت کی آزادی کے لیے آواز اُٹھائی۔اور غیر ملکی تسلّط کے خلاف نعرہ لگایا۔یہی نہیں بلکہ روس میں کمیونزم اور بالشویک ازم کی تحریکوں نے بادشاہت کے خلاف انقلاب برپا کیا تو روس کے اس نئے نظام پر اُردو میں سب سے پہلے حسرت نے اپنے رسالے ''اُردوئے معلیٰ'' میں تعریفی اور ستائشی مضامین لکھے جس سے انگریزوں کی سامراجی ذہنیت پر ایک اور نا قابلِ برداشت زد پڑی۔

بعض لوگوں کا یہ اعتراض بھی حق بجانب ہے کہ حسرت کبھی کانگریس میں شامل ہوجاتے تھے اور کبھی مسلم لیگ میں؟ اس کا نہایت ہی سادہ سا جواب ہمیشہ انھوں نے خود ہی کئی مواقع پر دے دیا۔

''کہ جو پارٹی میرے خیالات ونظریات سے ہم آہنگ ہوجاتی ہے میں اس میں شامل ہوجاتا ہوں''۔پھر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ نظریات کیا تھے؟ جس بناء پر انگریزوں کے تسلّط سے آزاد ہوجانے کے بعد حسرت کے اضطراب میں کوئی کمی نظر نہ آئی اور نہ وہ اپنے مدّاحوں اور دوستوں کو مطمئن نظر آئے! بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''رائج الوقت نظام'' سے حسرت کی ناآسودگی اس جانب واضح اشارہ ہے کہ سامراج کے بھاگ جانے کے باوجود عوام الناس اور اس خطّے کے لوگوں کو اقتصادی' تمدنی اور سیاسی فراغت نصیب نہیں؟ اور ساتھ ہی تمام کا تمام نظام اسی سیاہ بادل کی صورت میں چھایا ہوا ہے جو کہ فرنگی حکومت کے دور میں بھی ایک حبس کا سماں پیدا کئے ہوئے تھا۔

ہم ایک نظر اگر حسرت کے لکھے ہوئے ''روس میں نئے نظام کی آمد'' پر ستائشی مضامین کی جانب ڈالیں تو یہ بات کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا کہ وہ خود بھی اس خطّے میں کس قدر اشتراکی اور اشتمالی نظام کے خواہاں تھے تاکہ انسانی فلاح وبہبود اور اقتصادی مساوات کے پیشِ نظر سائنٹیفک طریقے سے ایک نیا نظام قائم کیا جائے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ مولانا کو زندگی کی مصروفیات اور نشیب وفراز نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ اس نئے نظامِ حیات کا مزید گہری نظر سے مطالعہ ومشاہدہ کرسکتے۔

دوسری اہم بات جو سامنے آتی ہے وہ ہے ان کی ''مذہبی آزاد خیالی''
انہوں نے ایک مرتبہ خود بھی کہا تھا کہ: ''میرے اعمال وعقائد کچھ بھی ہوں۔دوسروں کے اعمال اور عقائد کا بھی قائل ہوں۔بشرطیکہ ان میں خلوص اور صداقت ہو''

اور اس کا واضح ثبوت خود ان کے کردار وعمل سے ملتا ہے۔اس لئے کہ مولانا تقریباً ہر سال حج کے لئے جاتے تھے اولیاء واصفیاء کے مزارات سے عقیدت رکھتے تھے۔اور مولانا شاہ عبدالرزاق فرنگی محلیؒ جیسے عالم وزاہد کے مرید تھے یا بیعت رکھتے تھے۔اس کے باوجود حسرت کو کبھی مذہبی مسائل کی تبلیغ کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔اور نہ کبھی مذہب کے بارے میں کسی سے ایسی گفتگو کی کہ اسے تبلیغ سمجھا جاسکے۔انھوں نے کبھی بھی مذہب کو پروپیگنڈہ اور دھنڈورا پیٹنے والی چیز نہیں سمجھا۔قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ جہاں وہ اپنے بزرگانِ دین اور اولیاء حضرات وغیرہ کے مزارات پر حاضری دیتے تھے۔ وہاں ''شری کرشن''، ''متھرا'' اور ''بندرابن'' کی زیارت کو بھی اپنے لئے باعث تسکین دلی سمجھتے تھے۔

مخلوق اک نگاہِ کرم کی امیدوار
مستانہ کررہی ہے بھجن رادھا شیام کا

برِعظیم کی سیاہ آزادی کے اس انقلابی مجاہد کے کارنامے یقیناً ایسی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں کہ اگر انھیں بے پردہ کرکے دنیا کے سامنے لایا جائے تو اس کی عملی جدوجہد' تحریکات اور حقیقت آمیز سیاسی خدمات دنیا بھر کے حرّیت پسند عوام کے لئے نہ صرف سنگِ میل کی حیثیت ثابت ہوگی بلکہ روشن منارہ کے طور پر جلوہ گر ہوگی۔انہوں نے ہندوستان کی سرزمین پر اس وقت علمِ بغاوت بلند کیا اور فرنگی سامراج کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا جبکہ ''بغاوت'' تو ایک طرف لوگ ''آزادی'' کا لفظ منہ سے نکالتے ہوئے خوف سے کانپ جاتے تھے۔چونکہ اس وقت تک ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے اثرات اور اس کے نتائج ہندوستان کی شریف النفس اور مظلوم عوام کے سامنے تھے۔اس کے باوجود حسرت جیسا باغی اور انقلابی سپاہی اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلا اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھا جب تک کہ ہندوستان کی سرزمین سے ''فرنگی سامراج'' کے قدم نہ اکھڑ گئے۔

۱۹۰۶ء میں جب سودیشی تحریک نے جنم لیا اور غیر ملکی اشیاء کے استعمال کا عملی بائیکاٹ کیا گیا تو حسرت ہی ان پہلے چند لوگوں میں سے تھے جنہوں نے مقامی اشیاء کا استعمال حتیٰ کہ کھدر کا کپڑا پہننا شروع کیا اور آخر وقت تک پہنا! جنگِ طرابلس کے دوران جب ہندوستان میں اطالوی مصنوعات کا بائیکاٹ شروع ہوا تو انہوں نے اپنے رسالے کے ذریعے اس پروپیگنڈہ کو عوام تک پہنچانے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی جس کے جرم میں ان کے پریس اور پرچے پر پابندیاں عائد ہوئیں اور جرمانہ کیا گیا جو ادا نہ کرسکنے کی صورت میں بند ہوگیا۔اس کے بعد ''تذکرہ شعراء'' کے نام سے دوسرا پرچہ جاری کیا اور ۱۹۱۶ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت دوسال کے لئے انھیں جیل بھیج دیا گیا جہاں قیدِ تنہائی میں رہے ان کے وکیل تک پر پابندیاں عائد کی گئیں۔اور ان کے ساتھ ایسا غیر شریفانہ برتاؤ کیا گیا جو کہ یورپ

جیسی نام نہاد مہذب قوم کے لئے باعث ندامت ہے۔انہیں قید خانے میں کتاب، قلم دوات، اخبار یہاں تک کہ کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی نہیں دیا جاتا تھا۔انتہا یہیں نہیں ہوئی بلکہ آخری دنوں میں تو انکی ''عینک'' بھی اتروائی گئی تا کہ وہ کچھ لکھ نہ سکیں دوران قید پہننے کے لئے غلیظ اور بدبودار کپڑے دیئے گئے۔ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرتے وقت پیروں میں زنجیر ڈال دی جاتیں اور راستے کی خوراک کے لئے صرف ''ایک آنہ'' دیا جاتا۔ان تمام مصائب کے باوجود حسرت موہانی ایک ناقابل تسخیر سپاہیانہ جذبہ رکھتے تھے جو انتہائی دلیری' خودداری سر بلندی اور جوش وخروش کے جذبے کے ساتھ ہندوستان کی آزادی مساوات اور جمہوریت کا درس دیتے رہے اور آخرکار ۷۵ سال کی عمر میں ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں رحلت فرما گئے۔

ادبی خدمات

جہاں تک حسرت موہانی کی ادبی خدمات کا سوال ہے تاریخ اور ادب میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں یعنی اس وقت جب اردو غزل اپنا کھوتا ہوا وقار دیکھ کر بال بکھرائے کُو بہ کُو پھر رہی تھی اس وقت حسرت کو اس صورت حال کا شدید احساس بھی بے چین کیئے ہوئے تھا۔لہٰذا انہوں نے ایک غزل میں کہا:

باقی نہیں اک تار بھی دامن میں جو حسرت
اب اہلِ جنوں فکر گریباں میں لگے ہیں

اس انداز سے حسرت موہانی نے غزل میں اس وقت نیا بانکپن' جولانی' شگفتگی اور رعنائی پیدا کی جب غزل اُداسی اور سوگواری کے موڑ پر کھڑی کسی نئے آنے والے کی منتظر تھی اور آنے والا پھر اس شان وادا کے ساتھ غزل کے میدان میں نمودار ہوا کہ اس کے ایک ہاتھ میں سیاسی انقلاب اور دوسرے ہاتھ میں شاعری کا شباب تھا۔

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا دے گی
اے حسنِ صبا پرور شوخی بھی شرارت بھی

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حُسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

رنگِ قبا سے مل گئی خوبیٔ جسم نازنیں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

ناقدین کا خیال ہے کہ حسرت کی شاعری پر اساتذہ کا بڑا اثر ہے جو کہ ایک خاص حد تک نمایاں بھی ہے۔اس میں میر و درد، غالب و مومن، جرأت و مصحفی، امیر مینائی اور داغ دہلوی سب ہی شامل ہیں۔اس کے باوجود حسرت کی ''انفرادیت'' اس محفلِ سخن میں اپنا رنگ سب سے الگ تھلگ جمائے ہوئے ہے۔اس کا اظہار بھی حسرت نے اپنی روایتی اور مروجہ بے باکی سے کیا ہے۔

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اُٹھایا ہے ہر اُستاد سے فیض

غزل کی صنف میں زبان وبیان کو بڑی اہمیت حاصل ہے، روزمرّہ محاورہ، رعایت لفظی، صنائع وبدائع اور ضرب الامثال کا خاص طرۂ امتیاز رہے ہیں۔یہیں کہیں سادگی اور سلاست بھی توصیف کے مرحلے میں داخل ہوتی نظر آتی ہے۔لیکن حسرت کے یہاں ان تمام رموز کی موجودگی میں خیال کی نزاکت جب لطافت شعری کو دوآتشہ بناتی ہے تو اس انداز کے اشعار تخلیق ہوتے ہیں:

حسن بے پروا کو خود بین وخود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

دل ہے بیشک نورِ حق سے فیضیاب
آفتاب آمد دلیل آفتاب

خرد کا نام جنوں پڑ گیا' جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

مجھ سے بھی خفا ہو مری آہوں سے بھی برہم
تم بھی ہو عجب چیز کے لڑتے ہو ہَوا سے

یہ خاصہ بھی محض حسرت موہانی کی ہی جولانی طبع کا ہے کہ انھوں نے قید وبند' طوق وسلاسل' سزاوجبر اور انحراف وانقلاب کے درمیان اپنی ذات کی رومان پرور فضا کو کشیدہ دل اور کبیدہ خاطر نہ ہونے دیا۔یہاں تک کہ دوسرے تمام مسائل کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی زندگی میں ہی شہرت ومقبولیت کی بشارت مل گئی۔اور بعض نقادانِ فن یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:

''حسرت نے اپنے تغزل کی فسوں کاری سے اُردو غزل کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔بلکہ وہ اُردو شاعری میں ایک نئے دبستاں کے بانی ہیں۔''

ان کی فنی حیثیت اور مرتبے کو بھی دیکھا جائے اور جائزہ لیا جائے تو حیرت ہوگی کہ ان کے سارے ''محاسنِ سخن''، ''معائبِ سخن'' اور ''نکاتِ سخن'' اپنی حیثیت آپ منوا چکے ہیں۔علاوہ ازیں انہوں نے اساتذۂ قدیم کے دوادین کو بھی ''انتخاب'' کی صورت میں شائع کیا۔تقریباً چالیس سال تک ''اردوئے معلیٰ'' کی اشاعت جاری کیئے رہے۔اُن کی ان خدمات کو بھی اُردو ادب وتنقید اور اس کی تاریخ کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔خود ان کی کلیات کے بارے میں مشہور ہے کہ اس میں تقریباً سات ہزار اشعار سے کم نہیں ہیں۔جن میں خالص

غزل کے ایسے اشعار بھی شامل ہیں ۔

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرحلے
مہر ذرّوں کو کیا ' قطروں کو دریا کر دیا

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ حسن نہیں عشق کو رسوا کرنا

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد
اس قدر بیگانہ عہدِ وفا ہو جایئے

چُپکے چُپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

کیا پھر جذبۂ بے اختیار شوق نے واپس
ابھی ہم کوچہ جاناں سے تھے دو قدم نکلے

نہ ملیں گے دلِ بیتاب کرے لاکھ اصرار
ہم بھی' جا اب تجھے اے عہد شکن بھُول گئے

تو نے حسرتؔ کی عیاں تہذیب رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رُسوائی نہ تھا

یہ ضروری تو نہیں تھا کہ حسرتؔ کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ یہ بیان کیا جائے کہ وہ صوفی منش بھی تھے اور تصوف سے ربط بھی رکھتے تھے۔ لیکن بعض احباب کی دل جوئی کی خاطر درج ذیل اشعار بھی پیش نظر ہیں تا کہ وہ بھی حسرتؔ کی حسرت پرستی سے کہیں منہ نہ موڑ لیں اور اس طرح حسرت کے فلسفۂ تصوف کا اظہار بھی ہو جائے گا۔

مرا ایماں عجب کیا ہے جو ایمان تصوّف ہے
تصوّف جانِ مذہب' عاشقی جانِ تصوّف ہے

گناہ اپنا نہیں ثابت' خطا کے پھر بھی قائل ہیں
اَدب کا ہے یہی شیوہ' یہی شانِ تصوّف ہے

''نغمۂ شب''

مل جانے کی خواہش بھی بچھڑ جانے کی ضد بھی
ہاں اس کی محبت بھی ' عداوت بھی عجب تھی

O

سینے میں دھڑکنے کی تو شے اور کوئی ہے
دل ہوگا تو انسان کو برباد کرے گا

O

میں اس کا درد کسی کو بھی دوں تو کیسے دوں
وہ زخم میں نے بڑی چاہتوں سے پالا ہے

O

مر جاؤں گا نقاشؔ میں تنہائی کے ڈر سے
جس دم وہ میری ذات کو آزاد کرے گا

O

ہوا ہے حکم کہ اب شہر فروشاں میں
جو سر اٹھا کے چلے سر کرو قلم اس کا

O

اسے بھی وحشتِ دل کا نہیں تھا اندازہ
حصار ٹوٹ رہا ہے قدم قدم اس کا

O

صبح تک ایک نئے عزم سے گایا جائے
کوئی نغمۂ شب تاریک میں بیداری کا

O

نہ راہ و رسم نہ اندازِ دلبری لاؤ
مگر تم اپنی جگہ پھر وہی پری لاؤ

O

چیخ کے ٹوٹے نہ دل سوکھی ٹہنیوں کی طرح
جو شاخِ گُل کوئی لاؤ ہری بھری لاؤ

O

حسنِ انتخاب: صغیر بلگرامی (دمام سعودی عرب)

قطرۂ شبنم

فاری شا (اسلام آباد)

نقاش کاظمی ایک حساس اور متحرک ذہن رکھنے والے نوجوان شاعر ہیں اور اپنی نسل کے فعال نمائندے ہیں وہ اس طرح کہ کسی بھی نسل کا نمائندہ شاعر وہی ہوسکتا ہے جو اپنے عہد کی معاشرتی ذمہ داریاں برتنا جان گیا ہو۔ اپنے وجود سے اپنا شعور متعین کرنے کے طریق سے واقف ہو۔

پروفیسر کرار حسین

میں نے ایک شاگرد کے روپ میں انہیں کئی سال بڑے قریب سے دیکھا ہے اور مجھے ان کی ذہانت' ان کی فکر کے انداز اور سلیقہ پر پورا اعتماد ہے۔ یہ سلیقہ زندگی کے ہر شعبے میں توازن کی علامت ہے یہ نقاش کی شخصیت اور ان کے کلام دونوں میں نمایاں ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

''نقاش کاظمی کی شاعری کو سن کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فنکار کی عظمت و بزرگی اس کے سن وسال سے نہیں بلکہ اس کے فکر وفن سے ہے ان کی شاعری میں دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلنے والی بات نہیں۔''

فیض احمد فیض

نقاش کاظمی کا شمار نئی نسل کے ان چند خوش نصیب شعراء میں کیا جا سکتا ہے جن کی شاعری نے تیزی سے ترقی کی راہیں طے کی ہیں اور کم مدت میں اہلِ ادب کو اپنی سمت متوجہ ہونے پر مجبور کیا ہے۔ نقاش کے کلام سے ایک ایسا حساس اور دردمند دل رکھنے والا شاعر ہمارے سامنے آتا ہے جو اپنی ذات کے اظہار کے ساتھ ساتھ سماجی شعور کی جمالیاتی افادیت کا بھی قائل ہے۔

سرور بارہ بنکوی

نقاش کاظمی محبت کی نرم آنچ اور جنوں کی پختگی کا شاعر ہے اس کی شخصیت کی طرح اس کی شاعری میں بھی وقار' معصومیت اور کشش ہے۔ اس عہد کی ان گنت آوازوں کے شور میں نقاش کی آواز بہت صاف' واضح اور منفرد ہے۔ اس آواز میں معنویت کی تہیں آہستہ آہستہ اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ نقاش کے لہجے میں نغمگی کی زور اکیسویں صدی کی تیز رفتار اور پیچیدہ معاشرے کی جدید حسیت اور اپنے کو پالینے کی جدوجہد کا سراغ ملتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

''چاندنی اور سمندر'' کے بعد رخ سیلاب کے خالق جناب نقاش کاظمی ادب کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو دنیا بھر کے زرد چہروں کو سرخ رو دیکھنے کا مشتاق ہے۔ وہ اپنے قبیلے کے ایک ایسے فرد ہیں جو اپنے فنی اور نظریاتی شعور کی توانائی کے بل بوتے پر خوب صورت شاعری کی تخلیق میں مگن ہیں اور جہاں جہاں انسان کی عظمت کو منوانے کی کوئی تحریک موجود ہے وہاں وہاں نقاش کاظمی کے نام اور ان کے کلام کو بہت عزت سے قبول کیا جاتا ہے اور یہ مرتبہ کسی کسی شاعر کے نصیب میں ہوتا ہے۔

قتیل شفائی

نقاش کاظمی ہمارے نوجوان شعرا کی ایک ایسی صف سے تعلق رکھتے ہیں جس نے شاعری ہی نہیں کی بلکہ ادب کے لئے کمال وارفتگی کا مظاہرہ کیا ہے وہ ایک عرصہ سے فکر وسخن کر رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ان کی شاعری میں سوچنے اور غور کرنے کے لیے کافی کچھ ہے اور وہ یہ سب کچھ ایک مشن اور لگن کے ساتھ کر رہے ہیں۔

محسن بھوپالی

نقاش کاظمی ہمارے عہد کی نئی صف کے شعراء میں اہم مقام حاصل کرتے جا رہے ہیں اور اب جبکہ رخ سیلاب سمیت ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور جس کی پذیرائی کے لئے ہم سب اس محفل میں اکٹھے ہوئے ہیں وہ نقاش کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ایک مثبت قدم ہے۔

افتخار عارف

نئی نسل کے جن شعرا نے ترقی پسند روایات کی روشنی میں جدید شعری رجحانات کو سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے ان میں نقاش کاظمی کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ ''چاندنی اور سمندر'' ایک سوچنے محسوس کرنے اور صفحات پر منتقل کر دینے والے ذہن کی پیشکش ہے

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

نقاش کاظمی مقبول شاعر و کمپیئر ہیں۔ مشاعرہ ہو یا کسی قسم کی ادبی تقریب' ان کی موجودگی محفل میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ ان کی افروایشیائی ادیبوں کے مسائل پر ایک پُر مغز کتاب شائع ہو چکی ہے۔ لیکن میرا پسندیدہ نقاش کاظمی شاعر ہے۔ غزل' نظم' ہائیکو سبھی اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔ ''چاندنی اور سمندر'' سے لے کر رخ سیلاب' تک ان کی فکر اور ارتقا کا تسلسل قائم ہے۔ نقاش کاظمی جدید ذہن رکھتے ہوئے بھی گنجلک اور چیستان قسم کے اشعار کی بجائے سیدھے سادھے انداز میں اپنا مافی الضمیر واضح کرتے ہیں۔ اسی لئے تتلیاں سوچ کے پھولوں میں بھرے رس کے لئے رات بھر ذہن کے گلدان پر منڈلاتی ہیں۔

شمشاد احمد

میں نقاش کاظمی سے زیادہ ان کی شاعری سے واقف ہوں۔ یہ واقفیت معاصرانہ نہیں مخلصانہ ہے اور وہ اس لئے کہ میں ابھی تک جن جذبات کے اظہار سے محروم رہا ہوں وہ ان کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔

شمی فاروقی

نقاش کی نظموں میں اس کا رنگ بڑا ابھرپور اور کھلا ہوا ہے ان میں بڑی تیزی اور تندی ہے اس کی نظموں میں معاشی ناہمواری اور طبقاتی کشمکش کے جہاد کی کیفیت اور جنگ کا تاثر پایا جاتا ہے۔

اشرف شاد

نقاش کاظمی نئی نسل کے نمائندہ شاعر ہیں اور موضوعات پر ان کی گرفت خاصی مضبوط ہے وہ نظم و غزل یکساں روانی سے کہتے ہیں نظموں کے رنگا رنگ موضوعات کی طرح ان کی غزلوں میں بھی انفرادی خصوصیات، فنی رچاؤ کے ساتھ نمایاں ہیں رنگ و آہنگ سے لے کر زبان و بیان کے تمام تر تلازموں تک نقاش کاظمی اپنے دور کے نقیب ہیں۔

صہبا لکھنوی

طبقاتی جنگ کا عمل ابتدا سے جاری ہے جس کے بارے میں ہم پڑھتے بھی رہے ہیں اور دیکھتے بھی۔ حوصلہ ہمت اور سرفروشی کا جذبہ شاعروں کے ہی جرات رندانہ کی بدولت پروان چڑھتا رہا ہے ان جذبات کے اظہار کے لئے ایک مخصوص زبان اور منفرد لہجہ بھی چاہیئے جو ادبی تاریخ میں کہیں کہیں نظر آتا ہے لیکن نقاش کاظمی اس عہد میں نئی نسل کی وہ آواز اور لہجہ ہیں جن کا پرچم سربلند ہے۔

حبیب جالب

نقاش کاظمی کو میری طرح آپ نے بھی مستقل طور پر کسی نہ کسی شعری اور ادبی کارگزاری میں مصروف دیکھا ہوگا ان کی سماجی زندگی کی ذمہ داریاں بھی کافی پھیلی ہوئی ہیں مشاعروں میں بھی تواتر کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود ان کے ذہن و دل پر تھکاوٹ کے احساس کا طاری نہ ہونا، بجائے خود ایک اچھی مثال ہے۔ نقاش کی شاعری کا بنیادی موضوع ''انسان دوستی'' ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ حقیقی آزادی کا احساس رکھنے والے انسان کو ایک متوازن اور منصف معاشرے کی تشکیل کی نوید سنانا چاہتے ہیں۔ ان کا دکھ یہ ہے کہ وہ بھی اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں کی طرح اہل انتظار کی طویل قطار میں نظر آتے ہیں۔ انتظار ختم ہوگا یا نہیں۔ یہ کون جانتا ہے لیکن اس انتظار پر احتجاج کا حق ہم سب کو حاصل ہے اور حاصل رہے گا، جسے بیان کرتے ہوئے نقاش نے حرف و لفظ کے پیراہنوں میں اپنے وجود کی ناآسودگیوں کو انتہائی سپردگی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

شاہدہ حسن

یہ معلّمی اور مواصلات کی افسری، نقاش کاظمی کے عزّ و شرف کی وجہ نہیں۔ ان کا اعزاز ان کی شاعری ہے۔ خود ان کا اصرار بھی یہی ہے کہ اسی واسطے سے وہ جانے پہچانے جائیں۔ اسی اعتبار کے لیے انہوں نے کڑی ریاضت کی ہے۔ کم عمر میں انہوں نے جو نام حاصل کیا ہے۔ جانے کتنے شاعر، ادیبوں کی زندگیاں اس آرزو میں صرف ہو جاتی ہیں۔ احمد ہمشی راوی ہیں۔ 1968ء کی بات ہے اردو کالج کے ایک مشاعرے کی صدارت فیض صاحب کر رہے تھے کالج کے روایتی مشاعروں کی ہوٹنگ جاری تھی کہ ایک شاعر کا نام پکارا گیا۔ شاعر نے اسٹیج پر آ کے ایک نظم سنانی شروع کی ؂

سروں کی فصل جو تیار ہے تو کیوں نہ کٹے
بہت ہے عہد جوانی تو کیوں ہو عمر دراز

اس شعر پر مشاعرے کا رخ ہی بدل گیا۔ فیض صاحب نے صدارت کی نشست سے اٹھ کر اس جواں سال شاعر کو سینے سے لگایا۔ یہ چالیس سال پہلے کی بات ہے تب سے اب تک نقاش کاظمی کا شعری سفر شد و مد سے جاری رہا ہے۔ شاعری کے فکری خاندانوں کی تقسیم کی جائے تو کسی شک و شبہ کے بغیر نقاش فیض کے خاندان کا شاعر ہے۔ فیض بھی کمٹ مینٹ کے شاعر تھے، نقاش بھی کمٹ مینٹ کا شاعر ہے۔ کمٹ مینٹ کی شاعری آسان نہیں ہوتی یہ خون مانگتی ہے اور اس میں شاعر کا درجہ شاعر سے بڑھ کے پیغام بر کا ہوتا ہے۔ نقاش کاظمی انقلاب کا آدمی ہے وہ انسان دوستی انصاف اور امن و آشتی کی باتیں کرتا ہے۔ درد کے اتنے شجر، اپنے صحراؤں کی دھوپ کے بعد کون منکر ہوگا۔ کوئی انقلاب ہی بس ہماری کرم خوردہ نسلوں کا مداوا ہو سکتا ہے۔ نقاش بھی اسی خواب کی تعبیر میں سرگرداں ہے۔ تیز و تند نظموں کے علاوہ وہ روایتی قسم کی غزلیں بھی کہتا ہے لیکن اس روایت پیرائی میں اس کے تیور بہت جدا ہیں، اس کے اپنے ہیں۔ اس روایت میں نئے آدمی، نئے عہد کی آگ فروزاں ہے، نقاش کاظمی کا مطلوب و مقصود محض اچھی شاعری نہیں اس سے سوا اس سے بلند ہے۔

شکیل عادل زادہ

ہمارے شاعروں میں کم ہی شاعر ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے نظم اور غزل دونوں اصناف شاعری کو ایک ہی تخلیقی لگن سے برتا ہو۔ جن شاعروں نے نظمیں بڑی اچھی لکھیں وہ غزل کے میدان میں اپنے جھنڈے نہ گاڑ سکے اور جو غزل گوئی میں کمال کو پہنچے وہ اچھی نظمیں لکھنے میں ناکام رہے مگر نقاش کاظمی کی نظموں میں جو بانکپن ہے وہ غزلوں کی صورت میں بھی اپنی انفرادیت اور طرحداری کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

پروفیسر آفاق صدیقی

نقاش کاظمی اردو کے نوجوان شاعروں میں منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ان کا پہلا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے جس میں دو باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں اول یہ کہ وہ نظم کے شاعر ہیں اور اس اعتبار سے دور حاضر کے مسائل اور اس کی آگہی سے جو کیفیات ابھرتی ہیں انہیں اپنی نظموں میں خوبصورتی سے قلم بند کرتے ہیں۔ دوم ان کا لہجہ زبان و بیاں اور تراکیب شعری کا استعمال موزوں اور برمحل ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان میں عہد جدید کی وہ مانوس فضا ملتی ہے جو شعر جدید کو پہچاننے میں ہماری مدد کرتی ہے۔

پروفیسر انجم اعظمی

''احساسِ رنگ وبُو''

حمد

سید مشکور حسین یاد
(لاہور)

تُو بھی ہمارے پاس ہے ہم بھی ترے قرین اے ربّ العالمین
بڑھ کر ہے سب مناظرِ تصویر سے یہ سین اے ربّ العالمین

ہے پالنے میں تیرے دو عالم کا پالنا سب کو سنبھالنا
ہے پرورش تری جو یہ مابینِ صد مبین اے ربّ العالمین

تیرا اشارہ صاحبِ صد استعارہ ہے کُل نظارہ ہے
ہر شے میں تیری شان ہے ہر شے ہے شہ نشیں اے ربّ العالمین

ہے تیرے ذکر میں یہ عجب رونقِ رواں رعنائی جہاں
سالم ہے سال میں تو مہینے میں ہے مہین اے ربّ العالمین

''کب'' کا کہاں کا تو نے دیا ہے ہمیں شعور با کرّ و فر نور
ہم ایسے ہر زمانہ کے ہیں ضامنِ ذہین اے ربّ العالمین

احساسِ رنگ و بو ہے کہ اک سیلِ رنگ و بو در ذیلِ رنگ و بو
ہم بہہ رہے بحرِ بہاراں میں بہترین اے ربّ العالمین

ہم یاد ہیں زمانہ کو تیری ثنا کے ساتھ ذوقِ انا کے ساتھ
اپنا چلن متین ہے اپنا سخن متین اے ربّ العالمین

○

حمد

خورشید انور رضوی
(اسلام آباد)

مرے مالک کوئی تجھ سا نہیں ہے
بجز تیرے کوئی داتا نہیں ہے

ہر اک شے پر ہے تُو قادر توانا
نہ دے گر تُو تو کچھ ملتا نہیں ہے

عیاں بھی تُو نہاں بھی تُو ہے مالک
تُو ایسا بھید ہے کھلتا نہیں ہے

تُو سب کو دیکھتا ہے جانتا ہے
کسی نے بھی تجھے دیکھا نہیں ہے

حدِ ادراک میں آئے کہاں تُو
نشانِ جسم و تن تیرا نہیں ہے

○

نعت

امین راحت چغتائی
(راولپنڈی)

آئے ہیں جب سے آپؐ کے حلقۂ التفات میں
ایک سکوں سا آ گیا دل کے تغیرات میں

بیٹھے رہے ہیں رات بھر بزمِ تصوّرات میں
جلوہ حضورؐ کا رہا، آئینۂ حیات میں

شافعؐ روزِ حشر کے قدموں میں آ گئے ہیں ہم
اس سے بڑا بھی آسرا ہے کوئی کائنات میں

ذکرِ حبیبِؐ دوجہاں اپنا اثر دکھا گیا
جان سی پڑ گئی ہے اب کا رگہِ حیات میں

آپؐ کی ذات پاک ہی آئی ابھر کے سامنے
خیر کی رو ہے جب چلی عالمِ ممکنات میں

خُلقِ عظیم بھی حضورؐ حسنِ کریم بھی حضورؐ
ایسا کوئی دکھائے تو تذکرۂ صفات میں

آپؐ کی اِک نگاہ سے مل گئی دولتِ یقیں
اِس سے بڑا شرف ہے کیا حیطۂ کائنات میں

○

نعتِ نبیﷺ

سجاد مرزا
(گوجرانوالہ)

دونوں عالم میں ترے نام کے چرچے آقاؐ!
دشمنِ دیں بھی بہ حیرت تجھے دیکھے آقاؐ

روح سیراب ہوئی، دل کو تسلی حاصل
ہم نے دیکھے ہیں مدینے میں وہ جلوے آقاؐ

جس نے احکامِ خداوندی کو مانا ہی نہیں
کر دیا اس کو فراموش خدا نے آقاؐ

چھوڑ کر آپؐ کے بتلائے ہوئے رستے کو
بن گئے غیروں کے ہم لوگ نشانے آقاؐ

جانے کیوں رحم نہیں فطرتِ انساں میں رہا
ہم نے ہر دور میں سورنج اٹھائے آقاؐ

منتظر ہے ترے الطاف و کرم کا سجّاد
اپنے دربار میں پھر اس کو بلالے آقاؐ

○

زندگی دھوپ ہے۔۔۔

سلطانہ مہر (یوکے)

اسے اپنے گھر کے ماحول سے نفرت ہو گئی تھی۔ ہر وقت کی تُو تُو میں میں سے اب تو اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اماں کو جس کسی لمحے فرصت ملتی وہ اپنی گول گول آنکھیں گھما کر انوری کو ڈھونڈتیں۔ انوری اگر چاول چنتی، جھاڑو دیتی یا گھر کا کوئی کام کرتی نظر آتی تو وہ سکون کا سانس لے کر کھٹ کھٹ سروتہ چلانے لگتیں۔ پان کا بیڑا بنا کر دانتوں تلے دباتیں اور اڑوس پڑوس کی جوان لڑکیوں کے قصے چھیڑ دیتیں۔

اور جو کبھی انوری اپنی کنگھی چوٹی میں لگی ہوتی یا اپنی کتابیں الٹ پلٹ کرتی ملتی تو اماں اسے کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیتیں۔ آج بھی کچھ ایسی ہی بات تھی۔

پانچ دن بعد آج اسے بال بنانے کا موقع ملا تھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہن کر وہ آئینے کے سامنے کھڑی بال سلجھا رہی تھی۔ اماں نے چائے کی پیالی رکھ کر پان دان اپنے آگے کھسکایا۔ سروتہ اٹھایا اور چھالیہ کاٹنے سے پہلے دیدے گھما کر ادھر اُدھر دیکھا۔ سروری رات کے کھانے کے لیے دال پکا رہی تھی۔۔۔۔اور۔۔۔۔انوری۔۔۔۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی بال سلجھا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ گنگنا بھی رہی تھی۔

محبت میں ایسے قدم ڈگمگائے
زمانہ یہ سمجھا کہ ہم پی کے آئے
ہم۔۔۔۔ پی کے آئے

''اے جنم جلی۔۔۔۔ کنگھی چوٹی کے سوا بھی تجھے کوئی کام آتا ہے''۔ وہ یک بیک چنگھاڑیں۔ سروری نے ماں کو گالیاں دیتے سنا تو دانتوں تلے ہونٹ داب کر مسکراتی ہوئی بولی۔

''اماں انوری کہہ رہی تھی کہ اس کی صورت مدھو بالا سے ملتی ہے۔''

''ہاں ہاں جرور ملتی ہوگی۔ اس کے تو دیدے پھٹ گئے ہیں۔ چل تو اپنا کام کر نصیب ماری۔'' انہوں نے سروتہ پٹخا اور کھٹ سے پان دان بند کر دیا۔ یہ غصے کی رفتار بڑھنے کا اظہار تھا۔ انوری سمجھ گئی۔ پیش بندی کے طور پر وہ جھلا کر پلٹی اور چیخ کر بولی۔

''یہ سروری کمینی جھوٹ بولتی ہے۔ میں نے کب کہا تھا کہ میں مدھو بالا سے ملتی ہوں۔ وہ تو پڑوس والی زبیدہ رسالہ لائی تھی جس میں مدھو بالا کا فوٹو تھا۔ اور وہ سروری کو دکھا دکھا کر کہہ رہی تھی کہ۔۔۔۔''

اماں نے بات کاٹ کر پھٹکارا۔

''چپ رہ کم بخت۔۔۔۔ جیادہ بولنے کی جرورت نہیں ہے۔ یہ کپڑے اٹھا۔۔۔۔نل آ رہا ہے۔ جا کر دھو جلدی سے۔''

''میں نہیں دھوتی ابھی۔۔۔۔'' انوری نے منہ بنایا اور ٹھنک کر بولی۔

''ابھی تو میں نہائی ہوں۔ پھر گندے چھینٹے پڑیں گے۔''

''اے چل۔۔۔۔ بڑی آئی صفائی والی۔'' اماں نے ہاتھ نچائے۔

''کون تیرا خصم آ کر دھوئے گا کیا؟''

وار کاری تھا۔ انوری تلملا کر رہ گئی۔ اس کے سینے میں اماں کے خلاف نفرت کا لاوا سا ابلا۔ اس نے دانت کچکچائے لیکن بولی کچھ نہیں۔ سوکھی لکڑی کی طرح اکڑ کر جس جگہ کھڑی تھی کھڑی رہی۔ اس سرکشی کا علاج بھی اماں کے پاس تھا۔ انہوں نے رامائن شروع کر دی۔

''ان لچھنوں پر کون تھوکنے آئے گا۔ رانڈ سے اپنی جوانی سنبھالی نہیں جاتی۔ شکل دیکھو تو چمارنوں جیسی۔ گوری چمڑی پر اتراتی ہے۔ اونہہ۔۔۔۔ جب باپ مر رہا تھا تب کہتی نا اسے۔۔۔۔ کہ ایک باندی چھوڑ جا میرے لئے۔ پھر کپڑے نہیں دھونا پڑتے۔ فقیر کی چھوکری رانیوں کے خواب دیکھتی ہے۔ ارے کوئی نوکرانی ہی بنا کر لے جائے تجھے تو شکر کرنا۔ ہاں۔۔۔۔ یہی حال رہا تو دوسرے ہی دن گٹھڑی بغل میں داب کر واپس آئے گی۔''

اماں بولتی رہیں اور ان کا ایک ایک لفظ بھالے کی طرح انوری کے دل پر لگتا رہا۔ اسے پتہ تھا کہ اب اماں کی زبان کو اس وقت تک لگام نہیں لگ سکتی جب تک کہ وہ۔۔۔۔ چنانچہ فوراً ہی میلے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا کر وہ نل پر چلی گئی۔ کپڑوں پر صابن ملتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

کیا سب مائیں ایسی ہی ہوتیں ہیں۔ ہائے۔ کبھی پیار کے دو بول نہیں دیئے۔ اس عورت نے۔ اور دیئے تو صرف کوسنے طعنے اور گالیاں۔۔۔ گالیاں اور وہ بھی گندی اور ننگی۔ نفرت اور بیزاری کی لکیریں اس کے ماتھے پر ابھر آئیں۔ ایسے لمحوں میں وہ اللہ میاں سے شکایت کرنے بیٹھ جاتی جس نے اسے ایسے غریب اور چھوٹے گھرانے میں پیدا کیا۔ آخر دنیا میں اور لوگ بھی تو ہیں۔ کیسے عیش کرتے ہیں۔ اور کیسی سکھ بھری زندگی گزارتے ہیں۔ اور یہ فلم والیاں۔۔۔۔ اللہ میاں نے ان کو کونسی نیکی کے عوض اتنا سب کچھ دے رکھا ہے۔ اور ایک وہ ہے کہ بچپن سے ہی غربت کی چکی میں پس رہی ہے۔ غریب آباد کالونی میں رہنے والے ایک غریب گھر میں اس کو اللہ میاں نے کیوں پیدا کیا۔ اور پھر ابا کو بھی بیمار کر کے اللہ میاں نے اتنی جلدی اپنے پاس بلا لیا کہ ان کے بعد اماں کا چڑچڑاپن تو اس کی جان کو آ گیا ہے۔ وہ ماں کی محبت کے دو بولوں کو بھی ترس گئی ہے۔ سوکھی روکھی کھانا۔ دوسروں کے گھروں میں کام کاج کرنا اور ان کی اترن پہننا ہی اس کا مقدر بن گیا ہے۔ کیا اللہ میاں نے اس کی تقدیر اپنے ہاتھ سے لکھی ہے؟ کیا یہ کبھی نہیں بدلے گی؟ ایسے بہت سے سوالات کیڑوں کی طرح اس کے ذہن میں کلبلاتے مگر اس کے جواب اسے کون دیتا۔ خود وہ چار جماعتوں سے آگے نہیں پڑھ سکی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو ترستی۔ کبھی اماں سے

سرخی پاؤڈر مانگتی تو وہ اسے بے بھاؤ کی سناتیں۔

''ہوں تیرا باپ کوئی جائداد چھوڑ گیا ہے کیا؟ جا خصم کر لے۔۔۔۔ وہ دے گا تجھے فیشن کی چیزیں۔''

''خصم۔۔خصم۔۔خصم۔۔کیا ہوتا ہے یہ موا خصم۔۔! جانے اماں کیوں ہر وقت اس کے طعنے دیتی ہیں؟'' پھر وہ آپ ہی آپ مسکرا دی۔ خیال کی رو بھٹکتے بھٹکاتے ایک ہیولا سا بنا گئی۔ ''کبھی تو آ ہی جائے گا وہ سہرا باندھ کر باجے گاجے کے ساتھ۔ ابھی پچھلے دنوں ہی زبیدہ کی شادی ہوئی تھی۔ شادی کے دو دن بعد وہ کیسی مسکراتی آئی تھی۔۔۔۔ انگ انگ سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ایک ایک بوٹی ناچتی دکھائی دے رہی تھی اس کی۔ ہا۔ اپنے گھر کا راج ہوتا ہی ہے ایسا۔۔اے خدا۔۔کب بنے گا میرا گھر؟ اس کے دل میں ہوک سے اٹھی۔ اپنے چھوٹے سے گھر کے تصور نے جیسے اسے نئی حرارت بخش دی۔ ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ کپڑوں کو پانی میں کھنگال کر وہ انہیں نچوڑنے کے لئے بل دینے لگی۔ جلدی کے مارے اماں کے ململ کے کرتے کے ساتھ ساتھ اس نے سروری کا دوپٹہ بھی لپیٹ لیا۔ اب صرف تین کپڑے رہ گئے تھے۔ اس نے انہیں بھی اکٹھے بل دے کر نچوڑنا چاہا تو ہاتھ سے پھسل کر زمین پر گر پڑے۔ قریب ہی برتن مانجھنے والی راکھ کا ایک چھوٹا سا ڈھیر پڑا تھا۔ تینوں کپڑے اس میں لتھڑ گئے۔

''ہائے اللہ۔ موت آ جائے مجھے۔ اچھے بھلے کپڑوں کا ناس ہو گیا۔ اب دھوؤں پھر سے انہیں۔''

اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور ہونٹ لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اسی وقت اس کی پڑوسن عائشہ بھی اپنے کپڑے لے کر آ گئی۔ انوری کو سہارا مل گیا۔ اس نے کپڑوں سے مٹی صاف کی اور دوبارہ صابن ملنے لگی۔

''میں نے اپنے میکے میں تو کبھی ایک کپڑا بھی نہیں دھویا۔'' عائشہ ترنگ میں آ کر بولی۔

انوری جل ہی تو گئی۔ اس نے جلنے بھننے لہجے میں اس سے کہا۔

''تو اب کیوں دھوتی ہو آسوبی۔ دھوبی کے دے دو نا۔ ہاتھ سخت ہو جائیں گے تمہارے۔''

عائشہ رازدرانہ طریقے سے مسکرا کر بولی۔

''تیرے بھائی کے ہیں نا۔۔۔۔'' پھر وہ آپ ہی آپ شرما گئی۔ چہرہ تمتما گیا۔ جیسے شہد کے چھتے پر بیٹھی ہوئی بھڑ نے کاٹ کھایا ہو۔ جھکی جھکی پلکیں اوپر اٹھا کر وہ بولی۔

''انوری۔۔۔۔ دل چاہتا ہے۔ ان کے کپڑے خود دھو کر انہیں پہناؤں۔ چھوٹے کپڑے خود دھوتی ہوں اور بڑے دھوبی کے دے دیتی ہوں۔'' پھر وہ بنیان نچوڑتے ہوئے ذرا کے ذرا رک کر بولی۔

''ان کے کپڑے دھونے سے ہاتھوں کی سختی نرمی میں بدل جاتی ہے۔'' انوری کا دل ایک بار تو بڑی زور سے دھڑکا۔۔کھٹ کھٹ۔۔کھٹ کھٹ۔۔ یہ کھٹ کھٹ کہیں آسونہ سن لے۔'' اس نے چور نظروں سے عائشہ کی طرف دیکھا۔ وہ بنیان سے پانی جھٹک کر اسے ڈور پر پھیلانے جا رہی تھی۔ اور تب اپنے کپڑے نچوڑتے ہوئے جانے کہاں سے ہوا کے دوش پر اڑا ہوا ایک بنیان آیا اور اس کی ساری تلخ سوچوں پر پردہ ڈال گیا۔ کپڑے سکھا کر اس نے جھاڑو دی۔ کھانا کھایا اور پھر چپ چاپ اپنی رضائی بچھا کر لیٹ گئی۔ آج اس کی سوچ کے دھارے دوسرا رخ اختیار کر گئے تھے۔ اب زندگی ایک انتظار کے سہارے کٹ رہی تھی۔ ایک ان دیکھے ''خصم'' کے انتظار میں۔

''کبھی تو کوئی سہرا باندھ کر آئے گا اور اسے اپنے چھوٹے سے گھر میں لے جائے گا۔ جہاں یہ طعنوں اور کوسنوں کی دھوپ نہ ہوگی۔ جہاں پیار کی ٹھنڈی چھاؤں تلے وہ گھر کا سارا دھندا کرے گی۔ اور کبھی نہ تھکے گی۔ اب اسے اماں کے کوسنے اور گالیاں اتنی شدت سے بری نہ لگتیں۔ ایک انجانے اور ان دیکھے خاکے میں رنگ بھرتے ہوئے وہ ان تلخیوں کو مختلف رنگوں میں گھولتی رہی۔

انہی دنوں ایک تپتی ہوئی دوپہر میں جب پسینے کے مارے چھوٹی سی کوٹھری میں اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ باہر نکل آئی۔ برآمدے میں زینے سے قریب زبیدہ دیوار سے لگی بیٹھی مٹی کا چولہا پوت رہی تھی۔ اس کے پاس انوری کو ایک اجنبی شکل نظر آئی۔ اسے دیکھ کر زبیدہ چولہے پر مٹی والے ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک دم سے بڑھ جانے والی گرمی کا رونا رونے لگی۔ انوری کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو اس اجنبی شخصیت کے بارے میں جاننا چاہتی تھی جس کا تعارف زبیدہ نے ابھی تک نہیں کرایا تھا۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر اس نے زبیدہ کو ٹھوکا دیا۔ زبیدہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس نے آنکھوں کے اشارے سے پوچھا۔ زبیدہ سمجھ گئی۔ مسکرا کر بولی۔

''ارے یہ زینب ہے۔۔۔۔ نئے کرایہ دار آئے ہیں نا نیچے والی منزل میں۔''

''کب۔۔۔۔؟'' انوری نے پوچھا۔

''تین دن ہوئے۔۔۔۔'' زینب نے براہِ راست اسے جواب دیا پھر زبیدہ نے بتایا کہ نیچے والی منزل پر دوسری ''کھولی'' انہوں نے کرائے پر لی ہے۔

''اکیلی رہیں گی کیا۔۔۔۔؟'' انوری کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

''نہیں تو۔۔۔۔ میری ماں بھی ہیں میرے ساتھ۔۔۔۔'' اب زینب نے خود مسکرا کر جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں انوری کی زینب سے پکی دوستی ہو گئی۔ زینب نے اسے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی تو انوری بولی۔

''ابھی نہیں اماں سو رہی ہے۔ اُٹھ جائے گی تو جوتے مار مار کر کھال

اُتار دے گی۔شام کو آؤں گی'' زینب تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر چلی گئی۔جب اماں جا گیں تو انوری نے نچلی منزل پر آنے والے نئے کرایہ دار کی خبر کو سنائی۔

''میں نیچے جاؤں اماں۔۔۔؟'' وہ خوشامدانہ لہجے میں بولی۔

''چل چپکی بیٹھ۔جانے کون لوگ ہیں۔ملنا ہوگا تو خود ہی آئیں گی۔ تجھے کیا جرورت ہے۔'' اماں نے پھٹکارا اور انوری دل مار کر بیٹھ رہی۔دوسرے دن زینب خود ہی آ گئی۔اماں بڑی اچھی طرح سے اس سے ملیں۔تھوڑی دیر کی باتوں میں اس نے اماں کا دل رجھالیا۔اماں بھی اسے اپنی خاندانی شرافت اور نجابت کے قصے سنا سنا کر خوش ہوتی رہیں۔اور جب زینب نے انوری اور سروری کو اپنے گھر لے جانے کی خواہش ظاہر کی تو اماں نے زمانے کی اونچ نیچ بتاتے ہوئے اسے سمجھایا کہ ہمارے ہاں کنواری لڑکیوں کو اس طرح بے لگام نہیں چھوڑا جاتا۔لڑکیوں کے دیدے پھٹ جاتے ہیں۔شرم وحیا جاتی رہتی ہے۔کنواری بالیاں تو سات پردوں میں ہی بھلی لگتی ہیں۔پھر لیپا پوتی کرتے ہوئے بولیں۔

''دیکھ بیٹی زینب۔تو بھی میری انوری' سروری کی طرح ہے جب تیرا جی چاہے آ بیٹھ یہ تیرا ہی گھر ہے۔''

زنب کی سمجھ میں بات آئی ہو یا نہ آئی ہو۔پر وہ اماں کی ہر بات کے جواب میں اثبات میں سر ہلاتی رہی اور اماں نے آناً فاناً زینب کو ''اچھی اور شریف لڑکی'' کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔

اب زینب ہر روز اوپر کا ایک پھیرا ضرور کر جاتی۔کبھی کبھی زینب کی ماں بھی رات کے کھانے کے بعد اوپر چلی آتی۔کیونکہ دن بھر تو وہ دو جانوں کی گزر بسر کے لیے محلے کے بچوں کو قرآن شریف پڑھانے چلی جاتی۔اس طرح چند ہی دنوں میں دونوں گھرانوں میں یک جہتی بڑھ گئی۔اور پھر جب سے اسے زینب کی دکھ بھری کہانی معلوم ہوئی کہ کس طرح اس کے شوہر نے اس پر ظلم وستم ڈھایا تھا اور جب اسے روپے کمانے کا ذریعہ بنانا چاہا تب اس کی اماں نے اس ظالم آدمی سے نجات دلانے کے لیے زینب کو طلاق دلوادی۔بس اسی روز سے زینب کے لئے اس کے دل میں محبت اور ہمدردی کے جذبے میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا تھا۔

اور پھر یہ بہناپا کچھ اس طرح بڑھا کہ اسے اب زینب کے بغیر ایک لمحے کو بھی قرار نہ آتا۔زینب نے بھی اس کی دل داری کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔رفاقت کیا ہوتی ہے' محبت کسے کہتے ہیں اور محبوب کے معنی کیا ہیں۔یہ اسے معلوم ہو چکا تھا۔زینب نے اس کے دل میں گھر کر کے اسے انجانے دیسوں کی سیر کرادی تھی۔اس کے سپنوں کا ہیولا اپنا روپ بدل کر اب زینب کا روپ اختیار کر گیا تھا۔

زینب جب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ کسی اڑن کھٹولے پر سوار ہو کر ایک ان دیکھی دنیا کے رنگ و بو میں کھوئی جا رہی ہے۔

زینب کے اصرار اور خوشامد کے زیر اثر اماں کبھی کبھار اسے اجازت دے دیتیں تو وہ بھی زینب کے گھر کا ایک آدھ پھیرا لگا آتی۔وہاں تنہائی میں دنیا بھر کے قصے دہرانے اور روائتی طریقے سے دوستی کے عہد و پیمان کی تجدید میں آسانی ہوتی۔زینب کے گھر وہ ریڈیو پر گانے سنتی۔خود زینب بہت اچھا گاتی تھی اور اس کی فرمائش پر اسے سناتی بھی۔خاص طور پر یہ غزل انوری کو بہت پسند تھی۔

تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا زندگی دھوپ' تم گھنا سایہ

وہ زینب کے کندھے پر سر رکھے آنکھیں موندے ان بولوں سے بہت ٹھنڈک محسوس کرتی۔زینب اسے اپنے سینے سے بھینچ کر اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیتی۔تب اسے محسوس ہوتا جیسے تپتے صحرا سے بھاگتے بھاگتے محبت کی گھنی چھاؤں تلے آ گئی ہو۔

اماں کی گالیوں اور کوسنوں میں اب بھی کمی نہیں آئی تھی لیکن ان تلخیوں کی تلافی زینب کے اچھے سلوک کے ذریعے ہو جایا کرتی۔زینب اماں کے سامنے ہمیشہ ان کی ہاں میں ہاں ملایا کرتی۔انوری کو یہ بات بری لگتی تو تنہائی میں زینب اسے سمجھاتی۔

''انو تو سمجھتی کیوں نہیں۔میں نے اگر اماں کی ہاں میں ہاں نہ ملائی تو میں ان کی آنکھوں میں کانٹا بن کے کھٹکنے لگوں گی اور پھر تم ہم اتنی آسانی سے نہیں مل سکیں گے۔''

''انو''۔۔۔اس لفظ ''انو'' کو سن کر اسے اپنے وجود میں بڑی ٹھنڈک محسوس ہوتی۔کتنا پیار تھا اس ایک لفظ میں۔۔۔۔!اس سے پہلے کبھی کسی نے اسے طرح کاہے کو پکارا ہوگا۔گھر میں تھا بھی کون۔وہ منحوس سروری تو ہر وقت اس کی لگائی بجھائی میں لگی رہتی تھی۔۔۔۔اور اماں۔۔۔۔؟ انہوں نے سروری کی زبان سے جملہ پورا سنا نہیں کہ فوراً انوری کے لتے لینے شروع کر دیئے۔ہائے کبھی جو اماں نے بھولے سے اسے اپنی چھاتی سے لگایا ہو۔

''زینب۔۔۔۔تو شادی کیوں نہیں کر لیتی؟'' جانے کس جذبے کے تحت ایک روز یونہی بیٹھے بیٹھے اس نے یہ سوال زینب سے پوچھ ہی لیا۔

''ہوں۔۔۔۔شادی۔۔۔۔؟'' بے پناہ نفرت کے کئی ڈوبتے ابھرتے رنگ زینب کے چہرے پر اس کی سانولی رنگت چیر کر ابھر آئے۔

''مجھے جانوروں سے نفرت ہے۔سمجھیں انوری بیگم۔۔۔۔'' وہ پھنکاری۔

انوری کو اس وقت اس کی شکل بڑی ہی بھیانک لگی۔وہ اٹھنا ہی چاہ رہی تھی کہ انوری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

''اچھا ایک بات تو بتا۔۔۔۔!''

آن واحد میں زینب لاوے سے موم بن گئی۔

''مجھے شادی سے نفرت ہے۔اس لئے آئندہ میری شادی کا ذکر نہ کرنا۔'' پھر وہ مسکرائی اور جواب کا انتظار کئے بغیر بولی۔

''اور ہاں تو بھی سن لے انو۔'' وہ لمحے بھر کو رکی۔

انوری سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں تجھے بھی شادی نہیں کرنے دوں گی۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ہمارے ہاں لڑکیوں کو بٹھا رکھنے کا رواج نہیں ہے۔'' انوری منہ پھیر کر دھیرے سے بولی۔ لہجے سے بیزاری صاف ظاہر تھی۔

''تو اب تک کیوں نہیں کر دی تیری اماں نے شادی۔''

''نہیں کر دی تو اب کر دیں گی۔ ایک رشتہ آیا ہوا ہے۔ اچھے رشتے بھی تو مشکل سے ملتے ہیں۔''

''تو۔ تو شادی کرے گی؟'' زینب یک بیک جھنجھلا گئی۔ پھر اس نے انوری کی منت سماجت کرنا چاہی۔ اسے گدگدایا لیکن اس نے تڑپ کر ہاتھ چھڑا لیا۔

''ہٹ! مت تنگ کر زینب مجھے۔۔۔۔'' ایک خشک ندی کی ساری ویرانیاں اس کی آنکھوں میں سمٹ آئیں۔

''جہنم میں جا۔''

زینب نے بھی منہ پھیر لیا اور انوری من من بھر کے قدم لئے اوپر اپنے گھر آ گئی۔

پھر اماں نے انوری کا رشتہ طے کر دیا۔

پانچ سو روپے پر بات طے ہوئی تھی۔ یوں تو دستور کے مطابق نوٹوں کی گڈی لڑکی کے در سے لڑکے کو سلامی کے نام پر دی جاتی ہے۔ لیکن یہاں معاملہ الٹا تھا۔ سلامی لڑکے کی طرف سے دی جانی تھی۔

لڑکی کنواری تھی اور لڑکا۔۔۔؟ اس کے لئے دور پار کے محلوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ لڑکے غریب نے نباہ کی بہت کوشش کی لیکن کم بخت عورت حرافہ نکلی۔ کسی سے آشنائی تھی۔ سو اس کے کارن طلاق لینے سے بھی نہ چوکی۔

اماں سو سو طرح اس کی سسرال والوں کے گن گاتیں کہ چلو لڑکے کے ساتھ ایک بدنصیبی لگ گئی مگر خاندان تو اچھا ہے۔ پھر یہ کیا کم ہے کہ انہوں نے ان کی مفلسی کے کوڑھ پر پانچ سو نوٹوں کے مرہم کی ایک دبیز تہہ رکھ دی تھی۔ اور اگر اب انوری کا بیاہ ہو جائے تو پھر سروری بھی ٹھکانے لگے۔

نہ تو شہنائیاں بجیں نہ باجے تاشے آئے۔ انوری کے سارے رنگیں خوابوں کے تانے بانے بکھر گئے۔ پھر بھی یہ خیال دل کو سکون دے گیا کہ اس ''جہنم'' سے چھٹکارا مل جائے گا۔ روز روز کی دانتا کل کل سے تو نجات ہو گی۔ اور پھر دہکتے انگاروں پر پیار کے چھینٹے دینے والا شوہر۔۔۔۔

شہنائیاں نہ ہوتے ہوئے بھی آپ ہی آپ اس کے من میں جانے کہاں سے شہنائیاں گونج اٹھیں۔

زینب اس کی شادی میں شریک ہوئی ضرور۔ لیکن تھوتھنی پھلائے ہوئے۔

وہ بار بار موقعے موقعے سے سناتی رہی کہ وہ تو اس کی اماں کا منہ دیکھ کر شادی میں شریک ہو گئی ہے۔

انوری نے بھی اپنے حسابوں اسے جوتی کی نوک پر اڑا دیا۔

''ہونہہ۔ جانے کلوٹی خود کو کیا سمجھتی ہے۔ آئی بڑی وہاں سے۔''

اس نے سروری کو چپکے چپکے پٹی پڑھائی کہ اس کے بیاہ کے بعد اسے زینب سے میل جول بڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اماں نے کچھ روپے دے کر محلے سے ڈومنی کو بلوا لیا تھا۔ اور کچھ نہیں تو ڈھولک کا دھوم دھڑکا ہی سہی۔

رخصتی کے وقت ڈومنی نے اپنی بے سری آواز میں بابل چھیڑا اور لڑکیوں نے لے ملائی تو اس کے قدم ڈگمگا گئے۔ میکے کی محبت ایک دم امڈی۔

''کیا ہوا جو اماں اسے منہ بھر بھر کو سنے اور گالیاں دیتی ہے۔ ہے تو آخر اس کی ماں ہی۔ پھر آنسو روکے نہ رکے تو وہ کھل کے روئی اور سسکیوں کے درمیان رخصت ہو کر آ گئی۔

تخت پر دلہن بنی بیٹھی ہوئی انوری نے گھونگھٹ کی اوٹ سے جھانکا۔ اسے ایک دوسری انوری میاں کے لئے صفائی کرتے' کھانا پکاتے اور اس کے کپڑے دھوتی ہوئی نظر آئی۔ بنیان نچوڑ کر الگنی پر سکھاتے ہوئے اس نے مسکرا کر دلہن بنی ہوئی انوری کو دیکھا اور پھر ہاتھ پونچھ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر سنگار کرنے لگی۔

اب میں ان کا انتظار کروں گی۔ ''وہ آنے والے ہیں۔'' وہ اٹھلا کر دلہن بنی انوری کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور دھیرے دھیرے اس کے وجود میں سمٹتی چلی گئی۔

رات دھیمے قدموں سے دبے پاؤں گزرتی جا رہی تھی۔ جانے وہ کب تک گٹھڑی بنی تخت پر اوندھی پڑی رہتی کہ اذان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ آنکھیں مل کر دیکھا تو کمرے میں پڑی ہوئی چارپائی پر کوئی سو رہا تھا۔ وہ کھنکاری تو چارپائی سے چرچوں کی آواز آئی۔ سونے والے نے کروٹ بدلی تھی۔ چند منٹ کے سکوت کے بعد وہ اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ انوری نے اپنا گھونگھٹ نیچے سرکا لیا اور اپنے آپ کو سمیٹنے لگی۔ اسے انتظار تھا کہ اب کوئی ہاتھ بڑھے گا اور جھپٹ کر اس کا گھونگھٹ الٹ دے گا۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ گھڑی دو گھڑی۔۔۔ پانچ منٹ۔۔۔ دس منٹ۔۔۔ لیکن کچھ بھی تو نہ ہوا۔

اس سکوتِ مرگ میں زندگی پیدا کرنے کے لئے کوئی بھاری آواز میں بولا۔

''لو یہ گلاس۔۔۔۔ پانی پی لو۔۔۔۔ حلق سوکھ گیا ہو گا۔'' وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہی آواز پھر آئی۔

''یہ گلاب جامنیں رکھی ہیں۔ ایک آدھ ہی کھا لو۔ گلا تر ہو جائے گا۔'' لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔۔۔۔ گٹھڑی بنے رہنے سے اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔

''ہائے کوئی دروازہ ہی کھول دے کہ ہوا کا ایک جھونکا تو آئے۔ اسے الجھن ہونے لگی۔شاید یہی گھڑی تھی قبولیت کی جو باہر کسی نے کھٹکا کیا اور چند لمحوں بعد اس کا مرد دھیرے سے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ اس نے گھونگھٹ تھوڑا سا سرکا کر کن اکھیوں سے دیکھا۔اس کا خیال درست تھا اب کمرے میں وہ تنہا تھی۔اس طرح جیسے رات کے ابتدائی حصے میں تھی۔آنے والا جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے چلا بھی گیا۔صورت دیکھنے کا ارمان بھی دل میں ہی رہ گیا۔پھر کھٹ پٹ کی آواز سے وہ چونکی۔

''شاید وہ پھر آئے ہیں''۔اس نے خود سے کہا۔

''لو دلہن ناشتہ کرلو۔'' مامتا بھری بوڑھی آواز نے اسے مخاطب کیا تھا۔وہ پہچان گئی یہ ''وہ'' نہ تھے بلکہ اس کی ساس کی آواز تھی۔وہ اسی کے پاس تخت پر بیٹھ گئی اور اپنی بوڑھی ہڈیوں کی لاچاری کا رونا روتے ہوئے اسے کھانے پر مجبور کرتی رہی۔

گھونگھٹ تو ساس کے ہاتھوں کھل ہی چکا تھا۔وہ پراٹھا اور حلوے کے نوالے زہر مار کرتی رہی۔

بھور بھئی۔پھر دن بیتا۔اور جب شام کی سرمئی چادر چاروں اور تن گئی تو اس کی امنگوں کے بجھے چراغ پھر سے جل اٹھے۔

''شاید کل ان کی طبیعت ٹھیک نہ ہو۔جانے دن بھر کہاں رہے وہ۔ کون بتائے گا اسے۔۔۔؟'' دلہناپے کے بوجھ تلے سمٹی سمٹی سکڑی سکڑی وہ ہاتھ بٹانے کے بہانے کمرے کے برابر والی کوٹھری میں جسے باورچی خانہ کہا جاتا تھا جا پہنچی۔شاید کوئی سن گن مل جائے۔اس کی ساس روٹیاں بیل رہی تھی۔اسے دیکھتے ہی حیرت سے بولی۔

''اری دلہن۔تو کاہے کو آ گئی یہاں۔بس دو روٹیاں تو رہ گئی ہیں۔ تو چل اندر میں ابھی تیرا کھانا لاتی ہوں۔'' وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے مسکرا دی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

''کتنے دن دلہناپا کروں گی۔میرا اپنا ہی تو گھر ہے یہ۔۔۔آخر سارا دھندا مجھے ہی تو سنبھالنا ہے۔'' پھر اس نے ساس کے ہاتھ سے بیلن لیتے ہوئے کہا۔

''لاؤ اماں۔۔۔یہ دو روٹیاں میں ڈال دوں۔'' ساس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

''اری نہیں نہیں۔تو اندر چل۔میں کھانا لا رہی ہوں۔چل۔''

''میں تو یہیں کھاؤں گی اماں تمہارے ساتھ۔'' وہ پاس پڑی ہوئی چوکی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئی۔

''اچھا یہیں کھالے'' ساس نے رکابی میں روٹیاں ڈالیں۔مونگ کی بھنی ہوئی دال کٹوری میں نکالی اور ساتھ ہی آم کا اچار بھی دیا۔

''میں تو بس آدھی روٹی کھاؤں گی اماں۔'' اس نے آدھی روٹی توڑ کر اپنی رکابی میں رکھ لی اور باقی ڈلیا میں رکھ دی۔

''اے لڑکی۔۔۔۔ایک روٹی تو کھالے پوری۔۔۔۔زیادہ موٹی بھی تو نہیں ہے۔اے ہم جب تمہاری عمر کے تھے تو اتی موٹی چار پانچ روٹیاں کھا لیتے تھے۔اور پھر جب سمیع کے ابا سے شادی ہوئی تو۔۔۔۔''

''اماں وہ کہاں گئے۔۔۔۔'' موقع غنیمت جان کر بڑی ہمت اور جرات سے کام لیتے ہوئے اس نے بڑی بی کا جملہ اچک کر پوچھ ہی لیا۔

''کون ۔۔۔ وہ ۔۔۔سمیع؟ اے دوستوں میں ہی ہوگا۔'' انہوں نے لاپرواہی سے کہا اور چولہے سے توا اتار کر کوئلوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ان پر پانی کے چھینٹے دینے لگیں۔انوری کی نظریں بڑی بی کی صورت پر ٹکی ہوئی تھیں۔پلڑا اور بیلن پرے رکھتے ہوئے بڑی بی رازدارانہ انداز میں ہاتھ ہلا کر دھیمے لہجے میں بڑی اپنائیت سے بولیں۔

''دلہن اب تو تم اس گھر میں آ گئی ہو تو خود دیکھ بھی لوگی۔۔۔۔ دشمن ہیں دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کے۔''

انوری منہ سے کچھ نہ بولی۔آنکھوں سے پوچھتی رہی۔بڑی بی نے اس کی رکابی پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''اری تو نے آدھی روٹی ہی لی آخر۔۔۔۔اور لے۔۔۔۔یہ دال کی پتیلی بھری رکھی ہے۔کھا پیٹ بھر کے۔اور ہاں اس کا کھانا اپنے کمرے میں لے جائیو۔وہیں کھلا دینا۔'' پھر انوری کے کان کے قریب منہ لے جا کر بولیں۔

''سگے باپ بیٹے ہیں دونوں۔لیکن باوا سٹھیا گئے ہیں۔ہزار بار کہا۔بیٹا جوان ہو گیا۔اب تو اپنا چلن بدلو۔لیکن بڑے میاں کسی کی بات سن کر نہیں دیتے۔پھر سمیع بھی ڈرے ہے باپ سے۔بڑا فرماں بردار چھوکرا ہے۔نجرا اٹھا کر نہیں دیکھتا کسی کو۔''

''وہ کام کیا کرتے ہیں اماں۔'' انوری نے پوچھا۔

''میں کیا جانوں دلہن۔کسی پھیکٹری کا نام بتایا تو تھا'' روٹی ختم ہو گئی تو انوری نے رکابی سرکا دی۔

بڑی بی نے اتنی دیر میں سمیع کا کھانا سینی میں نکال کر رکھ لیا تھا۔ انوری اٹھی تو اس نے سینی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

کھانا لے کر انوری اپنے کوٹھری میں آ گئی۔اندر طاق پر دیا ٹمٹما رہا تھا۔اس نے دیئے کی لو اونچی کر دی۔

کمرے کے آگے چھوٹے برآمدے میں اس کا سسر اپنی گدڑی بچھائے بیٹھا تھا۔ادھ جلی بیڑی کو بجھا کر اس نے گدڑی کے نیچے محفوظ کر لیا اور کھنکار کر بولا۔

''کھانا لا دے سمیع کی ماں۔'' انوری اپنی کوٹھری سے برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ اور سرگوشیاں سنتے سنتے آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔

پھر ایسی کئی راتیں آنکھیں موندے گزر گئیں۔اور جب بھی رات

کے کسی حصے میں آنکھ کھل جاتی تو دوسری چارپائی سے آنے والے خراٹوں کے زیروبم میں وہ اپنی قسمت کی لکیریں ڈھونڈا کرتی۔ جب سے وہ بیاہ کر آئی تھی پلٹ کر ایک بار بھی میکے نہیں گئی تھی۔ کرنا بھی کیا تھا وہاں جا کر۔ اماں نے سروری سے کہلوایا بھی لیکن ان دنوں تو وہ اپنی جان سے بھی بیزار تھی۔

اور آج۔ شادی کے پورے ایک ہفتے بعد۔۔۔۔ یہ رات جانے ایسی قیامت بن کر کیوں آئی تھی۔ آج تو نیند بھی کوسوں دور تھی۔ جیسے وہ جنم جنم سے سو کر اٹھی ہو۔ پھر کبھی نہ سونے کے لئے۔ آج سرِ شام ہی اس نے نہا دھو کر نیا جوڑا پہنا تھا۔ سلائی بھر بھر کر آنکھوں میں کاجل بھی لگایا اور ہونٹوں پر سرخی بھی۔ یہ اکلوتی سرخی کی لکڑی بَری میں اس کے لئے آئی تھی۔ بار بار آئینہ اٹھا کر وہ اپنا رنگ روپ دیکھتی۔

''صورت تو دس بیس سے اچھی ہی ہے۔۔۔ پھر وہ۔۔۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کہیں کسی اور سے تو دل نہیں لگا ہوا۔ ایسا ہی ہوگا۔ ورنہ کوئی چوبیس گھنٹے کی نوکری تو نہیں کہ یوں چوری چھپے رات کے اندھیرے میں گھر آیا جائے۔ کچھ بھی ہو آج اس کا فیصلہ ہو کر رہے گا۔'' ہر آہٹ پر وہ چونک چونک پڑتی۔ برآمدے میں بوڑھے ساس سسر اپنے اپنے بستروں میں جانے کب کے دبک چکے تھے۔ تب چپکے سے ہولے سے دروازہ کھلا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم۔۔۔ تم۔۔۔ ابھی تک جاگ رہی ہو؟'' بھاری بھرکم آواز آئی۔ جواب دینے کی بجائے وہ منہ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔

کیا کہوں۔۔۔؟ کیا پوچھوں۔۔۔؟ جس شخص کو اب تک نظر بھر کر دیکھا تک نہ ہو۔ اس سے کس طرح بولوں۔۔۔! دل تھا کہ دھک دھک کر رہا تھا اور انجانے خوف و ہراس کا ایک سیلاب تھا کہ امڈا آ رہا تھا۔ لڑکھڑاتے پیروں پر اپنے وجود کا بوجھ سنبھالنا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ دھم سے تخت پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا۔۔۔؟'' وہ کیا جواب دیتی۔ چپکی ہو رہی تھی لیکن کوئی چیز تھی جو اچھل اچھل کر حلق سے باہر آ رہی تھی۔ بڑی کوششوں سے حواس مجتمع کر کے وہ مری ہوئی آواز میں بولی۔

''کھانا گرم کرلاؤں۔''

''رہنے دو۔۔ مجھے بھوک نہیں ہے آج۔''

سمیع کپڑے بدل کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ جوں کی توں تخت پر بیٹھی رہی۔ اپنی بے بسی پر اس کا دم گھٹنے لگا۔

''اللہ میاں۔۔۔۔ سارے اختیار مردوں کو سونپے تھے تو عورت کو پیدا ہی نہ کرتا۔ آج پہلی بار اسے اپنے عورت ہونے پر گھن سی آئی۔

''کاش وہ کتیا ہوتی۔۔ بلی ہوتی۔۔ عورت نہ ہوتی۔'' جانے کب بھل بھل کرتے اس کے آنسو بہنے لگے۔ سسکی کی آواز سن کر سمیع اٹھ بیٹھا۔ ادھ جلی سگریٹ کو ایڑی سے مسل کر وہ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے پاس تخت پر آ کر بیٹھ گیا۔

''رو رہی ہو۔۔'' وہ دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے بولا۔

جواب میں اس کی سسکیاں اور تیز ہوگئیں۔

''رومت۔۔ میری بات سنو۔۔ میں خود بھی مجبور ہوں۔ کیا کروں۔۔ تم سمجھو گی بھی نہیں۔۔''

ایک چھوٹی سی بات کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ لیکن مطلب پھر بھی ادا نہ ہوا۔ تب اس نے اٹھ کر صراحی پر الٹا ہوا گلاس اٹھایا۔ صراحی لوٹ کر گلاس بھرا اور غٹ غٹ ایک ہی سانس میں پی گیا۔

''کیا صبر آزما ہوتا ہے یہ وقت بھی۔ پل صراط پر چلنا پھر اس سے آسان ہوگا۔'' تھکے تھکے قدم اٹھا کر وہ تخت پر آ کر بیٹھ گیا۔

''تم نے جانے کیا کیا سوچا ہوگا۔ جب دلہن بنی ہوگی تو۔۔۔ لیکن میں کیا کرتا۔ اماں نہیں مانتیں۔ وہ تمہیں بیاہ کر لائی ہیں۔ انہیں بہو چاہیے تھی نا۔۔۔ خدمت کرنے کے لیے۔۔۔ سو تمہیں لے آئیں۔۔۔ روپیہ پیدا کرنے والی مشین میں ہوں۔۔۔ لیکن میں۔۔۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ یہ میرے ماں باپ تو ضرور ہیں کیونکہ انہوں نے مجھے پیدا کیا ہے۔ ماں نے اپنی کوکھ سے جنم دیا۔ اس لئے میں ان کی اولاد ہوں۔ لیکن۔۔ لیکن اس وقت بھی جب میں دس سال کا تھا اور اس وقت جب بظاہر اٹھارہ سال کا نوجوان تھا لیکن ایک سہمے ہوئے ننھے بچے کی طرح۔۔ پھر ایک بار بابا نے ایک معمولی سی بات پر بری طرح پیٹا۔۔۔ آنکھوں میں مرچیں ڈالیں۔ تنگ آ کر میں نے مرنے کی ٹھانی۔۔ زہر کھا لیا تھا میں نے مگر بدنصیب تھا نا۔۔۔ اس لئے بچ گیا اور جب شادی ہوئی تو۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔ مجھ کو معاف کر دو۔ میں بہت مجبور ہوں۔'' وہ منہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اس نے سمیع کے ہاتھ پکڑ لئے۔ وہ برف کی طرح سرد تھے۔ اس نے انوری کو اپنی مجبوری بتا دی۔ انوری نے ساری رات انگاروں کی سیج پر کاٹی۔

''اب کہاں جائے وہ۔۔ اماں کے پاس۔۔؟'' لیکن اس جہنم میں لوٹ کر جانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ دو وقت کی روٹی ہی کھانا ہے تو پھر یہیں بھلی۔

پھر اس نے سمیع کی نرسنگ شروع کر دی لیکن کب تک۔۔

اب کے جب سروری اسے بلانے آئی تو وہ بلا ارادہ چلی گئی۔ اماں کا بھی کیا قصور۔۔۔ انہیں کون معلوم تھا کہ لڑکے کی پہلی بیوی نے طلاق کیوں لی۔ ان سے جو کہانی کہی گئی تھی وہ جھوٹی تھی۔

وہ جب میکے آئی تو زینے پر چڑھتے ہوئے زینب سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ کترا کر نکل جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر انوری نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''زینب۔۔ آج انو کہہ کر ایک بار پھر پکار لے۔'' وہ بلک کر بولی۔

زینب اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ تب انوری نے سروری کو دھکیلا۔

''تو اوپر جا۔۔۔ اماں سے کہیو میں ابھی آتی ہوں۔''

بھوگ

احمد زین الدین (کراچی)

بات اتنی پیچیدہ تھی کہ رامو کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔
پھر بھی اس کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ چھمی' گیتا، گوری
......چھمی' گیتا، گوری......وہ اُلجھ کر رہ گیا۔
اس نے سر کو جھٹکا اور ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ لگتا تو نہیں تھا کہ اس وقت وہ نشے میں ہے لیکن جس طرح وہ بیان کر رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے ضرور بھنگ چڑھا رکھی ہے۔ دھیرج اپنے طور پر ساری باتیں پوری تفصیل سے بتا رہا تھا لیکن راموکو سب کچھ بے ترتیب سا لگا، اُلجھا اُلجھا سا۔
رامو جانتا تھا کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ اسے ایکدم گیتا کا واقعہ یاد آیا جسے اس نے کھڑی دوپہر میں اَرہر کے گھنے کھیت میں دبوچ لیا تھا اور بڑی کھینچا تانی اور نوچ کھسوٹ کے باوجود نہ جانے کس طرح اس نے اسے رام کر ہی لیا تھا۔ وہ پہلے سے اس کے من میں کھب گئی تھی۔ مگر وہ تو پرائی تھی اور اس وقت وہ جس کی بات کر رہا تھا وہ تو......
دھیرج نظریں نیچی کیے بولے جا رہا تھا۔
''اس دن میں نے خوب گانجا چڑھا رکھا تھا۔ آندھی، بارش اور ٹھنڈی ہوا نے مجھے گہری نیند سلا دیا تھا۔ بجلی کی ایک زوردار کڑک سے جب میری آنکھ کھلی تو میں نے کروٹ بدلی اور میرا ہاتھ اس کے جسم پر پڑا۔ یہ گیتا جو ہے نا رامو، ابھی ابھی کسے ہوئے بدن کی لڑکیوں جیسی ہے حالانکہ وہ ایک نوجوان بیٹی اور بیٹے کی ماں ہے۔ مجھے وہ پہلے ہی اچھی لگتی تھی اور شاید میں بھی اسے...... اس کا شوہر سانپ کے کاٹے سے ہلاک ہو گیا تھا سو میں نے اسے رکھ لیا، اسے بے سہارا نہ چھوڑا۔ تجھے تو پتہ ہے نا رامو......''
''ہاں، مجھے پتہ ہے۔ تو اب آرام کر دھیرج۔ پھر بات کریں گے۔''
''نہیں رامو، پھر نہیں۔ تو ابھی سن لے میری بات، میرا دل ہلکا ہو جائے گا، نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔''
''اچھا اچھا، سنا اپنی رام کہانی۔''
''میں اس کے بنا کوئی رات گزار نہیں پاتا تھا رامو جس سے وہ اکثر ناراض ہو جاتی تھی اور بیٹے کو لے کر دوسرے کمرے میں سونے لگی تھی۔ وہ بیٹے کو بہت چاہتی تھی......''
''اور بیٹی کو؟'' رامو نے پوچھا۔
دھیرج نے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا: ''اِدھر بہت دنوں سے وہ مجھ سے دور رہنے لگی تھی مگر وہ ہر دم میرے من میں رہتی تھی۔ مجھے لگا آج اس موسم نے اسے میرے پاس آنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں نے نیند ہی میں کروٹ بدلی اور اسے اپنے سینے میں بھر لیا۔ وہ ذرا سا کسمسائی بھی نہیں۔ بنا کچھ بولے پڑی رہی۔ میں اور بھی اُتاؤلا ہو گیا۔ لگاتار بارش سے ٹین کی چھت زور زور سے بج رہی تھی اور قریب کی آواز بھی مشکل سے سنائی دے رہی تھی۔ کئی مہینوں سے من بہت اشانت تھا۔ پھر کچھ نہ پوچھو کیا ہوا، جب درد سے اس کی کراہ نکلی تو میں ذرا دیر کے لیے ٹھٹکا، یہ چھمی تو نہیں ہو سکتی میں نے سوچا۔ یہ گیتا بھی نہیں ہو سکتی، لیکن نہیں، ہاں اور اس ہاں نہیں کے درمیان میں اپنے اندر کے طوفان سے لڑتا رہا اور جب طوفان تھما تو میں سو گیا۔''
''دھیرج، تو یہ سب مجھے کیوں بتا رہا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ چھمی تیری بیوی سے اور گیتا کو تو نے رکھ لیا ہے۔ اس میں رونے دھونے کی کتاب ہے۔''
''رامو تو سمجھتا کیوں نہیں۔ میں نے گھور پاپ کیا ہے رامو، مہا پاپ۔''
''دھیراج تو نے کچھ نہیں کیا، کوئی پاپ نہیں کیا۔'' رامو نے اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔
''رامو، اس رات چھمی اتنی گہری نیند کیوں سوئی......اور گیتا بھی بے ہوشی کی نیند سوتی رہی اور اپنے بیٹے کے ساتھ اور گوری......گوری کو نیند کیوں نہیں آئی......''
رامو پھر الجھ گیا......چھمی، گیتا اور گوری......چھمی، گیتا اور گوری......
''میں صبح بہت دیر سے سو کر اٹھا۔'' دھیرج نے پھر کہنا شروع کیا، ''چھمی اور گیتا باہر گئی ہوئی تھیں، گاؤں والوں کی مدد کرنے۔ آندھی نے بڑی تباہی مچائی تھی، کئی گھروں کی دیواریں گر گئی تھیں، یہ مجھے گوری نے بتایا۔ میں نے اسے پاس بلا کر بیٹھنے کے لیے کہا لیکن وہ جھینپتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ پھر میں نے دیکھا وہ دروازے کی آڑ سے مجھے شرما شرما کر دیکھ رہی تھی۔ ٹھنڈے موسم میں بھی مجھے پسینے آ رہے تھے......''
''وہ کیوں شرما رہی تھی؟ اس نے پہلی بار تو تجھے نہیں دیکھا تھا۔''
رامو بولا۔
''رامو تو کیسا دوست ہے میرے دل کی بات سمجھتا کیوں نہیں۔''
معاً رامو کو احساس ہوا کہ بڑی دیر ہو چکی ہے۔ دن ڈھل چکا تھا۔
وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔
''رامو یار، تو کسی کو کچھ نہ بتانا۔ میں نے تجھے اپنا یار سمجھ کر سب کچھ بتا دیا۔ تجھے تو میرے اتیت اور برتمان کی پوری جانکاری ہے۔ میں تجھ سے بنتی کرتا ہوں، تیرے پاؤں چھوتا ہوں۔ مجھ سے انجانے میں بڑی بھول ہو گئی ہے۔'' دھیرج دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بولتا رہا۔

راموں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بُری طرح الجھا ہوا تھا۔ چھمی، گیتا اور گوری...... چھمی، گیتا اور گوری۔ اپنے گھر تک کا راستہ اس نے من من بھر پاؤں کے ساتھ طے کیا تھا۔

دھیرج تھوڑی دیر کے لیے گھر سے نکلا، پھر واپس آ گیا۔

چھمی نے بھوجن پروستے ہوئے اس کے چہرے کو دیکھا۔

''کیا بات ہے اتنا چپ چپ کیوں ہے؟''

''نہیں، کوئی بات نہیں۔''

''گیتا نہیں گئی تیرے پاس کیا؟'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔''

''میں تجھے خوب جانتی ہوں۔ میں تیرے پاؤں دبانے آ جاؤں؟''

''نہیں۔''

''گیتا کو بھیج دوں؟''

''نہیں۔ میں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔''

وہ کھانے سے اٹھ گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے لالٹین کی لَو ذرا بڑھا دی۔ رات بڑی ڈراؤنی اور بھیدوں بھری تھی۔ بارش کی ہلکی ہلکی جھڑی اب بھی لگی ہوئی تھی۔ راموسے باتیں کر کے اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا سا ہو گیا تھا لیکن ایک چبھن سی پھر بھی اس کے دل میں تھی۔ پتہ نہیں وہ اپنی باتیں کہہ پایا بھی یا نہیں۔ پتہ نہیں راموا س کی بات سمجھ پایا یا نہیں۔ اس نے لالٹین کو لَو دھیمی کی اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

کچی پکی نیند میں کئی جسم اس کے ہم بستر ہوئے۔ وہ کروٹیں بدلتا رہا، کوئی لطف اندوزی نہیں تھی، بے چینی ہی بے چینی تھی۔ کبھی راموسامنے آ جاتا، ہمدردی اور پیار سے اس کے کندھے کو تھپتھپاتا ہوا، سمجھنے اور نہ سمجھنے کے درمیان سر ہلاتا ہوا۔

آندھی کی جھکڑ اور بارش کے قطروں سے ٹین کی چھت پر بجنے والی آواز نے اسے گہری نیند سلا دیا اور کھیس نہ اوڑھنے کے باوجود اس کا جسم گرم رہا تھا۔ وہ نیند ہی میں چونکا اپنے جسم سے چپکے ہوئے جسم کو الگ کرنے کی ہلکی سی کوشش کی، پھر خود ہی ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ اسے کسے ہوئے بدن پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتا رہا اور پھر آندھی، بارش، جھکڑ، آوازیں سب اس کے ذہن سے معدوم ہو گئے۔

آندھی اور بارش کا موسم گزر گیا۔ گاؤں والے اپنی تباہیوں کو رو چکے تھے اور دوبارہ قدم جمانے کے لیے زمین ہموار کرنے میں لگے ہوئے تھے کہ ایک دن گیتا اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

''آ جا گیتا، آ بیٹھ میرے پاس۔''

''میں تیرے پاس بیٹھنے نہیں آئی۔ اب نہ میں آؤں گی نہ کوئی اور آئے گا۔''

''کیا کہہ رہی ہے گیتا...... آ جا بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

''اب کچھ نہیں رکھا دھیرج باتوں میں۔ تو دنیا کا سب سے گھٹیا اور کمینہ آدمی ہے۔ تیرے پاس کچھ نہیں ہے کہنے کو۔''

''تو کیا کہہ رہی ہے گیتا......'' اس کی آواز گلے میں پھنسنے لگی۔

''تو اب دنیا کو بھوگ۔ میں نے اسے دھتورے کا کچلا کھلا دیا ہے اور خود بھی کھا لیا ہے۔''

''کیا...... کیا......؟''

''ہاں، سب کچھ ختم ہو گیا۔ میرے لیے بھی، اس کے لیے بھی اور شاید تیرے لئے بھی۔''

''چل اسپتال چل...... تم دونوں......'' دھیرج نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ گیتا ڈگمگائی، دیوار کا سہارا لینے کو ہاتھ بڑھایا لیکن سنبھل نہ پائی اور گر گئی۔

دھیرج نے چھمی کو آواز دی، گوری اور بیٹے کو آواز دی، باہر نکل کر راموا ور گاؤں والوں کو پکارا۔

جب وہ قصبے کے اسپتال پہنچے تو گیتا اور گوری کو ڈاکٹر نے مردہ قرار دے دیا۔ اور یہ بھی کہ گیتا ہی نہیں گوری بھی پیٹ سے تھی۔

راموکے ذہن میں اب کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔

''ہوئے خواب سب سراب''

جہانگیر اشرف مزاحمتی شاعری کرتے ہیں۔ لگی لپٹی کے ساتھ بات کرنا ان کا انداز نہیں۔ اپنا مافی الضمیر کھل کر بیان کرتے ہیں ان کی جو بات سب سے زیادہ پسندیدہ ہے وہ سچ اور برملا سچ ہے۔ جہانگیر اشرف سچ لکھتا اور سچ بولتا ہے۔ جہانگیر اشرف کیلئے ایک فارسی شعر

تازہ خواہی داشتن گرداغ ہائے سینہ را

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

محمود ہاشمی

(برمنگھم، برطانیہ)

گھر بدر

فریدہ حفیظ (اسلام آباد)

ہاسٹل کا پچھواڑا کسی مصور کی بنائی ہوئی خوبصورت پینٹنگ کی طرح کھڑکی میں سجا ہوا نظر آتا ہے۔ میں جب لیکچر سے فارغ ہوتا ہوں اور لائبریری جانے کو جی نہیں چاہتا تو اپنے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہو جاتا ہوں۔ کھڑکی کے باہر کا خوبصورت نظارا مجھے گزری زندگی کی بہت سی باتیں یاد دلاتا ہے۔ آج کچھ الگ سی بات تھی۔ خاموش تصویر میں جان سی پڑی لگتی تھی۔ درختوں کی ہلتی شاخوں کے ساتھ بچوں کی آوازوں سے لگتا تھا کہ وہ اپنے کھیل میں گم ہیں۔ بے فکری اور آزادی کا یہ دور ایک خوبصورت خواب کی طرح یادوں کا حصہ بن جاتا ہے۔ میں ان یادوں میں گم ہو جاتا ہوں۔

ہم بھی یونہی کھیلا کرتے تھے۔ بہن بھائی دوست سب ملکر۔ لڑائیاں ہوتیں تو لڑکوں کے کھیل کے سامان اور لڑکیوں کی گڑیوں کی شامت آجاتی۔ گڑیوں جیسی پیاری بہنیں اور ان کی سہیلیاں اپنی گڑیوں کے ٹوٹے ہاتھ پاؤں اور لڑکے اپنے گیند بلے غلیلوں اور وکٹوں کی تلاش میں سب بھول جاتے۔ ہم ایک ہی طرح کے کھیل بار بار کھیلتے کبھی نہ تھکتے تھے۔ یہ جانے بغیر کہ زندگی بھی بار بار کھیلے ہوئے کھیل کھیلتی ہے۔

ہم اکٹھے سکول جاتے اور واپس آتے۔ دریا پار کرنے کے لئے دریا کے دونوں کناروں کو جوڑنے والی ٹرالی مضبوط آہنی رَسے پر پھسلتی جاتی۔ جب بچے ٹرالی میں ہوتے تو ٹرالی والا خیال کرتا کہ کوئی بڑا اس میں نہ بیٹھے۔ دریا کے پاس اتر کر ہم بھاگتے ہوئے چڑھائی چڑھتے اور سڑک کے پار سکول کے گیٹ میں داخل ہو جاتے۔

ٹرالی میں آتے جاتے جگہ کم پڑنے لگی تو ٹرالی والا کہنے لگا اب تم لوگ بڑے ہو گئے ہو زیادہ جگہ گھیرتے ہو۔ اس لئے اب پہلی بار میں لڑکیاں اور دوسری بار میں لڑکے جایا کریں گے۔ اس پر خوب ہنگامہ ہوا۔ نہیں ٹرالی بابا ہم سب اکٹھے جائیں گے۔ سکڑ سکڑ کر بیٹھیں گے۔ مگر ٹرالی بابا نہ مانا۔ چلو ٹرالی میں الگ الگ جائیں گے بعد میں تو اکٹھے ہوں گے۔

یہ تو ہمارا اکٹھ ٹوٹنے کا آغاز تھا۔ جب لڑکیوں نے اپنی اپنی گڑیاں سنبھال کر رکھنی شروع کر دیں اور ان کے کپڑے خود سینے لگیں۔ لڑکوں سے شرمانے لگیں۔ تو ہمیں اپنی آوازیں حلق میں اٹکتی محسوس ہونے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دریا پار لے جانے والی ٹرالی پر بچوں کا ایک اور ٹولہ آنے جانے لگا۔

کھڑکی کے باہر کھیلتے بچوں کی اضطراری اور خوشی میں ڈوبی ہوئی آوازیں اب دور سے آرہی تھیں بہت دور سے...... پھر دور ہوتی چلی گئیں۔ اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

یوں دونوں بازوؤں کے تکیے پر سر ٹکائے میں خیالوں کی وادیوں میں جاگتی آنکھوں سے گذرے زمانے کی شاداب گھاٹیوں، سرسبز میدانوں، گل رنگ وادیوں اور کوہستانی جنگلوں میں گھومتے گھومتے جب حقیقتوں کی دنیا میں لوٹ آتا تو کتنا وقت گذر چکا ہوتا ہے۔

بڑے بھائی ہمارے ساتھ بچپن میں کھیلی ایک ہمجولی سے نکاح کے بندھن میں بندھ چکے ہیں۔ میرے ساتھ کے تقریباً سبھی ساتھی تعلیم کی منزلوں سے گذر کر عملی زندگی میں قدم رکھ چکے ہیں یا رکھنے والے ہیں۔

کھڑکی کے باہر کا منظر بدل رہا ہے۔ پتوں سے عاری درختوں کی شاخیں آسمان کی طرف رخ کئے شاید کوئی دعا مانگ رہی ہیں۔ کچھ زرد پتے ابھی تک شاخوں سے لٹک رہے ہیں۔ ایک اونچے درخت کی بے برگ شاخوں میں ایک گھونسلا ابھی تک قائم ہے۔ اور برہنہ شاخوں پر کوؤں کا راج ہے۔ اس علاقے میں کوّے بہت ہیں۔ شام ہونے سے پہلے جدھر سورج ڈوب رہا ہوتا اُدھر سے قطاروں میں کوّے آ کر بے برگ درختوں کی شاخوں پر یوں ٹِک جاتے ہیں جیسے درختوں پر کوّے اُگے ہوں۔ یہ پت جھڑ کا موسم کب آ گیا پتہ ہی نہ چلا۔ موسم تو آتے ہی جانے کے لیے ہیں۔ مگر عجیب معاملہ ہے۔ نئے موسم آنے کا وقت بھی گذر گیا۔ یہ کیسی پت جھڑ کی رت ہے بیت ہی نہیں چکتی۔ اب خلاؤں میں دیکھتا ہوں تو چناروں میں آگ لگی نظر آتی ہے۔ اور سدا بہار جنگلوں میں دھوئیں کے بادل اٹھتے ہیں اور پوری وادی کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ دور دھوئیں کے بادلوں میں سے انسانوں کے قافلے ادھر کی طرف رواں ہیں۔ کتنا مختلف اور انجانا منظر ہے۔ خیموں کی قطاریں، قطاروں کے درمیان گلیوں میں حیران گم سم سہمے ہوئے معصوم چہرے۔ میرے بچپن کے ساتھیوں جیسے ماؤں کے پہلوؤں سے لگے اور ان کے پیچھے چلتے ہوئے لمبی لمبی قطاروں میں ہاتھ پھیلائے ہوئے۔ مجھے لگا میں بھی ان کے ساتھ ہوں۔ مگر میں تو ان کے ساتھ نہیں ہوں۔ میں جنگلوں اور زمرد کے کانوں کے مالکوں کے قبیلے سے ہوں۔ پھر مجھے اپنا بھائی یاد آیا جس کے نکاح کے بعد ابھی رخصتی ہوئی۔ میرا مطلب ہے میری بھابھی کی رخصتی ہونا باقی ہے۔ جو چند برس پہلے ہمارے ساتھ کھیل میں شامل رہتی تھی اور ہمارے صحن میں رسّی کودا کرتی تھی۔ اور ہم اکٹھے ٹرالی میں دریا پار جاتے تھے۔

ٹرالی اب دریا پار نہیں جاتی۔ آر پار سے آنے والی بندوقوں کی گولیاں ٹرالی کو دریا پار کرنے نہیں دیتیں۔ اگر دریا پار کر بھی لیں تو اس میں سوار بچے اتر کر کہاں جائیں گے کہ ان کے سکول ملبے کا ڈھیر ہیں۔ اور ڈھیر میں سے ادھ جلی کتابوں کا دھواں اٹھتا ہے۔ اور سانس کے ساتھ جسم میں داخل ہو کر آنکھوں سے آنسو بن کر بہتا ہے۔ اور روز روز کے دھماکوں سے زندگی سانس روکے پناہ ڈھونڈتی ہے۔ اسے اپنی پناہ میں رکھنے کے لیے میرا بھائی دھرتی کا محافظ موت کے تعاقب میں اس غار تک جا پہنچا تھا جس کے دھانے پر چائے خانہ تھا۔ دھانے کی سیڑھیوں سے موت کا راج شروع ہوتا تھا۔ بس ایسی کسی موت کی بستیوں میں زندگی کا سودا کرنے والے سوداگروں کی تلاش میں ان اندھیری راہوں کی بھول بھلیوں میں وہ کہیں کھو گیا۔ اس روز لگا ہوسٹل کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے زور کا دھماکہ ہوا ہے۔ خزاں زدہ درخت پر واحد گھونسلہ نیچے گر پڑا تھا۔

سوگواری اور دکھ کی ان گھڑیوں میں ہمارے گھرانے کو ایک اور سرخاب کا پر لگا تھا۔ شہید کا گھرانہ۔ عورتیں، ماں سے سہاگن ہونے سے پہلے ہی بیوہ ہونے والی بہو کا ذکر دکھ سے کرتیں۔ تو ماں انہیں ٹوک دیتی۔ شہید کی بیوی نہیں سہاگن ہے اور شہید کبھی نہیں مرتا میرا بیٹا زندہ ہے۔

دھوئیں کے بادل چھٹنے شروع ہوئے تو پھوٹتی کونپلوں نے رت بدلنے کی خبر دی۔ کھڑکی کے باہر کا منظر بدل رہا تھا۔ خیمے اٹھے جا رہے تھے۔ بچے گھریلو سامان کی چھوٹی موٹی گٹھڑیاں اٹھائے ان لڑکوں کی جانب رواں نظر آتے جو انہیں ان کے چھٹے ہوئے گھروں کی جانب لے جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ جب ٹرک ایک قطار میں روانہ ہوتے ہیں تو میں ان سے پہلے ہی وادی کی گلیوں میں پہنچ جاتا ہوں جہاں زندگی اپنی ڈگر پر واپس آنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ مجھے بھابھی کا خیال اکثر آتا۔ اب وہ میری بھابھی نہیں رہی تھی۔ میری ماں ابھی تک اسے اپنی بہو کہتی ہے۔ میں نے ایک دوبار فون کیا۔ مگر اس کے احساسات کا اندازہ نہ ہو سکا۔ اس نے پہلے کی طرح ہی میرے ساتھ باتیں کیں چھوٹا دیور سمجھ کر۔ باتوں باتوں میں اس سے میں نے مستقبل کے بارے میں دریافت کیا اور یہ جان کر دھچکا لگا کہ وہ بھی میری ماں کی ہم خیال تھی۔ مجھے اس میں شین خالہ کی جھلک نظر آئی۔ شین خالہ نے میٹرک کر لیا تو بچپن کے منگیتر سے جوان پڑھ تھا شادی سے انکار کر دیا تھا۔ ہم سب شین خالہ کا قصہ بڑے شوق سے سنا کرتے تھے۔ شین خالہ چھٹیوں میں شہر سے آیا کرتیں تو ان کی گاڑی کے پیچھے پیچھے جمرود خان بھی جیپ میں بندوق اٹھاتے نظر آتے۔ دونوں کے بالوں میں چاندی چمکنے لگی تھی۔ مگر کس میں ہمت تھی کہ وہ شین خالہ کا ہاتھ تھامتا۔

مگر گل رُخے کا معاملہ الگ ہے۔ میں تو اپنی ریت روایت کے مطابق اس کا ہاتھ تھامنا چاہتا ہوں مگر اس کے احساسات میں جس تبدیلی کی میں توقع کر رہا ہوں میں وہ مفقود ہے شاید وہ لحاظ کے مارے ایسا کر رہی ہو۔ اور میری ماں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچانے کے خیال سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتی ہو۔ لیکن اس کے گھر والے تو یقیناً اس کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہوں گے۔ یہ سوچ کر میرے دل میں اُمید کی کرن پھوٹی۔ اس معصوم کی دنیا کیوں اندھیر ہو۔ میں اس کا ہاتھ تھام لوں تو گھر کی بات گھر میں رہے گی۔

مجھے کہاں معلوم تھا کہ اس خواہش کے اظہار کے ساتھ ہی دونوں گھرانوں میں زلزلہ آجائے گا۔ مجھے اسی وقت وادی چھوڑ جانے کا حکم ملا اور ساتھ ہی یہ وارننگ بھی کہ اگر میں دربارہ یہ خیال دل میں لایا تو......

ہمارا بیٹا زندہ ہے اس کی منکوحہ سے کوئی شادی نہیں کر سکتا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے سوال اٹھتے ہیں۔ میں انکا جواب چاہتا ہوں۔ کھڑکی کے باہر دور تک خاموشی ہے۔ درختوں کے نیچے جو بستی آباد تھی اس کا نشان بھی باقی نہیں تمام آئی ڈی پیز (IDPs) واپس اپنے گھروں کو جا چکے ہیں۔ اور لگتا ہے کہ میں اکیلا انٹرلی ڈسپلیڈ پرسن یہاں رہ گیا ہوں۔

غزل

جان کو بھی جلا کے دیکھ لیا
دل بھی اپنا مٹا کے دیکھ لیا

قلبِ سنگیں پہ کچھ اثر نہ ہوا
سارا دُکھڑا سنا کے دیکھ لیا

بات سن کر بھی تم نہیں سُنتیں
ہم نے سب کچھ بتا کے دیکھ لیا

بے پیے مست ہوگئے جب بھی
آنکھ تم نے ملا کے دیکھ لیا

کھِل گئے پھول جانِ ویراں میں
تم نے جب مسکرا کے دیکھ لیا

دُور رہ کر بھی دُور رہ نہ سکے
ہم نے جا جا کے آ کے دیکھ لیا

تم پہ مرنے کے بعد مر نہ سکے
زہر بھی ہم نے کھا کے دیکھ لیا

عشق بیکار کام ہے شیدؔا
ہم نے یہ آزما کے دیکھ لیا

○

خالد حمید شیدؔا (امریکہ)

جزیرے پیار کے

دیپک بدکی

(غازی آباد،بھارت)

تینتیس سال کی نوکری کے بعد آج میں ڈاک خانے کی ملازمت سے ریٹائر ہو رہا ہوں۔میں نے پہلی بار سرینگر میں سینئر سپرانٹنڈنٹ کا چارج لیا تھا۔ایسا لگ رہا ہے جیسے کل کی بات ہو۔

ڈاک خانے سے میرا تعلق بچپن ہی سے رہا ہے۔کبھی خط و کتابت کے لیے،کبھی منی آرڈر بھیجنے کے لیے یا پھر کبھی لائبریری کو کتابیں لوٹانے کے لیے۔ان دنوں یہ محکمہ زندگی کے ہر شعبے سے جڑا رہتا تھا لیکن اب تو خدا ہی حافظ ہے۔آجکل یہ بحر بیکراں کے ساحل پر کھڑے دیوہیکل جہاز کی مانند لگ رہا ہے جو پراگندہ ہونے کی تاک میں بیٹھا ہوا ہے۔

ملازمت سے پہلے کی کچھ ایسی یادیں بھی ہیں جو مسلسل ذہن کو معطر کرتی رہتی ہیں۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں اچھی نوکری کی تلاش میں تقریباً ہر روز ایک دو درخواستیں بھیجنے کے لیے سرینگر جی پی او کے چکر لگایا کرتا تھا۔ایک روز کاونٹر پر پہونچا تو کاونٹر کلرک نے بڑی بدتمیزی سے رجسٹری کرنے سے انکار کر دیا۔

''دیکھتے نہیں ٹائم ختم ہو گیا ہے۔''

''محترمہ ابھی دو بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔''

''میں نے کہا نا اب رجسٹری نہیں ہو سکتی۔ہمیں حساب بھی تو ملانا ہوتا ہے۔''وہ کرخت لہجے میں بولی۔

بغل میں کھڑے کسی آدمی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔''بھائی صاحب،آپ دیکھتے نہیں وہ سامنے اس کا بوائے فرینڈ موٹر سائیکل پر ہارن پر ہارن بجائے جا رہا ہے۔اسی لیے جلدی مچی ہوئی ہے۔''

خیر ہوئی کہ اس نے سنا نہیں ورنہ اس آدمی کو کچا ہی چبا جاتی۔

''میڈم مجھے آج ہی رجسٹری بھیجنی ہے۔آج لاسٹ ڈیٹ ہے۔''

دور کسی اور کلرک کی نظر مجھ پر پڑی۔اس کو مجھ پر رحم آ گیا۔وہ زیر لب مسکراتی ہوئی میرے پاس آئی اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''لائیے مجھے دیجیے۔میں رجسٹری بک کر لوں گی۔''

میں نے لفافہ اس کے سپرد کر دیا اور کنکھیوں سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔اس نے شتابی رسید لکھ کر مجھے سونپ دی۔

''آپ نے تو مجھے ممنون کر دیا۔''مجھے شکریہ کہنے کے لیے الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔

''آپ تکلف کر رہے ہیں۔یہ تو میرا فرض ہے''۔اس کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ تیر گئی۔وہ دوبارہ گویا ہوئی۔''ایسے پھر کبھی دیر ہو جایا کرے تو آپ سیدھے میرے پاس اس کمرے میں آیا کیجیے۔''

''وہ تو فلیٹلی کا کمرہ ہے.....!''

''ہاں میں وہیں پر کام کرتی ہوں۔''

اس دن کے بعد میں نے کاونٹر پر جانا ہی بند کر دیا اور سیدھے فلیٹلی والے کمرے میں جا کر لفافے اس کے سامنے رکھ دیتا۔وہاں پر وہ اور اس کی سہیلی ہوتی۔بارہا میں ان کے ساتھ دیر تک گفتگو میں محو ہو جاتا البتہ جب فرصت نہ ہوتی تو لفافے ان کے سپرد کر کے شام کو رسید لینے چلا جاتا۔ثمینہ نے کئی بار مجھے فلیٹلی کے بارے میں طرح طرح کی جانکاری دی اور ساتھ ہی چائے بھی پلاتی رہی۔پھر یہ ملاقاتیں نہ جانے کب اور کیسے معاشقے میں بدل گئیں۔ابتدا میں وہ میرے پہناوے اور طرز گفتگو سے یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ میں پردیسی ہوں اور سیاحت کی غرض سے کشمیر آیا ہوں مگر اس کی حیرت کی انتہا اس وقت نہ رہی جب وہ مجھے زینہ کدل جا رہے ٹمپو میں ملی۔اس نے اپنے تجسس کو مٹانے کی خاطر بیٹھتے ہی مجھ سے پوچھا۔''آپ یہاں کیسے؟''

''گھر جا رہا ہوں۔''

''گھر.....؟''وہ مجھے دیکھنے کے بجائے اپنی سہیلی کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں،میں زینہ کدل ہی میں رہتا ہوں۔''

''آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔''

''آپ نے کبھی پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تو میں کیسے بتاتا۔''

''خیر اب تو بتا سکتے ہیں۔''

''امن....''

''آپ ہندو ہیں؟''

''جی ہاں....''

وہ مسلسل اپنی ہندو سہیلی کی جانب دیکھتی رہی۔گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے اسے الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔نہ تو میں پردیسی تھا اور نہ ہم مذہب۔وہ دبدھا میں پڑ گئی۔خیر اب قدم پیچھے ہٹانا بھی اس کے لیے دشوار تھا۔اس لیے زندگی کی پتوار قسمت کے حوالے کر کے وہ لہروں کے ساتھ بہتی رہی اور ہمارا عشق آہستہ آہستہ پروان چڑھتا رہا۔

ثمینہ ہنس مکھ،زندہ دل اور خیامی (epicurean) تھی۔بڑی اچھی شکل و صورت کی مالک تھی مگر قد میرے مقابلے میں ذرا چھوٹا تھا۔میں آج تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ میری زندگی میں جتنی بھی لڑکیاں آئیں ان میں اکثر و بیشتر قد کی چھوٹی کیوں تھیں؟ شاید نفسیاتی طور پر وہ مجھ سے منسوب ہو کر اپنے احساسِ کمتری

سے نجات پانا چاہتی تھیں۔دھیرے دھیرے میں اور ثمینہ عشق کے مقناطیسی عمل کی زد میں آ کر یہ بھول ہی گئے کہ مذہبوں کے اختلاف کے سبب ہم ایک روز ایک دوسرے سے ضرور جدا ہو جائیں گے۔اس معاملے میں کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔اقلیتی فرقے کا معمولی سا لڑکا کیسے اکثریتی فرقے کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ہم دونوں اپنے خاندانوں اور برادری کے معصوم لوگوں کی لاشوں پر اپنے پیار کا تاج محل کیسے کھڑا کر سکتے تھے؟ ہم عصر زندگی کا سب سے بڑا مسلۂ یہی ہے کہ آج بھی ہم مذہبی بندشوں اور منافرتوں میں قید ہیں۔اس جال سے ہمیں نہ تعلیم آزاد کر پائی اور نہ ہی سائنسی فکر و عمل۔

سال ڈیڑھ سال ہی میں میرا حلیہ بدل گیا۔دہلی میں غلط طریقوں سے کمائی ہوئی دولت بھاپ بن کر اڑ گئی۔سوٹ،سوئیٹر اور قمیض پارہ پارہ ہونے لگی تھیں۔کم قلیل تنخواہ میں نئے کپڑے خریدنا بعید از قیاس تھا۔ثمینہ کو بھی اس تبدیلی کا احساس ہونے لگا۔ایک روز اس نے خوبصورت ڈیزائین کا ایک سوئیٹر میری بہن کے ہاتھوں یہ کہہ کر بھیج دیا۔''بھیا سے کہہ دو پھٹی پرانی سوئیٹر پہن کر باہر نہ نکلا کرے۔اچھا نہیں لگتا۔''

میں نے سوئیٹر پہن لی جو بالکل میرے ناپ کی بنی ہوئی تھی۔بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے میرے ایک دوست، جو میری طرح ہی وجیہہ تھا، کا ناپ لے کر سوئیٹر بنوایا تھا۔ثمینہ کے اس فعل نے مجھے بہت متاثر کر دیا۔عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب جیب خالی ہو جاتی ہے تو لڑکیاں منھ موڑ کر چلی جاتی ہیں مگر ثمینہ تو کسی اور ہی مٹی کی بنی ہوئی تھی۔وہ میری گرتی ہوئی مالی حالت کو برداشت نہ کر سکی اور اپنی کم قلیل تنخواہ سے اس میں پیوند لگانے کی کوشش کرنے لگی۔وہ بھی جب اسے پورا یقین تھا کہ ہم ایک دوسرے کے کبھی نہیں ہو سکتے ہیں۔

ادھر مجھے ہمیشہ اپنی کسمپرسی کا احساس رہا۔اس لیے میں ہر دم یہی کوشش کرتا رہا کہ اپنا کیریئر سنوار لوں۔سال ڈیڑھ سال ہی میں میں نے سول سروسز کا امتحان پاس کر لیا اور مسوری میں تربیت کے دوران میرا الاٹمنٹ لیٹر بھی آیا۔مجھے پوسٹل سروسز میں الاٹ کیا گیا۔الاٹ منٹ لیٹر پڑھتے پڑھتے مجھے ثمینہ کی بہت یاد آئی۔جی کرتا تھا کہ اڑ کر سب سے پہلے اس کو یہ خبر سناؤں۔

چھٹیوں میں سرینگر پہنچتے ہی میں نے ثمینہ کو یہ خبر سنائی۔وہ مجھے حیرت سے دیکھتی رہی۔مجھے بحیثیت باس دیکھنا تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔اس وقت بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کو بانہوں میں سمیٹنے والا مجنوں کبھی اس کا باس بھی بن سکتا ہے۔

اور پھر ایک روز وہی ہوا جو ہونا تھا۔میرا ٹرانسفر سرینگر ہوا۔شروع ہی سے میرے ذہن میں یہ تذبذب رہا کہ ثمینہ کو دیکھ کر میرا ردِ عمل کیسا ہوگا۔میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔اب افسری تھی، صاحب بہادر کہنے والے ملازم تھے، گاڑیاں تھیں، رعب داب تھا اور پھر ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

ایک روز ہیڈ کلرک میری میز پر کلرکوں کا لمبا چوڑا ٹرانسفر آرڈر رکھ کر چلا گیا۔میں نے موقعے کو غنیمت جان کر ثمینہ کا ٹرانسفر ایسی جگہ کر لیا جہاں وہ مہینے میں تنخواہ کے علاوہ کم سے کم تین چار ہزار روپے کما سکتی تھی۔میں نے سوچا اس طرح اس کی عنایتوں کا تھوڑا بہت قرضہ تو اتر سکتا ہے۔اس میں اڑچن بس اتنی تھی کہ اس کا آفس گھر سے پانچ کلومیٹر دور تھا اور اس کو روزانہ دو بسیں بدلنی پڑتیں۔اس آفس میں پوسٹنگ کے لیے کئی سفارشیں آ چکی تھیں مگر میں نے سب کو نظر انداز کر کے ثمینہ کو وہاں بھیج دیا۔

آرڈر ملتے ہی ثمینہ میرے آفس پہنچ گئی اور کمرے میں داخل ہوتے ہی زور زور سے کہنے لگی۔''مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔بھلا نہیں کر سکتے ہو، نہ کرو مگر برا بھی تو نہ کرو۔کیا سارے شہر میں میں ہی ایک بچی تھی کہ ٹینور ختم ہونے سے پہلے ہی مجھے اتنی دور پھینک دیا۔''

کمرے میں میرے سامنے سی بی آئی کا ڈپٹی سپرانٹنڈنٹ بیٹھا ہوا تھا۔ثمینہ کے طرزِ تخاطب کو دیکھ کر میرا دل گھبرا گیا۔میں سوچنے لگا کہ پولیس والا ہے جلدی بھانپ جائے گا۔اس لیے میں نے فوراً حالات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ثمینہ کو سامنے کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور میز پر پڑی مٹھائی کی پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''لو یہ مٹھائی کھالو۔'' پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگا۔

''کیا تم نے اپنی تین پسندیدہ جگہوں کی فہرست آفس کو بھیجی تھی؟''

''کیوں بھیجتی۔میرا تو ابھی ٹینور بھی مکمل نہیں ہوا۔''

''ٹھیک ہے، میں ریکارڈ چیک کر لوں گا اور اگر ایسا ہے تو تمہارا آرڈر بدل دوں گا۔''

میں اسے یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ میں نے تمہاری بھلائی کے لیے ہی تمہارا ٹرانسفر نئے آفس میں کیا تھا اور کتنے لوگوں کی دشمنی مول لی تھی۔اسے کیا معلوم تھا کہ اس جگہ کے لیے کہاں کہاں سے سفارشیں آئیں تھیں۔

چائے پی کر وہ چل دی اور میں نے راحت کی سانس لی۔دوسرے روز اس کو گھر کے نزدیک ہی ایک آفس میں تعینات کر دیا۔

بہت عرصہ گزر جانے کے بعد اتفاق سے ایک ایسی جگہ اس کا سامنا ہوا جہاں میں کھل کر بات کر سکتا تھا۔میں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔''ثمینہ مجھے معلوم ہے کہ تم اس روز مجھ سے ناراض ہو گئی تھیں مگر میں نے تو تمہاری بھلائی کے لیے ہی تمہارا ٹرانسفر کیا تھا۔سوچا تھا کہ تنخواہ کے علاوہ تم چار پانچ ہزار مہینے میں کما سکو گی لیکن تمہیں میری بات راس ہی نہ آئی۔''

وہ حیرت سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر ہنس کر بولی۔''اور دن میں دو بسیں بدلنی پڑتی۔صبح ایک گھنٹہ پہلے گھر سے نکلنا پڑتا اور شام کو اندھیرے میں گھر واپس پہنچ جاتی۔''

باقی صفحہ ۹۵ پر ملاحظہ فرمائیں

''نقشہ نیا دیوار پر''

انور سدید

(لاہور)

مٹ گیا فرمان جو لکھا گیا دیوار پر
اب ابھر آیا ہے ایک نقشہ نیا دیوار پر

شاخ جب ٹوٹی تو چڑیا سوچ میں غلطاں ہوئی
کیسے بن سکتا ہے اس کا گھونسلہ دیوار پر

بم دھماکہ گھر کے اندر سے ہوا، چھت گر گئی
چاروں جانب سے ہے ملبہ آ گرا دیوار پر

بہہ گئیں سیلاب میں ساری کتابیں شہر کی
بچ گیا ہے وہ جو تھا لکھا گیا دیوار پر

اک عمارت سے پرندہ اڑ کے جب ٹکرا گیا
لکھا گیا ہے عالمی اک حادثہ دیوار پر

آج جس سامنا کرنے پر وہ مائل نہیں
وقت نے وہ لکھ دیا ہے واقعہ دیوار پر

کل تو میں بھی بزم میں محوِ تکلّم تھا سدیدؔ
ڈھونڈتے ہیں آج وہ سایہ مرا دیوار پر

○

کرشن کمار طورؔ

(دھرم شالہ، بھارت)

ہمارے سینے میں روشن کتاب سے ہوئی تھی
ہر ایک صبح کسی آفتاب سے ہوئی تھی

میں سر جھکاتا رہا کس کے آستانے پر
مری نماز بھلا کس حساب سے ہوئی تھی

اگرچہ مجھ کو انا کا لحاظ تھا لیکن
یہ روشنی تو اک اس کے جواب سے ہوئی تھی

پھر اس کے بعد کسی میں کسی کا دم نہ رہا
نوید وصل تو اک اضطراب سے ہوئی تھی

مجھے تھا علم یہاں دل ضرور ٹوٹے گا
مری شکست ترے انتخاب سے ہوئی تھی

اک ایسا وقت بھی تھا اپنی دسترس میں بہت
جہاں پہ روشنی بس ایک خواب سے ہوئی تھی

ہے نام آپ کا بھی اب تو سرفروشوں میں طورؔ
یہاں ہوئی تھی جو گنتی جناب سے ہوئی تھی

شبنم شکیل
(اسلام آباد)

تم سے رُخصت طلب ہے مل جاؤ
کوئی اَب جاں بلب ہے مل جاؤ

لَوٹ کر اب نہ آسکیں شاید
یہ مسافت عجب ہے مل جاؤ

دل دھڑکتے ہوئے ڈرتا ہے
کتنی سنسان شب ہے' مل جاؤ

اِس سے پہلے نہیں ہوا تھا کبھی
دل کا جو حال اَب ہے' مل جاؤ

خواہشیں بے سبب بھی ہوتی ہیں
کیا کہیں کیا سبب ہے مل جاؤ

کون اَب اور انتظار کرے
اتنی مہلت ہی کب ہے مل جاؤ

○

نقشبند قمر نقوی بھوپالی
(ٹلسا' امریکہ)

گھرا ہوا ہے جو اک خوف بادلوں کی طرح
یہ زندگی کا سمندر ہے مسئلوں کی طرح

بھٹک رہے ہیں خیالات شہر ارماں میں
وفور شوق کے گم کردہ قافلوں کی طرح

سفر کی ساری شرائط میں کر چکا پوری
وہ روشنی ہے مرے گرد منزلوں کی طرح

سفینہ کیسے بھلا دے گا ایسے طوفاں کو
ہمیشہ ساتھ رہا ہے جو ساحلوں کی طرح

بہت دنوں سے عنایات کا رواج نہیں
بجھے بجھے سے مراسم ہیں حوصلوں کی طرح

ہے سرد و گرم سے پیہم مقابلہ جاری
تعلقات بھی ہوتے ہیں مرحلوں کی طرح

الجھ رہا ہوں قمر نقوی خواہشوں سے ابھی
کسی کی زلف معنبر کے سلسلوں کی طرح

○

سُرورانبالوی

(راولپنڈی)

چراغِ زندگی تیرے تصوّر سے فروزاں ہے
حقیقت میں تصوّر ہی ترا اب کیف ساماں ہے

ترے جلووں کی تابانی سے ذرّے مہر کی صورت
ترے حُسنِ نظر سے اُجڑی بستی کیف ساماں ہے

ہر اک غم کا مداوا گردشِ دوراں ترے دم سے
ترا اے گردشِ دوراں یہ ہم پر کتنا احساں ہے

ہزاروں تتلیاں' جگنو ہیں رقصاں قریۂ جاں میں
تری خندہ لبی سے تیرگی میں بھی چراغاں ہے

اسی کی گردشِ پیہم سے رعنائی ہے عالم کی
مدارِ زیست جس پر ہے یہی چشمِ غزالاں ہے

چمن کے خاروخس سے یہ جو الجھی دھجیاں سی ہیں
پتہ کُچھ کُچھ انہی سے چلتا ہے یہ میرا داماں ہے

جنوں تو خیر دورا ہے یہ لے آیا ہے انساں کو
تعجب ہے خِرد کِردار پر خُود اس کے خنداں ہے

یہی اس کی تباہی کے لئے دن رات ہے کوشاں
ہوئی تخلیقِ عالم جس کی خاطر یہ وہ انساں ہے

سُرور انبالوی ہم قول کے ہر آن سچے ہیں
پہنچ کر دار پر پورا کریں گے جو بھی پیماں ہے

مامون ایمن

(نیویارک' امریکہ)

سفر موہوم ' پیچیدہ فضا ہے
خموشی' بلبلۂ بے بس ہوا ہے

تسلسل آگہی کا رُک گیا ہے
نظر سے اِک ذرا پردہ اٹھا ہے

چمن کے دَر پر دستک ہے خزاں کی
شگوفہ مسکرا کر کھِل رہا ہے

زمانے بھر سے لڑتا پھر رہا ہوں
مِرا دشمن مِرے اندر چھُپا ہے

پھراتی ہے مجھے مغرب میں قسمت
قدم میرا مگر مشرق ادا ہے

ابھی رستہ نہیں منزل نظر میں
سفر کا اب ارادہ کچھ نیا ہے

بتائے کوئی جھونکا کاش مجھ کو
مِرا محبوب کِس جا' جا بسا ہے

مِرے کردار کی شہرت جہاں میں
مِرا آئینہ مجھ سے آشنا ہے

ارے' لاہور کا مامون ایمؔن
مَریکا میں بڑا شاعر بنا ہے

غلام مرتضیٰ راہیؔ

(فتح پور، بھارت)

کم جو مجھے حصّہ دے
نادار کو پہنچا دے

منظر میں رہوں ہر دم
وہ ذوقِ نظارہ دے

اربابِ بصیرت سے
مٹّی مری چھنوا دے

دے راہ مجھے سادہ
پانقش کٹندا دے

جتنی بھی ہو سچائی
سب مجھ سے اُگلوا دے

مجھ کو جو دبا کر رکھ
بُنیاد کا درجہ دے

لگوا مرے ہاتھوں سے
وہ پیڑ جو سایہ دے

پانی نہ ہو کم چاہے
پینے کو نہ دریا دے

واجب ہے جو پھر اپنے
محبوبؐ کا صدقہ دے

ٹھوکر وہی راہیؔ کو
جو راستہ دکھلا دے

آصف ثاقب

(ایبٹ آباد)

میرا فن کیا چیز ہے تیری کلا کے سامنے
ابتدا لائی نہ جائے انتہا کے سامنے

دیکھ لے آ کر انیسِ دیدہ ور یہ خود سری
ہم چراغِ عاشقی لائے ہوا کے سامنے

بادشہہ شطرنج والامات کیسے کھا گیا
اک پیادہ تک نہیں بے دست و پا کے سامنے

لفظ جب باندھے گئے تھے شدتِ جذبات سے
دست بستہ رہ گئے میری دعا کے سامنے

ہم کو اپنی دل کی مختاری پہ کتنا ناز تھا
دل سے عاجز ہو گئے اس دلربا کے سامنے

کس طرح تکمیل ثاقبؔ ہو خیالِ خام کی
شعر آدھا ہے ''شکستِ ناروا'' کے سامنے

❍

بی۔ایس۔جین جوہؔر

(میرٹھ،بھارت)

میں نے بھی نظریں جھکالیں اس نے بھی پردہ کیا
پھر بھی جانے کیوں زمانے ہمیں رُسوا کیا

آتے جاتے ہو گیا میرا انکا سامنا!!
دل بہت زوروں سے دھڑکا ہاتھ سے تھاما کیا

غیر سے ہو کیا گلہ اپنوں نے آنکھیں پھیر لیں
سوچتے ہی رہ گئے ایسا بھی ہم نے کیا کیا

جو بھی کرنا تھا ہمیں کرتے رہے ہم بے جھجک
نکتہ چیں کہتے رہے ایسا کیا ' ویسا کیا

کوئی دہشت گرد لوگوں سے یہ پوچھے پاگلو!
یہ تھی مزدوروں کی بستی قہر کیوں برپا کیا

جاتے کتنی دور تک مندر میں ماتھا ٹیکنے
گھر سے مسجد پاس تھی ہم نے وہیں سجدہ کیا

مذہبوں نے بانٹ ڈالا نسلوں کو انسان کی
ورنہ خالق نے تو معصوم آدمی پیدا کیا

مذہب اک ایسا بھی ہو جو آدمیت ہی سکھائے
پڑھ کے پنڈت، مولوی، ملاّ بنے تو کیا کیا

○

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

دل بھر چکا ہے عشق سے یاروں کا ان دنوں
مت پوچھ حال رزق کے ماروں کا ان دنوں

ہر احتیاج دل کو جلاتی ہے صبح وشام
ہر شب شمار ہوتا ہے تاروں کا ان دنوں

وحشت فزوں ہے سرخیِ اخبار دیکھ کر
ہوتا ہے قتل روز ہزاروں کا ان دنوں

کرنا گلوں کا دامنِ خوش رنگ تار تار
صحنِ چمن میں کام ہے خاروں کا ان دنوں

ہر شخص کی جبیں پہ ہے تحریر بے رخی
رخ اور سمت ہو چکا پیاروں کا ان دنوں

خالص رہا نہ جذبۂ ایثار کیا کہیں
کب ہے وہ احترام اداروں کا ان دنوں

اب گلستاں میں خاک سی اڑتی ہے ہر طرف
خیمہ کہاں ہے نصب بہاروں کا ان دنوں

○

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(دہلی، بھارت)

آخر اُن کے سلوک نے جھٹلا دیا
اِک زعم تھا کہ وہ ہے پیکرِ وفا

بھٹک رہا ہے، پھر لئے پیار کا کاسہ
کوئی انّا کے خول سے باہر نہیں نکلا

مانگا تھا اُس نے فقط وفاؤں کا صلہ
اُسکی رگِ جاں میں شریعت کا خنجر اُترا

اُجڑی ہوئی آنکھوں میں اِک پل بھی نہ جھانکا
کوئی نیم جان در پہ اُن کے مدّتوں ٹھہرا

ہونے نہ دیئے ختم دیواروں کے سلسلے
اِس موڑ پر بچھڑا ہے تو کدھر جائے گا

چاہتا تھا اُنہیں ٹوٹ کر زیست کی طرح
راہ میں کھڑا تھا مگر عقیدوں کا اژدھا

کیابات چبھی ہے کہ وہ ہے بےطرح خموش
رہنے لگا ہے سحر و مسا یاس کا پہرہ

اے تشنہ کون دیگا اب در پہ ترے دستک
گزرا ہوا لمحہ کبھی ہاتھ ہے آیا؟

❍

ضیا شبنمی
(ملتان)

چاندنی راتوں کی تقریبیں کہانی ہو گئیں
صبح کے ہوتے ہی سب باتیں پرانی ہوگئیں

کتنے پتھر تھے جنہیں تیشوں نے زندہ کر دیا
کتنی شکلیں تھیں جو مٹ کر غیر فانی ہوگئیں

یاد آتی ہیں تو جی اُٹھتی ہیں خوابوں کی طرح
وہ ملاقاتیں کہ جزوِ زندگانی ہو گئیں

جن میں رہتا تھا کبھی چہرہ مرے ہمزاد کا
روتے روتے آج وہ آنکھیں بھی پانی ہوگئیں

ایسی غزلیں جن کی خاطر شہر میں رسوا ہوئے
کاغذوں پر آتے آتے آسمانی ہو گئیں

وہ رتیں جن کی بدولت ہم مصوّر بن گئے
ہم کو صورت گر بنا کر غم کی بانی ہوگئیں

❍

قیصر نجفی
(کراچی)

میں آپ اپنی لئے مشکلات چلتا ہوں
کسی کے ساتھ نہیں اپنے ساتھ چلتا ہوں

میں کیا بتاؤں کہ ہے کون ہمسفر میرا
میں ساتھ اپنے لئے کائنات چلتا ہوں

زمانہ دیدۂ حیرت سے دیکھتا ہے مجھے
میں لیکے اپنے جلو میں حیات چلتا ہوں

ہزار آئیں مرے راستے میں پیچ وخم
بغیر لائے کوئی لب پہ بات چلتا ہوں

سکون موت ہے، حرکت ہے زندگی قیصرؔ
یہی سبب ہے میں دن ہو کہ رات چلتا ہوں

○

سہیل غازی پوری
(کراچی)

آنکھوں میں کوئی رنگ نہ دل میں کوئی امنگ
جیسے کہ بند تالے پہ قبضہ جمائے زنگ

چہرے پہ اے خیال! ترے ہے تھکن کی ضو
تُو اور کتنی دور چلے گا ہمارے سنگ

ساحل مسرتوں کا اُسے کیوں بلائے گا
دریائے غم میں ڈوب گیا جس کا انگ انگ

لکھتا نہیں وہ حرف مگر ہے فدائے حرف
دنیائے فکر وفن بھی اُسے دیکھ کر ہے دنگ

ہم نے تجھے معاف کیا گردشِ جہاں
ہم زاد سے تو ہوتی رہے گی ہماری جنگ

دل کے ہر ایک راز کا چہرہ ہے آئینہ
آتا ہے ایک رنگ تو جاتا ہے ایک رنگ

خوشبو چمن سے نکلے تو پھرتی ہے دربدر
یوں جیسے کٹ کے ڈور سے اُڑتی پھرے پتنگ

راس آگیا تمہیں بھی انا کا ہنر سہیلؔ
تم نے بھی کر لئے ہیں عجب اپنے رنگ ڈھنگ

○

پرتپال سنگھ بیتابؔ
(جموں کشمیر)

ہر قدم ایک امتحان کے ساتھ
زندگی ہم نے کی ہے شان کے ساتھ

کیا بتائیں زمین والوں کو
تجربے اپنے آسمان کے ساتھ

سائے رہتے ہیں ان مکانوں میں
لوگ رہتے ہیں لامکان کے ساتھ

ہم اکیلے نہ ہونگے محشر میں
ہوگا جو ہوگا اِک جہان کے ساتھ

کب کہاں کیسے ہوگئے منسوب
لفظ اُس کے مری زبان کے ساتھ

وہ نظر کی حدوں سے آگے ہے
جسے ہم دیکھتے ہیں دھیان کے ساتھ

ہم زمیں پر قیام کرتے ہیں
اور رہتے ہیں آسمان کے ساتھ

زندگی سے طویل ہیں بیتابؔ
مسئلے اپنے اس جہان کے ساتھ

○

صابرؔ عظیم آبادی
(کراچی)

کر کے اپنے شوق کا اظہار لوگ
چل پڑے ہیں آج سوئے دار لوگ

شہرِ جاں کے ہر درو دیوار کو
کر رہے ہیں آپ ہی مسمار لوگ

تیز رستہ کیا چلوں اس دور میں
توڑ دیتے ہیں مری رفتار لوگ

پھول کی چادر سروں پر اوڑھ کر
کرتے ہیں کانٹوں کا کاروبار لوگ

جن کے کرداروں سے روشن ہے جہاں
ہیں ابھی ایسے یہاں دوچار لوگ

چار دن کی چاندنی کے واسطے
کر رہے ہیں زندگی سے پیار لوگ

دھوپ کے صحرا میں صابرؔ کس لئے
ڈھونڈتے ہیں سایۂ دیوار لوگ

○

یادوں کا ورثہ

عظمیٰ صدیقی

(لندن)

کئی دن سے اُس کی طبیعت گھبرا رہی تھی لیکن آج صبح سے کچھ زیادہ ہی بے چین تھی۔ اُس نے سوچا یہ ڈپریشن شاید موسم کے سبب ہے۔ یہاں دسمبر جب بھی آتا ہے۔ اندھیرا' خاموشی اور اداسی تو لاتا ہے۔ وہ شادی ہو کر جرمنی آئی تو شروع شروع میں بہت دل گھبراتا تھا۔ زبان سے ناواقفیت، نیا ماحول اور شدید موسم۔ روزمرہ کے گھر کے کام ختم کرنے کے بعد زبیر کے آفس سے لوٹنے کا انتظار کتنا بوجھل لگتا تھا وقت تھا کہ گزر کے نہیں دیتا تھا پھر نتاشا پیدا ہوئی تو اُس کی مصروفیت بڑھ گئی۔ اُس کی تنہائی ننھی نتاشا کے چھوٹے چھوٹے کاموں کی مصروفیت میں دب کر رہ گئی۔ اور پھر دو سال بعد بلال کی آمد ہوئی۔ لیکن جب بچے تھوڑے بڑے ہوئے اور کنڈرگارڈن (Kinder Garden) سے اسکول جانا شروع کیا تو اکثر خاموشی، تنہائی اور اداسی اُسے اپنے گھیرے میں لے لیتی گھر کی یاد ستاتی۔ بچپن کے دوست، کالج کی سہیلیاں، ماں جان، بابا جان اور بھائی بہت یاد آتے۔ وہ بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ ماں جان اور بابا جان کو بہت عزیز۔ تین بیٹوں کے بعد بابا جان اور ماں جان کی آرزو تھی کہ اُن کے ہاں بیٹی پیدا ہو۔ اس لیے اُس کے آنے پر انہوں نے اس کا نام آرزو رکھا۔ وہ سب کی آرزو تھی بھائیوں کی بھی جو اُس کے ناز اٹھاتے اور جن کے لیے وہ ایک ننھی منی گڑیا تھی۔ وقت خوشی، محبت اور سکون کے لمحوں کو اپنے بازوؤں میں لے کر دوڑتا چلا جاتا ہے ایسے کہ موسم بدلنے کی خبر تک نہیں ملتی۔ عابد بھائی جو سب سے بڑے تھے امریکہ پڑھنے گئے اور پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ وہیں کے ہو رہے۔ پھر خبر ملی انہوں نے وہاں شادی کر لی ہے۔ بابا جان اور ماں جان کو صدمہ ہوا مگر ہمیشہ ڈھیر ساری دعائیں خط میں لکھ کر بھیجتے رہے۔ پھر عاصم بھائی نے بھی باہر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بابا جان اور ماں جان نے بالکل بھی مخالفت نہیں کی۔ جاؤ بھئی تم بھی جاؤ۔ ہماری محبت ہمارے بچوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کبھی نہیں بنے گی۔ بابا جان نے بظاہر بڑے مضبوط لہجے میں یہ بات کہی تھی لیکن اُن کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتر آئی تھی۔ اور ماں جان وہ تو بس خاموش سی ہو کر رہ گئی تھیں۔ پھر عاصم بھائی بھی چلے گئے اور کچھ عرصہ کے بعد وقار بھی۔ ماں جان اور بابا جان کے نصیب بھی کیا تھے۔ اُن کے سب بچے ایک ایک کر کے اُن سے دور جا بسے اور آرزو کو بھی شادی کے بعد جرمنی آنا پڑا۔ وہ سب بکھر کے رہ گئے۔

آرزو کی شادی پر سب پاکستان آئے تھے مگر اُس کے بعد صرف فون پر اُن کا رابطہ رہ گیا تھا۔ اور آج پھر اُسے سب کی یاد آ رہی تھی۔ بچے اسکول سے آ چکے تھے لیکن اُس کا دل بہت بے چین تھا۔ اسے زبیر کا شدت سے انتظار تھا لیکن زبیر کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ وہ کافی کا مگ تھام کر کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ باہر دھند تھی اور دھند میں لپٹا اندھیرا، سرد موسم اور ایک گہری خاموشی۔ ہمارے ملکوں میں کتنا شور ہوتا ہے۔ زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ بھیڑ بھاڑ اور ہجوم۔ ایک ہنگامہ۔ گھر کے اندر۔ گھر کے باہر۔ بازاروں میں۔ بس اسٹاپوں پر۔ زندگی دوڑتی بھاگتی، ہنستی مسکراتی نظر آتی ہے۔ دکھوں کے باوجود، مسائل کے ساتھ اور پریشانیوں کے گھیراؤ میں بھی بہت سے کاندھے، بہت سے کان اور بہت سے ہونٹ کچھ سہارا دیتے، کچھ کہتے اور کچھ سنتے محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دنیا۔ یہ باہر کی دنیا۔ یہ پردیس کی دنیا، جہاں اجنبیت ہے۔ خود غرضی ہے۔ بے رخی ہے۔ سرد مہری ہے اور سردی ہے۔ یہاں کے موسم کی طرح یہ سردی یہاں کے لوگوں کے رویّوں، اُن کے جذبات، اُن کی آنکھوں اور اُن کے چہروں پر جم کر رہ گئی ہے۔

بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز نے اُس کی اُداس محویت کو توڑ دیا۔ یہ زبیر کے قدموں کی چاپ تھی۔ خلافِ معمول آج وہ جلدی گھر آ گیا تھا۔ ''کیسی ہو آرزو؟ آج کا دن کیسے گزرا؟'' یہ اُس کے معمول کے فقرے تھے۔ جو ہر شام گھر لوٹتے ہوئے وہ آرزو سے کہتا۔ آرزو نے بریف کیس اور کوٹ زبیر سے لیتے ہوئے مسکراتے ہوئے پوچھا ''آج آپ جلدی گھر کیسے آ گئے؟''۔

''ہاں۔۔۔۔یونہی۔۔۔۔دل چاہا۔۔۔۔''۔ اسے لگا آج زبیر کے چہرے پر روز والی تازگی نہیں۔۔۔۔ وہ مسکرا نہیں رہا تھا۔ مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''بچے کیا کر رہے ہیں؟'' زبیر نے گہری سنجیدگی سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اپنے کمرے میں ٹی وی دیکھ رہے ہیں'' آرزو نے زبیر کی سنجیدگی کو ٹٹولتے ہوئے جواب دیا۔ اُس نے آرزو کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے اسے کرسی پر بٹھا دیا اور خود خاموشی سے اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''کیا بات ہے زبیر؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' ''ہاں آرزو میں ٹھیک ہوں''۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کسی الجھن میں ہے۔ کچھ کہنا چاہ رہا ہے کہہ نہیں پا رہا۔ ''آرزو تمہیں بہت ہمت اور حوصلے سے یہ بات سننی ہے جو میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں'' اور پھر جو کچھ زبیر نے کہا وہ خبر ایک بجلی کی طرح اُس کے وجود پر یوں گری کہ اُسے لگا کہ اُس کا پورا بدن بس ایک خاک کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ زبیر کے ہونٹ ہل رہے تھے مگر اُسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

''آرزو!'' زبیر نے تقریباً چیختے ہوئے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔ ''تمہیں خود کو سنبھالنا ہوگا۔ تم سمجھ رہی ہو نا! میں کیا کہہ رہا ہوں''۔ مگر آرزو کی ساری چیخیں حلق میں کہیں اٹک کر رہ گئی تھیں' بابا جان اور ماں جان نہیں رہے آرزو وہ ہم سے ہمیشہ

کے لیے بچھڑ گئے'' زبیراُسے جھنجھوڑ کر کہے جا رہا تھا مگر وہ بے حس وحرکت ایک سکتے کے عالم میں بیٹھی رہی۔

جہاز نے ٹیک آف کیا اور ساتھ ہی اُن کا ذہن بھی پرواز کرنے لگا۔ یادوں کے آسمان پر۔ احساس کے بادلوں میں۔ تیرتے ہوئے پرندے کی مانند۔ وجاہت بیگ اُس کے بابا نے یہ گھر اس خیال سے بنوایا تھا کہ وہ سب اکٹھے اس گھر میں رہیں گے۔ حالانکہ نواب شاہ میں اُن کے کچھ باغات اور زمینیں تھیں۔ ایک آبائی گھر بھی تھا لیکن شادی کے بعد وہ زبیدہ بیگم یعنی ماں جان کے ساتھ کراچی آ گئے اور یہ گھر بنوایا۔ کراچی میں اُن کی ایک فیکٹری تھی لیکن بھائیوں کو پلاسٹک کا سامان بنانے والی فیکٹری میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بابا جان نے ہمیشہ اپنی اولاد کی خواہشوں اور خوابوں کو پورا کرنے میں مدد دی اور دوسرے ماں باپ کی طرح کبھی اپنا کاروبار سنبھالنے پر زور نہیں دیا۔ اُن کی یہی تمنا رہی کہ اُن کی اولاد اپنی صلاحیتوں اور خواہشوں کے مطابق اپنے لیے جو بھی میدان منتخب کرنا چاہیں کریں۔ ماں جان بابا جان کی ہر سوچ، ہر ارادہ اور ہر خواہش تو اس طرح مانتی جیسے کوئی رب کے ارادہ کو مانتا ہے۔ اطاعت اور محبت کا امتزاج جو اُس نے اپنے ماں باپ کے پیار میں دیکھا تھا وہ کہیں مشکل سے ہی نظر آتا ہے۔ عجیب سی محبت تھی دونوں کی۔ نہ تکرار نہ اظہار۔ بس سادہ سی صاف محبت جس میں سمجھوتہ نہیں سچائی نظر آتی تھی۔ ہمارے ہاں میاں بیوی کی محبتیں سمجھوتوں میں لپٹی ہوئی ہیں یا پھر عادت وروایت کی طرح برتی جاتی ہیں رسموں کی طرح نبھائی جاتی ہیں یا کبھی خوف ودباؤ کے سائے میں پلتی ہیں۔ ذہنی ملاپ، مزاج کی مطابقت، جذبوں کی سچائی، اخلاق کی مٹھاس اس بارے میں کون سوچتا ہے۔ کہاں ملتی ہے ایسی محبت۔

بابا جان کہتے ''محبت اطاعت ہے۔ قربانی ہے مگر یہ اطاعت' یہ قربانی صرف عورت ہی کا فرض کیوں سمجھی جاتی ہے۔'' اُن کی عادت تھی صبح اٹھ کر ماں جان کے نماز سے فارغ ہونے سے پہلے چائے خود بناتے۔ ماں جان کا معمول تھا نماز سے فارغ ہو کر صحن میں لگی چنبیلی کی بیل سے پھول توڑ کر بابا جان کے کمرے میں تپائی پر رکھ آتیں۔ بابا جان کو چنبیلی کی خوشبو بہت پسند تھی۔ گرمیوں کی صبح میں بیلے کی کلیاں کانوں میں اڑسے بابا جان کے لیے چنبیلی کی بیل سے پھول چنتی ہوئی ماں جان اور برآمدے میں بچھی بید کی میز پر اخبارات کے ساتھ دو چائے کی پیالیاں رکھے ماں جان کا انتظار کرتے ہوئے بابا جان۔ اُن کی ہر صبح محبت کے اسی اظہار سے شروع ہوتی۔ وزیراں جو اُن کے گھر کام کرنے آتی تھی کپڑے دھوتے ہوئے بابا جان کے سفید کرتوں کی جیب سے چنبیلی کے سوکھے ہوئے پھول نکالتی اور ماں جان کے آگے رکھ دیتی۔ لو بیگم صاب! صاب کے کرتے سے آج پھر یہ باسی پھول نکلے ہیں۔''

اُن کا گھر شہر کے اور گھروں کی طرح نہیں تھا۔ اس کے طرزِ تعمیر میں ایک روایتی پن تھا۔ دالان، صحن، برآمدے اور بہت سے کمروں پر مشتمل دو منزلہ عمارت جو کچھ کچھ پرانی حویلی جیسی دکھائی دیتی تھی۔ بابا جان کہتے ''یادیں ورثوں کی طرح ہوتی ہیں۔ ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتی ہیں۔ میرے ماں باپ کا گھر میرا ورثہ میں نے ترک نہیں کیا۔ دیکھو تم لوگوں کے دادا دادی بھی ایسے ہی گھر میں رہتے تھے۔ اسی طرح رہتے تھے۔ اور مجھے اُن کی طرح رہنا اچھا لگتا ہے۔ گھر کا طرز آرائش بھی اور فرنیچر بھی پرانے انداز کا تھا۔ بابا جان نے یہ فرنیچر آرڈر پر تیار کروایا تھا۔ شیشم کی لکڑی کی بنی ہوئی مسہریاں جن کے سرہانے اور پائے منقش تھے اور بھاری الماریاں جنہیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں منتقل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ برآمدے میں پڑا لکڑی کا جھولا جس پر ماں جان کے ہاتھ کے سلے ہوئے مخملیں گاؤ تکیے رکھے ہوتے۔ جیسے جیسے بھائی بڑے ہوتے گئے انہوں نے گھر کی آرائش کا مذاق اڑانا شروع کیا'' یہ کیا بابا جان۔ یہ کس زمانے کا سامان بنواتے ہیں آپ۔ بھلا اب کون رکھتا ہے اس قسم کا فرنیچر''۔

بابا جان کی بیٹھک الگ تھی جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ رات گئے تک شطرنج کھیلا کرتے۔ اس بیٹھک کے ساتھ اُن کے مطالعہ کا کمرہ تھا۔ جہاں مذہب، تاریخ اور ادب پر خاص طور پر بے شمار نادر کتب موجود تھیں۔ مرزا صاحب چاچا سائیں اور فاروقی انکل بابا جان کے خاص قریبی اور پرانے دوستوں میں تھے۔

آپ کچھ پینا پسند کریں گی؟'' ایئر ہوسٹس کی آواز نے اس کی محویت کو توڑا۔ اُس نے کچھ کہے بغیر نفی میں گردن ہلائی اور آنکھوں کے گیلے گوشوں کو جلدی سے خشک کرتے ہوئے کرسی کی پشت پر دوبارہ سر ٹکا دیا۔ باہر کھڑکی سے بادل تیرتے نظر آ رہے تھے۔ لیکن اُس کا آسمان آج اُس کے سر پر نہیں تھا۔ والدین ہمارا آسمان تو ہوتے ہیں۔ ایک ایسا آسمان جو ہماری دنیا کو اپنی پناہ میں لیے خدا کی رحمت کی طرح سایہ فگن رہتا ہے۔ پر اب اُسے لگ رہا تھا وہ بے اماں ہے۔ تپتے سورج کے نیچے کھڑی جل رہی ہے۔ ایئر پورٹ پر بہت سے لوگ اسے لینے آئے تھے۔ عابد بھائی نے بڑھ کر اسے گلے لگایا وہ اُن کے کاندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ان سب چہروں میں وہ دو چہرے نہیں تھے جو دنیا میں اسے سب سے زیادہ عزیز تھے۔ آج اسے اپنا ہی شہر بہت ویران بہت اجاڑ اور بہت اجنبی سا لگا۔ گھر کے در و دیوار اداسی کی چادر اوڑھے خاموش کھڑے تھے۔

آج کتنی مدت بعد وہ سب اکٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کا درد ایک تھا۔ سسکیاں، آنسو اور بوجھل خامشی۔ ماحول پر ایک اداس سکوت طاری تھا۔ نہ وہ ایک دوسرے کو تسلی دے پا رہے تھے اور نہ کچھ کہہ پا رہے تھے۔ یہ سب کتنا اچانک ہو گیا۔ بابا جان پر چند دن پہلے فالج کا حملہ ہوا ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ وہ جان بر نہ ہو سکیں گے اور ماں جان اس صدمے کو نہ سہہ سکیں۔ زندگی کے سفر میں

بابا جان کی ہم قدم اور ہمسفر آخری سفر میں بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ گھر کی ہر چیز ویسی ہی تھی۔ لگ رہا تھا اس گھر کے مکین تھوڑی دیر پہلے کہیں گئے ہیں اور بس آنے والے ہوں گے۔ باورچی خانہ کی الماری میں نفاست سے رکھے ہوئے برتن، مصالحہ کے ڈبے اچار کی شیشیاں اور ماں جان کے ہاتھ کا بنا ہوا گاجر کا حلوہ فرج میں رکھا ہوا تھا۔

آرزو نے ماں جان کا کمرہ کھولا۔ اُسی طرح صاف ستھرا، بے شکن نفیس بستر۔ کمرے کے کونہ میں رکھا ہوا چھوٹا سا تخت جس پر جائے نماز اور تسبیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اُس نے یونہی سائڈ ٹیبل کی دراز کھولی تو وہ سارے خط اسے دراز میں رکھے نظر آئے جو وقتاً فوقتاً اُس نے ماں جان کو لکھے تھے۔ اُسے لگا کہ یہ سارے خط وہ کھول کر بار بار پڑھتی رہی ہیں۔ ''ماں جان!'' ایک سسکی کے ساتھ اُس نے پکارا اور بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور ماں جان کا تکیہ اُس کے آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔

بابا جان کی بیٹھک میں فاروقی انکل، چاچا سائیں اور مرزا صاحب آئے بیٹھے تھے جو بابا جان کے پرانے دوستوں میں تھے۔ ان میں سب سے پرانی دوستی چاچا سائیں سے تھی۔ محمود پٹیل بابا جان کے طالب علمی کے زمانے کے ساتھی تھے۔ بابا جان کو ان پر بہت بھروسہ تھا۔ نواب شاہ کی زمینیں اور باغات کے معاملات چاچا سائیں دیکھا کرتے تھے۔ کوئی بہت اہم معاملہ آن پڑتا تب بابا جان کو جانا ہوتا تھا۔ اکثر بابا جان چاچا سائیں کے ساتھ شکار کھیلنے بھی جاتے تھے۔ اور چاچا سائیں خاص فرمائش کے ساتھ شکار کے گوشت کے کباب ماں جان سے بنواتے جنہیں وہ بھرجائی کہتے تھے۔ گھر کا ایک کمرہ چاچا سائیں کے لیے مخصوص تھا جب بھی آتے اس کمرے میں ٹھہرا کرتے تھے۔ بالائی منزل پر چاچا سائیں کا کمرہ بابا جان کی بیٹھک اور مطالعہ کے کمرے کے ساتھ ہی تھا جس کا ایک راستہ گھر کے اندر اور ایک بیرونی زینہ کی جانب کھلتا تھا۔ روز شام کو فاروقی انکل، مرزا صاحب کی بابا جان کے ساتھ بیٹھک میں محفل جمتی۔ ماں جان جمیل کے ہاتھ چائے اور کھانے پینے کے لوازمات بھجواتی رہتی تھیں۔ جمیل کوئی نو سال کا تھا جب سے ہمارے گھر میں اوپر کے کام پر رکھا گیا تھا۔ چاچا سائیں نے اسے گاؤں سے بھجوایا تھا۔ ماں جان نے اسے قرآن شریف پڑھایا اور ساتھ ایک سرکاری اسکول میں داخل بھی کروا دیا۔ جمیل روز صبح اسکول جاتا اور تقریباً ساڑھے بارہ بجے تک گھر لوٹ آتا اور اب وہ اکیس سال کا نوجوان تھا۔ بابا جان نے اسے ڈرائیونگ سکھوا دی تھی۔ اب وہ گھر میں ڈرائیور بھی تھا اور سودا سلف بھی لا دیتا تھا۔

بیٹھک میں اس وقت سب کے بات کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جمیل اُسے بتا کے گیا تھا کہ سب اُس سے ملنا چاہ رہے ہیں۔ وہ سر کو دوپٹے سے ڈھانکتی ہوئی بیٹھک میں داخل ہوئی تو وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

چاچا سائیں، فاروقی انکل اور مرزا صاحب۔ وہ سب اسے بہت اپنے لگ رہے تھے۔ اُس کے سر پر رکھے ہوئے اُن کے ہاتھ دھیرے دھیرے لرز رہے تھے۔ اُن سب کی آنکھیں آبدیدہ تھیں اور لفظ حلق میں اٹک گئے تھے۔ مگر احساسات کو لفظوں کی حاجت نہیں ہوتی یہ تو خوشبو کی طرح محسوس کیے جاتے ہیں۔ ابھی ابھی بچوں اور زبیر سے اُس کی فون پر بات ہوئی تھی وہ بچوں کو ساتھ لے کر نہیں آ سکتی تھی۔ اُن کے اسکول کی چھٹیاں نہیں تھیں اور اس لیے زبیر کو بھی رکنا پڑا۔ بچے بہت اداس تھے یہ المناک خبر انہیں مل چکی تھی۔ وہ فون پر اپنے ننا، نانو سے ڈھیر ساری باتیں کرتے تھے اور اُن کے بھیجے ہوئے کارڈز بہت سنبھال کر رکھتے تھے پھر محبتوں اور رشتوں کے درمیان راستوں کے فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ محبتوں کی خوشبو اور تاثیر کی راہ میں کوئی رکاوٹ کوئی روک نہیں ہوتی۔

رات کافی ہو چکی تھی مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ کمرے سے نکل کر چھت پر آ گئی تاروں سے بھرا آسمان اور رات کی رانی کی خوشبو۔ عجب طرح کا سحر فضا پر چھایا ہوا تھا۔ اُس کا دل اور اداس ہو گیا۔ نیچے باغیچے میں لگی رات کی رانی جس کی بیل پھیل کر بالائی منزل کی دیوار تک آ چکی تھی بہت پرانی تھی۔ بابا جان کو یہ خوشبو بہت پسند تھی۔ اسے یاد ہے جب وہ بہت چھوٹی تھی گھر کے باغیچے میں ایک سانپ نکل آیا تھا وزیراں کے میاں نے ڈنڈوں سے پیٹ کر اسے مار ڈالا تھا اور بابا جان سے کہا تھا کہ رات کی رانی کو کاٹ دیا جائے جہاں یہ ہوتی ہے وہاں سانپ آتے ہیں۔ مگر بابا جان نے اس بیل کو کبھی نہیں کٹوایا۔ بابا جان کو خوشبو والے سارے پھول پسند تھے۔ وہ گلاب کی خاص قلمیں سندھ سے منگواتے اور خود لگاتے تھے۔ اُن کے باغیچے میں قسم قسم کے گلاب تھے اور گلابوں کی نسل اور قسموں کے بارے میں انہیں بہت سی معلومات تھیں۔ وہ فخر سے کہتے ''دیکھو ہمارے ملک کے پھولوں میں خوشبو اور پھلوں میں جو مٹھاس ہوتی ہے وہ دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی''۔ اور بات سچ ہے یورپ میں اس نے بہت خوش رنگ پھول دیکھے لیکن خوشبو سے خالی یہ پھول بڑے بڑے اُن نیچرل Unnatural سے لگتے ہیں اور پھل بھی مٹھاس اور خوشبو کے بغیر لذت سے خالی ہوتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی رات کے ساتھ خنکی بھی بڑھ رہی تھی اُسے سردی محسوس ہونے لگی تو وہ نیچے اتر آئی۔ ڈرائنگ روم میں روشنی تھی اور باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید کوئی بھی نہیں سو پا رہا تھا۔ اُس کے دل میں بھائیوں کے لیے بہت ساری محبت اور دکھ امڈ آیا۔ وہ بھی تو کتنے دکھی ہیں۔ سارے کام چھوڑ کر دوڑے چلے آئے ہیں۔ اُن سب کا درد مشترک ہے اور ان لمحوں میں ان سب کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہونا ہی چاہ رہی تھی کہ عابد بھائی کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

''اب ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔ بابا جان کے وکیل سے میری بات ہو چکی ہے۔ ہمیں جلد سے جلد جائیداد اور زمینوں کا فیصلہ کر کے لوٹ

جانا چاہیے۔''

میرا بھی یہی خیال ہے۔گھر اور فیکٹری کا سودا جلد ہو جائے تو اچھا ہے۔باقی رہیں نواب شاہ کی زمینیں چاچا سائیں سے کہہ کر اُن کا معاملہ بھی نبٹا دیا جائے تا کہ پھر ہمیں یہاں واپس نہ آنا پڑے'' یہ وقار کہہ رہا تھا۔

''اور گھر کے سامان وغیرہ کا کیا کریں گے؟'' عاصم نے سوال کیا۔

''یہ پرانا سڑا بھوسا سامان اب کون لیتا ہے۔میرا خیال ہے اسے آکشن میں ہی دیا جاسکتا ہے۔''

''میرا بھی کافی وقت ضائع ہو چکا ہے میں بھی زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتا۔مجھے جلد سے جلد جا کر اپنا کورس جوائن کرنا ہے'' عاصم کی آواز میں بیزاری نمایاں تھی۔

بھائیوں کی باتوں نے اُس کے دکھی دل کو اور بھی دکھی کر دیا تھا اسے لگا کہ جیسے وہ یہاں دکھ بانٹنے نہیں صرف جائیداد کا بٹوارہ کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔یہ گھر اُن کے لیے محض ایک مکان تھا اور اس میں رکھا ہوا سامان محض ایک فرسودہ اور بے کار فرنیچر جسے وہ صرف نیلام کے لائق سمجھتے تھے۔اس سامان سے کیسی کیسی یادیں جڑی ہوئی ہیں اور ان در و دیوار پر کن کن یادوں کے نقش ثبت ہیں۔یہاں کس کی خوشبو بسی ہوئی ہے اور یہاں کی خاموشیوں نے کن آوازوں کو چھپا رکھا ہے یہ وہ محسوس نہیں کر پا رہے تھے۔لیکن آرزو کے لیے یہ در و دیوار یہ سامان یادوں کا بیش قیمت انمول ورثہ تھا۔جسے رُلتے دیکھنا اُسے گوارا نہ تھا۔

وزیراں نے اُسے جو کچھ بتایا اُس کے بعد اُسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بابا جان اور ماں جان کی بیماری کیا تھی۔اُن کی بیماری اُن کی تنہائی تھی۔اُن کے بچوں کی جدائی تھی۔وزیراں بتا رہی تھی کہ ''بیگم صاب میرا کام ختم کرنے کے بعد مجھ سے کہتیں وزیراں تو دوسرے گھروں میں کام نہ کیا کر میرے پاس بیٹھا کر میں تجھے اس کی الگ تنخواہ دوں گی۔اور پھر اُس نے بتایا وہ روز گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر ماں جان کے پاس آ بیٹھتی۔ماں جان کی ساری باتیں گھوم پھر کر صرف اور صرف اُن کے بچوں کے بارے میں ہوتیں۔آرزو یہ کہتی تھی، آرزو یہ کرتی تھی۔آرزو کی سالگرہ کب آئے گی۔اُس کی پسند کے کھانے کیا ہیں۔عاصم کو کیا پسند ہے۔وہ بچپن میں کتنا بیمار رہتا تھا۔اور عابد کو گاجر کا حلوہ بہت پسند ہے اور وقار نے کس طرح بچپن میں نیم کے درخت سے گر کے اپنی ٹانگ توڑ لی تھی۔وہ ہر سال بچوں کو اپنے ہاتھ کے سوئٹر بنا کر بھیجا کرتی تھیں۔آرزو نے ان کے کمرے کی الماری سے ایک ادھورا بنا ہوا سوئٹر نکالا۔ہلکے انگوری رنگ کے اُون کا ادھورا سوئٹر وزیراں نے بتایا یہ آپ کی بیٹی کے لیے بنا رہی تھیں مگر پورا نہ کر سکیں۔

نجمہ خالہ اور فاروقی انکل اُن کے محلے میں ہی رہا کرتے تھے۔دونوں میاں بیوی ایک ہی پیشہ سے وابستہ تھے۔نجمہ خالہ اسکول ٹیچر تھیں جبکہ فاروقی انکل ایک مقامی کالج میں لیکچرر۔وہ کچھ عرصہ پہلے ہی ریٹائر ہوئے تھے۔

اُن کا اپنا مکان نہیں تھا گزشتہ اٹھارہ برس سے وہ اس مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔مالک مکان کہیں باہر رہتا تھا اور اُن کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ وہ اپنا گھر خرید سکتے۔نجمہ خالہ بتا رہی تھیں کہ سوچا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والی رقم سے مکان خرید سکیں گے مگر اس بڑھتی ہوئی مہنگائی نے مکان کی قیمتیں بھی آسمان پر پہنچا دیں۔فاروقی انکل بتا رہے تھے۔بابا جان بہت خاموش رہنے لگے تھے۔شطرنج کھیلتے ہوئے بھی اُن کا دھیان کہیں اور ہوتا تھا۔وہ ہر وقت کچھ سوچتے رہتے۔کاروبار بھی صحیح طور پر نہیں سنبھال پا رہے تھے۔صحت دن بدن گرتی چلی گئی۔ہر سال تم لوگوں کے آنے کا انتظار کرتے۔بتاتے کہ چھٹیوں میں اس سال بچے ضرور آئیں گے۔فون آیا تھا بتا رہے تھے۔مگر کسی نہ کسی وجہ سے تم لوگوں کا آنا ملتوی ہو جاتا تھا اور جب انہیں خبر ملتی کہ بچے نہیں آ رہے تو امید و انتظار مایوسی میں بدل جاتا اور وہ بہت تھکے تھکے سے نظر آنے لگتے۔چاچا سائیں بتا رہے تھے کہ شکار سے اُن کی دلچسپی تقریباً ختم ہو گئی تھی۔کاروبار اور زمینوں پر دھیان دینا کم کر دیا تھا۔یہی کہتے رہتے ''محمود اس جائیداد اور زمینوں کا کیا کروں۔میرا اثاثہ تو میرے بچے ہیں وہی میرے پاس نہیں۔میں نے اپنے ماں باپ کے ورثہ کو سنبھالا۔اُن کی یادوں کے ساتھ اُن کی زندگی کے انداز اور اُن کی سوچ کو اپنایا۔ہماری سوچ، ہماری زندگی ہمارا ورثہ کون سنبھالے گا؟ اور یہ سب چھوڑو۔ہمیں بھی کون سنبھالے گا؟ وہ بعض اوقات ایسی ہی بات کرتے تھے''۔

نجمہ خالہ اور فاروقی انکل کے حالات کا اسے علم تھا۔اُن کی دوستی اتنی پرانی تھی کہ ایک دوسرے سے کچھ بھی نہیں چھپا پاتے تھے۔اُن کی کوئی اولاد نہ تھی۔فاروقی انکل ریٹائر ہونے کے بعد ٹیوشن کرتے اور نجمہ خالہ بچوں کو گھر پر پڑھاتی تھیں۔بابا جان کے جانے کے بعد اُن کی بیٹھک بھی ویران ہو گئی تھی۔مرزا صاحب کے گھر میں اُن کی بہوؤں کی حکومت تھی وہاں آزادی سے شطرنج کھیلنا یا رات گئے تک محفل جمانا ممکن نہ تھا۔فاروقی انکل اور نجمہ خالہ کے تصرف میں آدھا مکان تھا جو صرف تین چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا باقی حصہ مالک مکان کے کسی رشتہ دار کے قبضہ میں تھا۔اُن کے ہاں بھی اتنی گنجائش نہ تھی۔چاچا سائیں کہتے اب کراچی میں کس کے لیے آؤں گا۔تمہارے بابا جان کے ساتھ مرزا اور فاروقی سے بھی میری دوستی کافی گہری ہو چکی تھی۔اس عمر کی رفاقتیں اور دوستیاں آسانی سے نہیں چھوٹا کرتیں۔عمر کے ساتھ ہی ختم ہوتی ہیں۔اسی بیٹھک میں ہماری محفلیں جمتی تھیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹا کرتے تھے۔اب شاید وہ بات نہ رہے۔

ڈرائنگ روم میں ایک تناؤ زدہ سکوت پھیلا ہوا تھا۔وہ اپنا فیصلہ سنا چکی تھی۔یہ گھر اور اس گھر کی کوئی چیز فروخت نہیں کی جائے گی۔باقی رہی جائیداد اور فیکٹری کی بات اُن کا جو چاہیں آپ لوگ کریں۔عابد بھائی، وقار، عاصم اسے

سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے تھے۔آخراس گھر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ یہاں کون رہے گا اور یہاں کون آئے گا؟ اس نے کہا ان سارے سوالوں کے جواب میرے پاس ہیں مگر آپ لوگ نہیں سمجھیں گے اس لیے آپ سے کچھ نہیں کہنا مجھے۔

وہ تینوں بھائی جا چکے تھے۔صبح کی اذان کی آواز سے آرزو کی آنکھ کھلی اُس نے وضو کیا۔ماں جان کی جائے نماز بچھائی اور نماز ادا کی۔باہر باغیچے میں آتے ہی ہوا کی تازگی اس کی سانسوں میں اترتی گئی۔چنبیلی کی بیل پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی اُس نے ڈھیر سارے پھول توڑ کر جمع کیے اور خود بخود اُس کے قدم بابا جان کے کمرے کی جانب بڑھ گئے تپائی پر چاندی کی وہی کٹوری رکھی تھی جس میں ماں جان پھول رکھ دیتی تھیں اُس نے پھولوں کو اس کٹوری میں رکھا اور جیسے ہی باہر آئی برآمدے میں بچھی کرسیوں پر نجمہ خالہ اور فاروقی انکل بیٹھے نظر آئے۔سامنے میز پر چائے کی پیالیوں میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔"آؤ بیٹا چائے پیوگی؟" نجمہ خالہ پوچھ رہی تھیں۔"بالکل" اس نے خوشدلی سے کہا۔آج بہت عرصہ بعداس کے چہرے پر تازگی لوٹی تھی۔شام ہوئی اور بابا جان کی بیٹھک کا دروازہ کھل گیا۔مرزا صاحب چاچا سائیں اور فاروقی انکل کے ساتھ شطرنج کی بساط بچھی اور کمرے کے درودیوار نے بہت عرصہ بہت آوازوں کا شور سنا۔ وہ باورچی خانہ میں کھڑی چائے بنوا رہی تھی۔جمیل نے ٹی کوزی سے کیتلی کو ڈھا کا اُس نے جلدی جلدی ٹرے میں شامی کباب اور پلیٹیں رکھیں اور بیٹھک میں بھجوادیں۔اب یہ گھر نجمہ خالہ اور فاروقی انکل کے سپرد تھا۔آرزو نے انہیں بڑی مشکل سے یہاں منتقل ہونے پر آمادہ کیا تھا۔آخر جب میں ہر سال بچوں کے ساتھ آؤں گی تو کہاں ٹھہروں گی۔اس گھر کی دیکھ بھال کے لیے کوئی تو ہونا چاہیے اس گھر سے اور اس گھر کی چیزوں سے بابا جان اور ماں جان کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔آپ دونوں یہاں رہیں گے تو یہ گھر آباد رہے گا۔اسی طرح جیسے پہلے تھا۔بابا جان کی بیٹھک ویران نہیں ہوگی۔فاروقی انکل،مرزا انکل اور چاچا سائیں کی دوستی جو اس گھر کی چار دیواری سے شروع ہوئی تھی اور اس گھر میں پروان چڑھی تھی میں اس دوستی کو اس گھر کی طرح اجڑتے نہیں دیکھ سکتی۔اور بابا جان کے ورثہ کو ان کی یادوں کے ورثہ کو میں نہیں بکھیرنے دوں گی۔مجھے اسے سنبھالنا ہے۔

اور آج آرزو واپس جا رہی تھی۔فاروقی انکل، نجمہ خالہ، مرزا صاحب اور چاچا سائیں اسے ائرپورٹ چھوڑنے آئے۔وہ سب آبدیدہ تھے چاچا سائیں نے اسے الوداع کہتے ہوئے کہا "لوگ کہتے ہیں بیٹے وارث ہوتے ہیں۔ماں باپ کے ورثہ کو سنبھالتے ہیں۔پر میں کہتا ہوں بیٹیاں زیادہ دردمند ہوتی ہیں وہ ورثہ کی مالک ہوں نہ ہوں محافظ ضرور ہوتی ہیں محبتوں کی، جذبوں کی،قدروں کی اور یادوں کی امین یادوں کے ورثہ کی آمین۔

☆

۔ مشورہ ۔

زیست کو بوجھ کی مانند لئے پھرتا ہوں
نااُمیدی سے بھی اُمّید لگا رکھی ہے
ایسا لگتا ہے مقدّر میں اندھیرا ہے مِرے
پھر بھی اک آس کی قندیل جلا رکھی ہے

○

میری قسمت میں نہیں صبح درخشاں کوئی
میری تقدیر میں سائے ہیں سِیہ راتوں کے
میری معراج اُداسی ہی اُداسی ہے فقط
اور چند اُلجھے فسانے ہیں مُلاقاتوں کے

○

میرے ہاتھوں کی لکیریں بھی ہیں دُھندلی دُھندلی
میرے ماتھے کی شِکن سے ہے نُمایاں اُلجھن
اور میری شکل بھی لگتی ہے پرائی مجھکو
گرد آلود مِری سوچ کا ہر اک درپن

○

میرے محسن مِرے ہمدم، میرے محبوب کبھی
تجھکو میں پیار کی سوغات نہیں دے سکتا
اپنی مجبوری کا اظہار تو کر سکتا ہوں
تجھکو میں اپنے جذبات یہ نہیں دے سکتا

○

وقت ہے اب بھی کوئی راہ الگ اپنالے
مجھکو ہے ڈر کہ مِرے ساتھ نہ چل پائیگا
غم کی جس آگ میں جلنا ہے مقدّر میرا
آگ میں ایسی تُو اے دوست نہ جل پائیگا

○

مشورہ مان لے میرا کہ بھُلا دے مجھکو
اپنی بے تاب محبت سے کنارہ کر لے
ورنہ ممکن ہے بھٹک جائے اندھیروں میں کہیں
اس سے پہلے ہی اُجالوں میں ٹھکانہ کر لے

○

نیاز جیراجپُوری
(اعظم گڑھ بھارت)

کالے گورے لوگ

احسان احمد شیخ (راولپنڈی)

''بے بے۔بس کر۔کبھی کوئی اور بات بھی کرلیا کر۔''

غفورے نے پیچھے مُڑے بغیر تنگ آ کر ماں کو جواب دیا۔ساتھ ساتھ ایک ہاتھ سے چارہ کاٹنے والی مشین کا ہینڈل چلاتا اور دوسرے ہاتھ سے چارے کے بنڈل کوسنبھالتا رہا۔

''اچھا اچھا۔آرام سے چارہ کاٹ۔کہیں مشین میں ہاتھ نہ دے ڈالنا''

بے بے نے ایسے اداس لہجے میں جواب دیا کہ غفورے کو شرمندگی محسوس ہونے لگی۔اُس نے مڑ کر دیکھا۔ بے بے ٹوٹی ہوئی بان کی پٹی پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔اُس کا جھکا ہوا سر بتا رہا تھا کہ آج وہ پھر اپنے بیٹے کے آگے ہار مان گئی ہے۔غفورے نے مشین کو روکا اور کاندھے پر پڑے پرنے سے ہاتھ پونچھتا ہوا بے بے کے قدموں میں آ بیٹھا۔

''بے بے۔تو سمجھتی کیوں نہیں۔شہروں کی ہوا اب گاؤں گاؤں پہنچ گئی ہے''اُس نے دونوں ہاتھ اپنی ماں کے گھٹنوں پر رکھ دیئے۔

''آج کل گاؤں کی لڑکیاں بھی بھیڑ بکریوں کی طرح کسی کے بھی ساتھ نہیں چل پڑتیں۔صورت شکل دیکھتی ہیں۔رنگ دیکھتی ہیں۔گھر آنگن اُنہیں بڑا اچاہیے۔گھر میں چار پیسے چاہئیں''

بے بے نے سر اٹھا کر ایک لمحے کو اپنے بیٹے کو دیکھا اور پھر سبزی کاٹنے میں مشغول ہوگئی جیسے اُسے غفورے کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ویسے بھی یہ کون سی نئی باتیں تھیں۔آئے دن یہی بحث بحثی چل رہی ہوتی تھی۔

''اب تُو ہی بتا''غفورے نے تھوڑا سا انتظار کیا اور بے بے کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر پھر شروع ہوگیا۔

''یہ جو چھوٹی ماسی کی بیٹی اللہ رکھی کی بات کر رہی ہے پچھلے پندرہ دن سے تُو میرا اُس کا کوئی جوڑ ہے؟''

کیوں کیا خرابی ہے اُس کُڑی میں؟''بے بے نے چھری چھابے میں رکھ کر سبزی کھاٹ پر رکھ دی اور مقابلے پر اُتر آئی۔

''بے بے۔خدا کو مان'غفورا زچ ہوگیا۔''خرابی اس میں نہیں مجھ میں ہے۔ہمارے گھر بار میں ہے۔''

''ارے کیا خرابی ہے میں بھی تو سنوں''

''دیکھ خالو دبئی میں بیس سال گزار کر آیا ہے''غفورے نے ہاتھ کی انگلیاں پھیلا کر اپنی ایک ایک بات گنوانا شروع کر دی۔

''اُن کا گھر پکا ہے۔ہر کمرے میں پنکھا لٹک رہا ہے چھت میں۔ٹی وی بھی رنگ والا ہے۔بڑھیا زیور ہے۔خوبصورت کپڑے ہیں اور پیسہ بھی ہے۔''

غفورا سانس لینے کو رُکا اور نظر اٹھا کر بے بے کو دیکھا تو اُس کی باتوں کا کوئی اثر ہوا یا نہیں۔بے بے نے تیوری چڑھا کر بیٹے کو دیکھا اور سبزی کا چھابا پھر اپنی گود میں رکھ لیا۔یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ بے بے پر اس بحث کا کوئی اثر نہیں ہوا۔غفورے نے ہاتھ بڑھا کر چھابا بے بے کی گود سے اٹھا کر کھاٹ پر رکھ دیا۔

''پھر میری شکل دیکھ۔کالا رنگ، موٹی ناک، موٹے موٹے ہونٹ''

''بکواس نہ کر''بے بے نے پہلی بار اپنی آواز بلند کی۔ ماتا کی ماری ماں اپنے لعل کی برائی کیسے سنتی چاہے خود بیٹے ہی کی زبان سے ہو۔

''مرد کا رنگ روپ کون دیکھتا ہے۔کماؤ اور شریف ہونا چاہیے۔تُو کھیت سنبھالتا ہے۔بازار میں دودھ بیچ آتا ہے۔کوئی بری عادت نہیں تجھ کو''

''مگر بے بے۔ تجھے پتہ ہے نا۔تین سال پہلے اللہ رکھی نے خود اپنی منگنی تڑوا دی تھی کیونکہ اس کا منگیتر کالا تھا۔میری طرح''

''ہاں اور پورے گاؤں۔ پوری برادری میں تھُو تھُو بھی ہوئی تھی۔ تین سال ہو گئے کوئی رشتہ ڈالنے نہیں آیا تیری ماسی کے گھر''

''مگر بے بے۔۔۔۔''

''اب زیادہ اگر مگر نہ کر''بے بے نے اُس کی بات بیچ سے ہی اُچک لی۔''آپس کی بات ہے۔خبردار۔کسی سے نہ کہنا''

''کیا؟''

''تیری ماسی پچھلے دس دن میں دو بار آئی ہے ہمارے گھر۔تُو تو کھیت میں ہوتا ہے یا بازار میں۔اُس نے باتوں باتوں میں اشارہ دیا ہے کہ وہ اللہ رکھی کو تجھ سے بیاہ دے گی۔آخر کو میری بہن ہے۔بیٹی کی ماں ہے۔کب تک بٹھائی گی لڑکی کو اپنے گوڈوں سے لگا کر''

''اچھا ماں۔ میں بازار جا رہا ہوں۔ دودھ پہنچانا ہے''غفورا لاجواب سا ہو کر اٹھ گیا۔جب وہ سائیکل کے دونوں طرف دودھ کے ولٹوئے لٹکا رہا تھا تو جانے کیوں اسے اللہ رکھی کا خیال آ گیا۔وہ بچپن سے اُسے بڑھتا دیکھ رہا تھا۔اُس سے پانچ سال چھوٹی تھی مگر رنگ روپ ایسا کہ نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ بھُورے بالوں کی ایک لٹ ہمیشہ دائیں گال پر لٹک رہی ہوتی جس سے اُس کی دائیں آنکھ تھوڑی سی چھپ جاتی اور وہ منہہ سے زور سے پھونک مار کر بال چہرے سے ہٹا کر جب غفورے کو دیکھتی تو اُس کی بھوری آنکھیں پھیل کر اور موٹی موٹی سی ہو جاتیں اور لگتا سفید رنگ اتنا سفید ہو گیا جیسے بدن میں خون ہی نہ ہو۔ اپنے گاؤں میں تو کیا آس پاس کے گاؤں میں بھی اللہ رکھی جیسی خوبصورت لڑکی نہ پہلے پیدا ہوئی نہ پھر کبھی ہو گی مگر اس کی منگنی کیا ٹوٹی لگا کہ گاؤں والے اس کے حُسن کو ہی بھول بیٹھے۔غفورے اور اللہ رکھی کے نانا کے بزرگ افغانستان سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے اور اُن کا سارا رنگ روپ چھوٹی ماسی اور اس کی بیٹی

میں آ گیا تھا۔ باقی ساری اولاد نے شاید نانی سے دیسی رنگ لیا تھا۔

''ارے بھائی۔ دودھ برتن میں ڈال۔ کیا سوچ رہا ہے؟''

عبدالرحیم کی آواز نے اُسے چونکا دیا جو دکان پر بیٹھا اسے گھُور رہا تھا''۔

''ہاں۔ ہاں۔ لے نا'' غفورے نے کچھ شرما کر دودھ کا برتن آگے کیا اور جیسے اُس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ عبدالرحیم گاؤں کے کڑیل خوبصورت جوانوں میں سے تھا۔ غفورے نے اسے دیکھا تو آج اُسے ایک عجیب سا خیال آیا۔ اگر اللہ رکھی اور عبدالرحیم کی شادی ہوئی ہوتی تو اُن کے بچے کتنے خوبصورت ہوتے۔ اگلے ہی لمحے اُس کو اپنی حماقت کا احساس ہوا اور اُس نے ہنس کر اپنا سر جھٹک دیا۔ بھلا اُن دونوں کی شادی کیسے ہوسکتی تھی دونوں کی برادریاں بالکل الگ اور عبدالرحیم کی شادی کو ایک سال ہوگیا تھا۔ مگر ابھی تک اُن کو بچہ کیوں نہیں ہوا کہیں اسے لئے تو نہیں کہ عبدالرحیم کی بیوی گہرے سانولے رنگ کی تھی۔ ایک بار پھر غفورے کو خیال آیا کہ بے بے کی باتیں سُن سُن کر اس کا بھیجا واقعی پک گیا ہے۔ اس نے اپنا سر دائیں بائیں ایسے ہلایا جیسے یوں اس کے دماغ میں گھُسے سارے اُلٹے خیالات پھسل کر زمین پر گر جائیں گے۔

''یار غفورے''

عبدالرحیم کی آواز نے اُسے پھر چونکا دیا۔

''یہ آج تو کدھر گُم ہے؟ خیر خیریت تو ہے''

غفورے کو عبدالرحیم کا یوں پریشان ہونا اچھا لگا۔ بچپن سے ساتھ بڑے ہوئے تھے اور اُن کی دوستی میں ان کے مختلف پیشوں یا برادریوں نے کوئی دراڑ نہیں ڈالی تھی۔

''میرے گھر تو خیریت ہے'' غفورے نے جھینپ مٹاتے ہوئے کہا مجھے تو تُو پریشان لگ رہا ہے''

''یار غفورے۔ میں تو واقعی پریشان ہوں''

''ہوا کیا؟''

''ہونا کیا تھا۔ شہروں کی طرح اپنے گاؤں میں بلکہ آس پاس کے سارے گاؤں میں ڈبّے کا دودھ اور ڈبّے کا دہی چل پڑا ہے۔ رہی سہی کسر دبئی سے لوٹنے والوں نے نکال دی ہے۔ اب تُو اپنے خالو کا گھر ہی دیکھ لے۔ بھائی غفورے سچّی بات ہے کہ اگر یہی حال رہا تو میں تو تجھ سے بھی دودھ خریدنا بند کر دوں گا۔ تُو میری بات سمجھ رہا ہے نا؟ ارے دودھ بِکے گا تو تجھ سے دودھ خریدوں گا نا!''

واپسی میں سارے راستے غفورے کو سب طرف سے پریشان کُن خیالات نے گھیرے رکھا۔ گھر میں پہلے ہی کون سی ریل پیل تھی کہ اب دودھ بِکنا بھی بند ہو جائے گا۔ کھیت سے تو سال بھر کا اپنا دانا دنکا ہی نہیں پورا ہوتا۔ اوپر سے بے بے کی شادی کرانے کی ضد۔ اُسے ان ساری باتوں کی سمجھ ہی نہیں آئے گی۔

ہوا وہی جس کا غفورے کا ڈر تھا۔ چند ہفتوں کے اندر اندر عبدالرحیم کی دودھ دہی کی دکان بند ہوگئی۔ بے بے نے غفورے کے مرے ہوئے باپ کی دھائی دے دے کر اور بَین کر کر کے غفورے کی شادی اللہ رکھی سے کرا دی۔ دودھ دینے والے جانور بک گئے اور کھیت کی زمین گروی رکھ کر شادی کے خرچے کیلئے ادھار لینا پڑ گیا۔

اس سارے چکر میں غفورے کا تو جیسے بھیجا ہی پک گیا۔ اللہ رکھی کا شیشے جیسا انگ بھی اس کے دماغ میں لگی آگ کو نہ بجھا سکا۔ وہ اور عبدالرحیم روز گاؤں کی چوپال سے کوئی بس پکڑتے اور کبھی ایک قصبے کبھی ایک شہر چکّر لگا کر تھکے ہارے رات گئے اپنے اپنے گھر پہنچتے اور صبح سویرے پھر نکل پڑتے کئی دن یوں ہی گزر گئے آخر ایک رات غفورے نے زور زور سے دروازہ پیٹ کر بے بے کو آوازیں لگائیں۔ خبر یہ تھی کہ غفورے اور عبدالرحیم کو کسی ٹھیکیدار کے ہاں نوکری مل گئی ہے۔ رہنے کو ایک کمرے کا کوارٹر بھی کر لیا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ شہر کے ہوٹلوں میں کھانا بڑا مہنگا ہے بیویوں کو ساتھ لے جانا پڑے گا۔ بے بے نے اور عبدالرحیم کے ماں باپ نے جھجکتے جھجکتے اجازت دے ہی دی کہ کوئی رستہ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔

شہر پہنچ کر پہلی مشکل تو یہ پڑی کہ رہنے کے لیے جو کوارٹر ملا اُس میں صرف ایک کمرہ اور چھوٹا سا صحن تھا۔ صحن میں ہی ایک غسلخانہ اور ایک چھوٹا باورچی خانہ۔ کچھ برتن بھانڈے اور بسترے تو ساتھ لے آئے تھے۔ تین چارپائی دونوں مرد بازار سے خرید لائے۔

''مگر ہم تو چار ہیں'' دونوں عورتیں ایک ساتھ چیخیں۔

''دیکھو۔ اس وقت تو ہم دونوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تم دونوں عورتیں ایک چارپائی پر کمرے میں سویا کرو گی۔ شہر کا نیا نیا معاملہ ہے عورتوں کا صحن میں سونا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم دونوں اپنی چارپائیاں صحن میں ڈال لیں گے۔'' دونوں عورتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنی چارپائی اٹھا کر کمرے میں چلی گئی۔

وقت گزرتا گیا بلکہ شہر میں تو وقت جیسے پَر لگا کر اُڑ جاتا ہے۔ گاؤں میں صبح صبح سورج کی پیلی پیلی روشنی ہوتے ہی ہر گھر کے صحن سے مرغ بانگ دینا شروع کر دیتے ہیں۔ مرد پانی کا چھپا کا منہہ پر مار کر رات کا سالن روٹی کھا کر کھیت چلے جاتے یا دکان کھول لیتے شام تو اتنی دیر سے ہوتی جیسے آج رات آئے گی ہی نہیں۔ شہر میں تو سب کچھ ایسے جلدی جلدی ہوتا کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب ناشتہ ہوا اور کب رات کا کھانا۔

ایک دِقّت یہ ہوئی کہ غفورے اور عبدالرحیم کی مزدوری کا وقت الگ الگ تھا۔ ایک صبح جا کر دوپہر واپس لوٹتا تو دوسرا دوپہر کو نکل کر رات کو لوٹتا۔ دونوں عورتیں زیادہ وقت تو ساتھ ساتھ رہتیں مگر ایسا بھی ہوتا کہ عبدالرحیم گھر لوٹا تو پتہ چلا اس کی بیوی باہر سودا لینے گئی ہے کبھی غفورا آتا تو اللہ رکھی بازار گئی ہوتی۔

شروع شروع میں تو یہ سب کچھ بڑا اُٹ پٹا سا لگتا مگر آہستہ آہستہ جیسے شہر میں رہنے کے دوسرے طریقے آ گئے اس کی بھی عادت ہوگئی۔ مگر غفورے کو لگا جیسے اللہ رکھی شہر آ کر سب لوگوں سے پہلے شہر والی ہوگئی ہے اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی سرخی، ہونٹوں پر لالی اور بدن پر پاؤڈر ہمیشہ نظر آتے حالانکہ غفورے نے اُسے کہا بھی کہ اس کی خوبصورتی دیکھ کر اسے ان سب چیزوں کی ضرورت ہی نہیں مگر اللہ رکھی اپنی ہی دنیا میں مگن رہی اور جس کو واقعی سرخی پاؤڈر کی ضرورت تھی وہ پہلے سے بھی زیادہ بجھی بجھی سی نظر آنے لگی۔ کبھی کبھی غفورے کا دل کرتا کہ وہ عبدالرحیم سے پوچھے کہ اُس کی بیوی بیمار تو نہیں مگر پھر اُس نے اپنے آپ کو روک لیا کہ شاید وہ اپنے کالے رنگ کو لے کر اللہ رکھی کے سامنے بجھی بجھی سی رہتی ہو۔

قدرت کا نظام ایسا مکمل ہے کہ ہر مشکل اپنا راستہ خود نکال لیتی ہے۔ ان دونوں دوستوں کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ بنا کسی کے بات کئے دونوں جوڑوں نے ایک نظام بنا لیا رات کو لالٹین ویسے ہی بجھا دی جاتی تھی کہ مٹی کا تیل بھی پٹرول کی طرح مہنگا ہوتا جا رہا تھا۔ اس گھُپ اندھیرے میں اگر غفورے کو ضرورت ہوتی تو وہ ہلکا سا کھانس دیتا اور اللہ رکھی چپکے سے اس کے پاس آ جاتی۔ یہی ترکیب عبدالرحیم کرتا۔

شہر آئے کئی مہینے ہوگئے اس دوران وہ گاؤں کے چکر بھی لگا آئے اور گھر والوں کو پیسے بھی پہنچا دیئے۔ اب ساون کا موسم شروع ہوا تو بادل ایسے آئے اور اتنا گرجے کہ لگا سارا شہر ہی جل تھل ہو جائے گا مگر وہی بات کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ اس رات سب کچھ جلدی ہی سونے چلے گئے۔ یوں بھی اللہ رکھی کو ہلکی ہلکی سی کھانسی آ رہی تھی۔

کچھ رات گزری تھی کہ غفورے کی آنکھ عبدالرحیم کے ہلکے سے کھانسنے سے کھُل گئی۔ کچھ ہی دیر میں ایک سایہ سا کمرے کی طرف سے آیا اور عبدالرحیم کے بستر میں چلا گیا۔ غفورے کے ہونٹوں پر نہ چاہتے ہوئے بھی ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی اور اس نے کروٹ لے کر اپنا منہہ دوسری طرف کر لیا۔ ابھی غفورے کی آنکھ لگنے ہی لگی تھی کہ اُس کو عبدالرحیم کے پلنگ سے عورت کے کھانسنے کی آواز آئی مگر......مگر...... یہ کھانسی کی آواز تو عبدالرحیم کی بیوی کی نہیں تھی۔ غفورے کو بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ اُس نے جھٹکے سے چادر ہٹا کر کروٹ لی ہی تھی کہ آسمان پر بجلی ایسے زور سے چمکی کہ سارا صحن ایک لمحے کو روشن ہو گیا۔ غفورے نے دیکھا کہ عبدالرحیم کے بستر پر جو عورت ہے اس کا رنگ روپ ایسا ہے کہ نظر نہ ٹھہرے بھورے بالوں کی ایک لٹ دائیں گال پر ایسے لٹک رہی تھی کہ اُس کی دائیں آنکھ تھوڑی سی چھپ گئی تھی۔ بجلی کی چمک کے ساتھ جب اس کی بھُوری آنکھیں غفورے کی آنکھوں سے ٹکرائیں تو پھیل کر اور موٹی موٹی سی ہوگئیں اور سفید رنگ تو اتنا سفید ہو گیا جیسے بدن میں خون ہی نہ ہو۔ اگلے ہی لمحے بادل اس زور سے گرجے جیسے بم کا دھما کہ ہو۔ پھر ہر طرف گھُپ اندھیرا چھا گیا۔

غزل

مجبوری، لاچاری لِکھ
ہاں رُودار ہماری لِکھ

غیروں کو الزام نہ دے
اَپنوں کی عیّاری لِکھ

سوچ جو ہلکی ہے تو کیا!
غزلیں بھاری بھاری لِکھ

عَیب نہ گِنوا اَوروں کے
اپنی کار گذاری لِکھ

پہلے جھوٹے وعدے کر
پھر اپنی لاچاری لِکھ

چاہے حقیقت کُچھ بھی ہو
اپنا پلڑا بھاری لِکھ

اُجڑے گھر کے آنگن میں
ہری بھری پھُلواری لِکھ

ہر مَنصب، ہر عہُدے پَر
اپنی دعوے داری لِکھ

بے لباس کر دے اُس کو
بعد میں ''اَبلا ناری'' لِکھ

مات پِتا کو دے بَن باس
خُود کو آ گیا کاری لِکھ

چاؔند کی خصلت میں یارب!
کُچھ تو دُنیا داری لِکھ!

○

مہندر پرتاپ چاؔند (انبالہ بھارت)

پت جھڑ کے بعد

ڈاکٹر رینو بہل (چنڈی گڑھ، بھارت)

لان میں بچھی آرام کُرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی اُس نے پھولوں سے لدی کیاریوں کو نہارا۔ آج بھی رنگ برنگے پھول ویسے ہی کھلے ہیں۔ آج بھی ان کی دیکھ بھال ویسے ہی ہوتی ہے جیسے موہنی چاہتی تھی۔ خوش نما پھولوں کی محفل جوہی، چنبیلی، گلاب، رات کی رانی، بگین بیلیا، گیندا اور نرگس سے سجی ہوئی تھیں۔ موہنی تو رات کی رانی کی خوشبو کی دیوانی تھی۔ ان پھولوں کو دیکھتا تھا تو موہنی کا چہرہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا۔ جب رات کی رانی کی خوشبو رات کے سناٹے میں اس کے کمرے تک کو مہکا دیتی تو اُسے موہنی کا وجود اپنے پاس ہونے کا احساس ہوتا۔ وہ تو خوشبو کی طرح اس کی نس نس میں پھیل گئی تھی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ لان میں ہی آ بیٹھتا تھا۔ سردیوں کی نرم دھوپ اُس کی بوڑھی ہڈیوں کو سینک دینے کا کام کرتی اور اُسے لگتا اُس کی ہڈیوں کی ٹکور ہو رہی ہے۔ آرام ملتے ہی اُس کی آنکھیں موندنے لگتیں اور وہ کُرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی سُستا لیتا۔ اپنے کمرے میں جا کر بستر پر آرام کرنا اُسے قطعی پسند نہ تھا۔ جیسے جیسے دھوپ وہاں سے پھسلتی جاتی اُس کا وہاں بیٹھنا دُشوار ہوتا جاتا۔ پھر وہ وہاں سے اُٹھ کر دھیرے دھیرے اپنے کمرے میں آ جاتا۔ کمرے میں آتے ہی تنہائی کا احساس اُسے ستانے لگتا اور وہ گھبرا کر ٹی وی آن کر دیتا۔ ٹی وی کی آوازیں اُسے تنہائی کی کیفیت سے کچھ راحت فراہم کرتیں۔ جب اُس نے اتنی بڑی کوٹھی بنوائی تھی تو ماسٹر بیڈ روم ایک کونے میں بنوایا تھا تا کہ اُس کے آرام میں خلل نہ پڑے اور آج اسی کونے نے اُسے سب سے الگ کر دیا۔ اپنے کمرے میں بیٹھے اُسے کِسی کے آنے جانے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ بیٹا کب آتا ہے، بہو کب جاتی ہے اور کوئی اُس کے پاس آنے کی زحمت بھی نہیں کرتا۔ کسی کے پاس وقت ہی نہیں ہے سبھی زندگی کی دوڑ میں شامل ہیں۔ اور اُس کے پاس تو وقت ہی وقت ہے اُوپر سے کرنے کو کچھ بھی نہیں۔ گھر میں اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ بالکل تنہا ہے۔ البتہ ایک نوکر ضرور ہے جو وقت پر کھانا دوائی دے دیتا ہے مگر بات کرنے کا وقت اُس کے پاس بھی نہیں۔ جب تک موہنی اُس کے ساتھ تھی وہ مالک تھا گھر کے راجا کی طرح جیتا تھا۔ موہنی کے ہاتھوں میں اِس گھر کی باگ ڈور جو تھی۔ جوان بیٹا بھی اپنی کمائی ماں کے ہاتھ پر رکھتا تھا۔ کیا مجال بیٹے یا بہو کی جو اُس کے کسی فیصلے کی مخالفت کریں۔ مخالفت تو کبھی اُس نے بھی نہیں کی تھی بیوی کے کسی فیصلے کی۔ موہنی تھی ہی اتنی سلجھی اور سمجھدار کہ اُس نے کبھی کسی کو شکایت کا موقع ہی نہیں دیا۔ اُس نے اس سلیقے سے گھر چلایا کہ دونوں بیٹے آج کامیاب زندگی گزار رہے ہیں اور رہنے کا اتنا بڑا مکان۔

بلدیو راج اور موہنی نے اپنی شادی شدہ زندگی کی شروعات دو کمروں کے فلیٹ سے کی تھی۔ موہنی کے قدم اُس کی زندگی میں پڑتے ہی اُس کے گھر میں لہر بہر ہو گئی۔ محنتی تو وہ تھا ہی اوپر سے قسمت نے بھی بڑا ساتھ دیا۔ وہ جو بھی کما کر لاتا، آ کر موہنی کو تھما دیتا۔ اُس کا سوچنا تھا کہ گھر کی لکشمی کے پاس ہی گھر کا خزانہ ہونا چاہیے۔ اس سے گھر میں برکت رہتی ہے۔ جب اُن کے گھر پہلی اولاد نے جنم لیا تو گھر میں بہار آ گئی۔ اب اُسے یہ فلیٹ چھوٹا لگنے لگا تھا۔ جب دیپک چھوٹے چھوٹے قدموں سے گھر میں بھاگتا تو کسی نہ کسی چیز سے ٹکرا کر گر جاتا۔ ننھی سی جان چوٹ لگنے سے رو رو کر گھر کو آسمان پر اُٹھا لیتی۔ ماں پیار سے سینے سے لگا لیتی اور تھپکی دے کر چُپ کرانے لگتی اور اگر یہ سب باپ کی موجودگی میں ہوتا تو وہ خود کو کوسنے لگتا۔ اُس کے چہرے پر ناگواری کے تاثر دیکھ کر وہ بھانپ جاتی کہ وہ خود سے خفا ہے۔ اُسے تسلی دیتے ہوئے کہتی:

''بچہ شرارت کرے گا تو چوٹ بھی لگے گی۔ گر گر کر ہی تو بڑا ہو گا۔ آپ کیوں پریشان ہوتے ہو۔''

''کیسا باپ ہوں میں اپنی اولاد کو کھلا آنگن بھی نہیں دے سکتا کھیلنے کو۔''

''کوئی بات نہیں بھگوان نے چاہا تو وہ بھی مل جائے گا۔ آپ بس حوصلہ رکھو۔''

عموماً مرد اپنی بیوی کو جاہل، بے وقوف سمجھتے ہیں مگر وہ ایسا نہ تھا۔ بیوی کی باتوں سے اُسے بہت تسلی ملتی۔ اُس کے مشورے کے بغیر وہ کچھ نہ کرتا۔ آنکھ موند کر اُس پر یقین کرتا تھا۔ موہنی اُس کی سب سے بڑی کمزوری بھی تھی اور طاقت بھی۔ چراغ کی پیدائش سے پہلے ہی وہ بڑے فلیٹ میں منتقل ہو چکے تھے۔ اُس کا کاروبار بھی اچھا چل رہا تھا اور وہ اُسے اور زیادہ پھیلانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا تا کہ وہ اپنی بیوی اور دونوں بچوں کو دنیا کا ہر سکھ دے سکے۔ موہنی نے بھی شادی کے بعد پلٹ کر کبھی اپنے مائیکے والوں کو نہ دیکھا۔ اُس کی تو بس چھوٹی سی دنیا پتی اور دونوں بیٹوں کے ارد گرد سمٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی اس کائنات میں خوش بھی تھی۔

دیپک نے ایم۔ بی۔ اے کیا تو اُسے ملٹی نیشنل کمپنی میں نوکری مل گئی۔ ماں باپ تو یہ ہی چاہتے تھے کہ وہ اپنے کاروبار میں اُن کا ہاتھ بٹائے مگر دیپک اپنی الگ پہچان بنانا چاہتا تھا۔ بلدیو راج نے آج تک اُس کی کوئی بات نہیں ٹالی تھی، بڑے لاڈ پیار سے اُسے پالا تھا۔ بیٹے کی اس خواہش کے آگے اُس نے سر خم کر دیا مگر موہنی نے اس کی خوب مخالفت کی۔

''کیا کمی ہے ہمارے پاس جو اُسے دوسرے کی نوکری کرنی پڑے۔ ایم۔ بی۔ اے اس لئے کروائی تھی کہ اپنے کاروبار میں کام آ سکے۔''

''مان جاؤ موہنی اگر وہ نوکری کرنا چاہتا ہے تو بُرا ہی کیا ہے''۔

''آج وہ نوکری پر جائے گا کل وہ ہمیں چھوڑ کر دوسرے شہر پھر دوسرے ملک چلا جائے گا۔ اگر ایک بار وہ گھر سے چلا گیا تو بس مہمان بن کر ہی آئے گا۔''

''ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا جیسا تم سوچ رہی ہو۔ کچھ سال نوکری کا شوق پورا کر کے لوٹ آئے گا۔''

''آپ غلط سوچ رہے ہو۔ ایک بار جو پرندہ اپنا گھونسلہ چھوڑ کر جاتا ہے وہ نیا گھونسلہ ہی بناتا ہے لوٹ کر نہیں آتا''۔

''وہ ہمارالختِ جگر ہے کوئی پرندہ نہیں''۔

''خیر بحث سے کیا فائدہ یہ تو وقت ہی بتائے گا''۔

ہمیشہ کی طرح موہنی صحیح نکلی۔ دیپک کو چار مہینے بعد ہی کمپنی والوں نے امریکہ بھیج دیا اور وہ وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ سال بعد جب وہ لوٹا تھا ساتھ میں اس کی ایک امریکن دوست بھی تھی۔

لثیرسا جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا اور رشتے پر ماں باپ کی مُہر بھی چاہتا تھا۔ ماں پر جب اپنی خواہش ظاہر کی تو موہنی سے رہا نہ گیا۔

''تجھے کوئی ہندوستانی لڑکی پسند نہیں آئی؟ یہ شادی سے پہلے لڑکی کو لے کر ادھر آنے کی تو نے سوچی کیسے؟''

''ریلیکس ماں۔ ہم دونوں ایک ہی اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔ آج نہیں تو کل شادی کر ہی لیں گے بس تم ہاں کر دو''۔

''اگر میں منع کر دوں تو کیا شادی نہیں کرے گا؟''۔

''ہرگز نہیں''۔

''اور پھر ایک ساتھ بنا شادی کے رہنا اور اس طرح اُسے لے لے کر گھومنا یہ سب کیا ہے؟''

''سب چلتا ہے ماں۔ میں نے اُسے صاف لفظوں میں بتا دیا ہے کہ اگر ماں نے انکار کر دیا تو یہ شادی ممکن ہی نہیں۔''

''تُو بہت چالاک لڑکا ہے جانتا ہے تیری ماں کسی بھی لڑکی کے ساتھ ایسا نہیں کرے گی۔ چاہتی تو میں تھی کہ اپنی پسند کی لڑکی کے ساتھ پورے رسم و رواج سے اپنے بیٹے کا سہرا باندھوں مگر یہ میم''۔

میم ہے تو کیا ہوا۔ شادی تو پورے رسم و رواج کے ساتھ آج بھی ہو سکتی ہے۔ تُو جب کہے میں سہرا باندھ لوں گا'' یہ کہہ کر وہ ماں سے ننھے بچے کی طرح لپٹ گیا پھر ماں کی ممتا کو پگھلنے میں وقت ہی نہیں لگا۔

دس دنوں کے اندر دیپک کے سر پر سہرا سجا تھا اور لثیرسا لال لہنگا چولی پہنے اگنی کے سامنے سات پھیرے لے رہی تھی۔ پورا گھر دُلہن کی طرح سجا تھا دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ماں باپ کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ماں نے دلہن کے ابھی چاؤ بھی پورے نہیں کئے تھے کہ اُن کے لوٹنے کا وقت آ گیا۔

فون کی گھنٹی بجی تو بلدیو راج خوابوں کی دنیا سے لوٹ آیا۔ کب باہر اندھیرا ہو گیا اور کب نوکر آ کر کمرے کی بتی جلا گیا اُسے پتا ہی نہ چلا۔ اکثر وہ بیٹھے بیٹھے ماضی کے جنگل میں کھو جاتا تھا بھٹکتے بھٹکتے وہ کہاں سے کہاں نکل جاتا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر فون اُٹھایا:

''ہیلو''

''راج کیسا ہے یار؟''

ایک مدت بعد اپنے دوست کی آواز سن کر وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

''سکسینا یار تو کہاں کھو گیا تھا؟ آج میری یاد کیسے آ گئی۔ کہاں ہوتا ہے آج کل؟''

''یار اتنے سوالوں کا ایک ساتھ جواب دینے کی اب قوّت نہیں رہی۔ بہت مشکل سے تجھے تلاش کر پایا ہوں۔ میرے پاس تو تیرے پرانے گھر کا پتا ہی تھا۔''

''تُو تو باہر چلا گیا تھا اپنے بیٹوں کے پاس کب لوٹا؟''

''تیری ہر بات کا جواب دوں گا۔ بتا کل ملے گا صبح گیارہ بجے اُسی جگہ۔ بھُلا تو نہیں وہ جگہ؟''

''یاد ہے سب یاد ہے۔ یہ بات اور ہے کہ اب گھر سے نکلنا بند کر دیا ہے۔''

''کل آ رہا ہے کہ نہیں؟''

''صبح گیارہ بجے وہی کافی ہاؤس۔ ٹھیک''۔

''بالکل ٹھیک میں تیرا انتظار کروں گا''۔

کھانا کھانے کے بعد وہ دیر رات چراغ کی گاڑی کا انتظار کرتا رہا۔ چراغ شاید آج بھی دیر سے لوٹے یہ ہی سوچ کر وہ بستر پر سونے کی تیاری کرنے لگا۔ ایک مدّت ہوئی نیند سے رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ موہنی کا ساتھ کیا چھُٹا اُس کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔ در و دیوار کو دیکھتے کبھی زندگی کے اوراق پلٹتے رات گزر جاتی۔ جب ذہن ماضی میں بھٹک بھٹک کر تھک جاتا تو چُپکے سے نیند اُسے اپنے آغوش میں لے لیتی۔ اُسے یاد آیا کہ دیپک اور لثیرسا کے چلے جانے کے بعد گھر میں ویرانی چھا گئی تھی۔ چراغ نے پڑھائی ختم کی تو اُس نے کاروبار میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے اُس نے بخوبی ساری ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ اب بلدیو راج گھر بیٹھے بیٹھے ہی کام کرتا۔ زیادہ سے زیادہ وقت اب وہ موہنی کے ساتھ ہی بتاتا۔

''ساری عمر تو بھاگتے بھاگتے ہی کٹ گئی۔ اب وقت ملا ہے تمہارے ساتھ گزارنے کا''۔

''چراغ کی شادی کے بعد ہم دونوں کہیں گھومنے چلیں گے۔ مجھے تو یاد بھی نہیں ہم کب گئے تھے گھومنے''۔

''دیپک بُلا رہا ہے اُسی کے پاس جائیں گے۔ اسی بہانے بچوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی اور اپنی آنکھوں سے اُن کی گھر گرہستی دیکھ کر تسلی کر لینا''۔

موہنی نے اپنی پسند کی لڑکی سے چراغ کی شادی کروا دی۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی مگر کمی تھی تو بڑے بھائی اور بھابی کی۔ دیپک باپ بننے والا تھا اور اس موقعے پر وہ لثیرسا کو اکیلے نہیں چھوڑ کر آ سکتا تھا۔ سُنندا کے گھر آتے ہی گھر میں رونق آ گئی۔ بیٹی کی کمی تھی اُن کی زندگی میں وہ بہو نے آ کر پوری کر دی تھی۔

آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی جب چراغ کی گاڑی کی آواز نے اسے بے دار کر دیا۔ بہت بار اُس نے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اتنی دوڑ اچھی نہیں۔ کچھ وقت خود کے لیے اور اپنے بیوی بچوں کے لئے بھی نکالنا ضروری ہے مگر اُس کے سر پر تو پیسا کمانے کا' کاروبار بڑھانے کا جنون سوار تھا۔ جب تک موہنی زندہ تھی سبھی رات کا کھانا ایک ساتھ کھاتے تھے۔ موہنی کا کہنا تھا کہ جو لوگ ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں وہ ایک ساتھ ہوتے ہیں سُکھ میں بھی اور دُکھ میں بھی۔ موہنی کے جاتے ہی یہ روایت بدل گئی تھی۔ سُنندا پارٹیوں میں مصروف رہتی۔ چراغ کاروبار اور پارٹیوں سے دیر سے لوٹتا۔ بچوں کی اپنی زندگی تھی لہٰذا اس نے سوچا کہ اکیلے بیٹھ کر کھانے سے بہتر ہے اپنے کمرے میں ہی بیٹھ کر کھانا کھا لیا جائے۔ کسی کے پاس وقت نہیں تھا دو پل آرام سے بیٹھ کر اُس سے بات کرنے کا۔ چراغ جب بھی آتا گھوڑے پر سوار آتا۔ دیپک بیٹی کی پیدائش کے بعد اس قدر مصروف ہو گیا تھا کہ مہینے میں ایک بار سے زیادہ اُس کا فون ہی نہیں آتا تھا۔ آٹھ سال پہلے اُس نے بیٹے کو دیکھا تھا جب وہ ماں کی اینتشٹی پر آیا تھا۔ لٹیر سا تو تب بھی نہیں آئی تھی۔ دس سال کی پوتی کی اُس نے صرف تصویریں ہی دیکھی تھیں کبھی اُسے اپنے پاس بٹھانے کا' اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ ایک فضول سی چیز سے زیادہ کچھ بھی نہ تھا۔ اُسے اپنی زندگی بے معنی اور بے مقصد لگنے لگی۔ اُسے اپنا وجود اس دھرتی پر بوجھ سے کم نہیں لگتا تھا۔ تنہائی نے اُس کی زندگی ویران اور بوجھل بنا دی تھی۔

ہر وقت اُس کے دل سے یہ ہی دعا نکلتی ''میرے پرماتما اب تو اُٹھا لے مجھے''۔ مانگنے سے اگر موت مل جائے تو کون جیتا ہے۔ جینا اُس کی مجبوری بن گئی۔ کسی طرح وہ دن سے رات اور رات سے دن کرتا۔ مگر جب سے سکسینا کا فون آیا تھا اُسے ایک تازہ ہوا کے جھونکے جیسا سکون محسوس ہوا۔ کوئی تو ہے اس دنیا میں جس نے اُسے یاد رکھا ہے۔

ایک مدّت کے بعد اُس نے اکیلے گھر سے باہر قدم رکھا تھا۔ سُنندا نے اسے تیار ہو کر گھر سے نکلتے دیکھا مگر نہ وہ حیران ہوئی اور نہ ہی کچھ پوچھا۔ وہ بھی بنا بتائے سڑک پر آ گیا۔ ٹیکسی پکڑی اور کافی ہاؤس پہنچ گیا۔ سکسینا اُس کا منتظر تھا۔ نظریں ملتے ہی دونوں تپاک سے گلے ملے اور پھر کونے والی اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئے۔

''یار سکسینا تیری عمر تو آگے بڑھنا ہی بھول گئی۔''

اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

''اور مجھے لگتا ہے وہ جو میرا گھر بھولی تھی اُسے تُو نے اپنا پتا دے دیا تھا۔ میں ستّر سال کا نوجوان لگتا ہوں مگر تُو اسّی سال کا بوڑھا''۔ دونوں ہنس پڑے۔

''تم تو باہر چلے گئے تھے اپنے بیٹوں کے پاس۔ کب لوٹے؟''

''ابھی چار مہینے پہلے ہی واپس آیا ہوں''۔

''چار مہینے ہو گئے اور میری یاد اب آئی؟''

''یاد تمہاری گئی ہی کہاں جو لوٹ کر آتی۔ دراصل کچھ ضروری کام نپٹانے تھے اُسی میں مصروف رہا۔ یار زندگی اُلجھ سی گئی تھی اُسے ہی سلجھانے میں لگا تھا اور پھر تم نے بھی تو پُرانا گھر بدل لیا۔ کب بدلا؟''

''چراغ کے گھر جب دوسری اولاد ہوئی تو موہنی کہنے لگی گھر بڑا ہونا چاہیے۔ کل کو دیپک بہو اور پوتی کو لے کر آئے گا تو گھر چھوٹا ہو جائے گا۔ بات میں اُس کی وزن تھا۔ پھر بڑی کوٹھی کا من بنا لیا تو اُسے خریدنے کا ذریعہ بھی بن گیا''۔

''چلو اچھا ہے پریوار بڑھ رہا ہو تو مکان بھی بڑھا لینا چاہیے۔ بھابھی کی تو ہمیشہ سے خواہش تھی بڑے بڑے لان والی کوٹھی کی''۔

''ہاں شکر ہے اُس کی یہ خواہش پوری کر سکا یہ بات اور ہے کہ اُسے زیادہ موقع نہیں ملا اس میں رہنے کا۔''

''مجھے پتا تو چلا تھا موہنی بھابھی کے بارے پر تم سے بات کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ تجھ پر کیا بیتی ہو گی میں سمجھ سکتا ہوں۔ مگر یار ہمیشہ کون ساتھ چلتا ہے اکیلے آئے ہیں اکیلے جائیں گے۔ آج اُس کی کل ہماری باری ہے''۔

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں پر اس خلا کا کیا کروں اس تنہائی سے کیسے جان چھڑاؤں جو دن رات سائے کی طرح ساتھ لپٹ گئی ہے۔''

''موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں کتنا سچ کہا ہے چچا غالب نے''

''ہر وقت موت کی دعا کرتا ہوں مگر اب تو وہ بھی نہیں سنتی''

سنجیدہ ماحول کو کچھ ہلکا کرنے کے لیے سکسینا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے بولا:

''یار تو جوانی کے دن بھول گیا کیا؟ موت بھی کسی حسینا سے کم نہیں۔ جتنا اس کے پیچھے بھاگو گے اُتنا دھتکارے گی اور اگر تُم اُس کے وجود کو نظر انداز کر دو تو پھر دیکھنا ایک روز اچانک اُسے تمہاری یاد ستانے لگے گی۔

''جینا مجبوری بن گئی ہے ورنہ وہ مزا نہیں رہا۔ موہنی جاتے جاتے سب کچھ سمیٹ کر ساتھ لے گئی''۔

''اپنی تکلیف سے باہر نکل کر دیکھ دُنیا میں کتنا دُکھ ہے۔ ہم لوگ تو بہت خوش نصیب ہیں۔ بھگوان نے سر پر چھت دی ہے اور پیسا بھی۔ کسی کے محتاج تو نہیں ہیں۔ اُن بزرگوں کے بارے سوچ جو صرف اولاد کے رحم و کرم پر جی رہے ہیں۔ بیماری بھی لاچاری بھی جن کی تقدیر ہے۔''

''بات تو تُو ٹھیک کہہ رہا ہے مگر۔۔۔۔''

''اگر مگر کو چھوڑ یار۔ چل جینے کا انداز بدل دیتے ہیں۔ جتنی زندگی اوپر والے نے دی ہے خوشی خوشی گزاریں گے''۔

''وہ کیسے؟''

''جس دور سے تو گزر رہا ہے میں گزر چکا ہوں۔ میرے تجربے سے کوئی تو فائدہ اُٹھا۔ مشورہ دوں گا وہ بھی بالکل مفت''۔

پھر دونوں دوست دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سکسینا کی باتیں وہ غور سے سُن رہا تھا۔ کبھی کبھی دونوں قہقہہ لگا کر ہنس بھی پڑتے۔ ایک مدّت بعد وہ اس طرح کھل کر ہنسا تھا۔ اُسے تو لگا تھا کہ وہ ہنسنا بھول گیا ہے۔ جلد ہی دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے دونوں اپنے اپنے راستے نکل گئے۔ بلدیوراج گھر لوٹا تو خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔

رات دیر تک سکسینا کی باتیں اُس کے ذہن میں گھومتی رہیں۔ اپنی زندگی کے اوراق اُلٹتا رہا۔ کبھی بچوں کا بچپن، کبھی اُن کا لڑکپن، کبھی جوانی کے بھولے بسرے قصے، کبھی موہنی کے ساتھ گزرے کھٹے میٹھے حسین پل۔ پھر موہنی کا بچھڑنا، دیپک کا بھُلے سے بھی یاد نہ کرنا، چراغ کا پاس رہ کر بھی دور رہنا، ان ہی اُلجھنوں میں کروٹیں بدلتے بدلتے رات کھسکتی گئی۔ صبح کی پہلی کرن نے ساری تاریکی مٹا دی۔ اُلجھنیں ذہن سے نکال پھینکیں۔ نئے اور مضبوط ارادے کے ساتھ اُس نے بستر چھوڑ دیا۔ آج وہ خود کو بوڑھا اور کمزور محسوس نہیں کر رہا تھا۔ آج بھی اُس میں قابلیت تھی کچھ نیا کر دکھانے کی۔ اُس نے اٹھتے ہی سکسینا کو موبائل کیا۔ اُدھر سے اونگھتی ہوئی آواز سنائی دی: ''ہیلو''

''سکسینا سو رہا ہے کیا؟''

''تو بول کیا کہتا ہے۔ مجھے نیند میں بولنے کی بیماری ہے''۔

''تم شام چھ بجے آنا میں تیار رہوں گا''۔

''کیا؟ آج شام چھ بجے؟ تم نے دیپک اور چراغ سے بات کر لی؟'' سکسینا کی نیند پوری طرح کھُل چکی تھی۔

''اس کی میں ضرورت نہیں سمجھتا۔ بس اُنھیں اطلاع کر دوں گا۔ فون پر یا خط لکھ کر''۔

''خط لکھ کر کیوں؟ کیا چراغ گھر پر نہیں؟''

''اس کے پاس وقت نہیں میرے لئے اور اب تو میرے پاس بھی وقت نہیں ہے۔ انتظار کی عادت میں نے چھوڑ دی۔''

''کب سے؟'' اُس نے ہنس کر پوچھا۔

''کل شام سے۔ تم بس چھ بجے پہنچ جانا میں تیار رہوں گا۔ رکھتا ہوں'' اتنا کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔

صبح گیارہ بجے اُس نے وکیل کو گھر پر ہی بُلا لیا۔ سب کام مکمل کر کے اُسے دوبارہ ملنے کو کہا۔ پھر اپنی الماری سے چھان بین شروع کی اور ضروری سامان نکال کر الگ باندھ لیا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اُس نے چند لمحے لان میں پھولوں کو نہارتے گزارے اور پھر دھیرے دھیرے پہلے کوٹھی کے باہر کا پورا چکر لگایا اور پھر اندر ایک ایک کمرے کا جائزہ لیا۔ آج اس گھر میں اُس کا آخری دن تھا شاید دوبارہ اس جگہ کو کبھی دیکھ پائے یا نہ دیکھ پائے۔ ستنداروز کی طرح گھر پر نہیں تھی۔ بچوں کے کمرے میں گیا تو وہ کمپیوٹر میں گھُسے ہوئے تھے۔ اُس نے بُلایا تو دونوں نے مُسکرا کر دیکھا اور پھر کمپیوٹر کی اور دیکھنے لگے۔ شاید کوئی گیم کھیل رہے تھے۔ وہ چُپ چاپ باہر نکل آیا۔

مقررہ وقت پر وکیل صاحب پہنچ گئے اور کاغذات پر دستخط کروا کر رخصت ہو گئے۔

سب سے پہلے اُس نے دیپک کو فون لگایا اُس کا فون answering machine پر تھا۔ اپنا پیغام رکارڈ کرا کر اُس نے فون بند کر دیا۔

چراغ کو اس نے موبائل کیا تو اُس نے اٹھاتے ہی کہا:

''پاپا میں ایک ضروری میٹنگ میں مصروف ہوں بعد میں فون کرتا ہوں۔'' فون کٹ گیا۔

''ہمیشہ کی طرح اس بے چارے کے پاس وقت نہیں ہے باپ سے بات کرنے کا'' وہ خود سے ہی بڑبڑایا اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا۔

''سوچا تھا جانے سے پہلے تم سے بات کرلوں مگر ہر بار کی طرح تمہارے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا جانتا ہوں تمہارا وقت بہت قیمتی ہے۔ اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ میں کوئی بے کار شے کی طرح زندگی نہیں گزار سکتا۔ میں نے اور سکسینا نے نیا کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ گھبراؤ نہیں میں تم سے پیسے نہیں مانگوں گا۔ کاروبار سے اپنے حصّے کے پیسے نکلوا لئے ہیں۔ میں نے اب تک پورے اختیار تمہیں نہیں سونپے تھے۔ آج سونپ رہا ہوں۔ اب سے پورے کاروبار کے تم اکیلے مالک ہو اور یہ گھر میں نے تم دونوں بھائیوں کے نام کر دیا ہے۔

یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ میں گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ سکسینا نے نیا Old Age Home بنوایا ہے۔ ہم دونوں وہیں اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ رہیں گے اور اُن لوگوں کی مدد کریں گے جن کو دنیا میں کوئی دیکھنے والا نہیں جن کی کسی کو ضرورت نہیں۔ تم فکر مت کرنا یہ Old Age Home اس شہر میں نہیں ہے اس لئے تمہاری کوئی بدنامی نہیں ہوگی۔ ویسے بھی وہاں سب مجھ جیسے ہی تو ہونگے۔

اپنا نیا پتا بعد میں لکھ دوں گا اگر مجھے مناسب لگا۔

ہمیشہ خوش رہو میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ ہمیشہ۔

تمہارا پاپا

بلدیوراج

خط لفافے میں ڈالا۔ نوکر کو تھما دیا اور ٹھیک چھ بجے باہر گاڑی کا ہارن سُن کر وہ گھر سے نکل آیا۔ سامان گاڑی میں رکھوا کر وہ سکسینا کے ساتھ ایک نئی شروعات کرنے نکل پڑا۔

''افعی جاں گداز''

نجیب عمر (کراچی)

تم نے دیکھا! آج کوئی اور آیا ہے۔ اس کا شمار تیسرا ہے۔ میں ان خاص آنے والوں کو خوب پہچانتی ہوں۔ ان کی ایک ایک ادا اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ ان کے درمیان تعلقات کی نوعیت کچھ خاص ہے۔ اور میزباں جو اس گھر کی ملکہ ہے جس والہانہ شیفتگی سے ان کا استقبال کرتی ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں؟

میں سب دیکھتا اور خوب سمجھتا ہوں۔ جب وہ پہلا مہمان خاص یہاں آیا تھا اور ان کے درمیان جو کچھ میں نے دیکھا اسے الہڑ جوانی کی خوبصورت غلطی سمجھا اور نظرانداز کر دیا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اب یہ معمول بن جائے گا۔

لیکن اب یہ تعداد تین تک پہنچ گئی ہے۔ میری تشویش میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے گو میں اس گھر کے مالک سے بے انتہا ناراض ہوں۔ وہ ایک خوبرو ذی حیثیت اور رکھ رکھاؤ برتنے والا شخص ہے۔ اگرچہ اس کی کاروباری مصروفیات اسے بہت کم موقع دیتی ہیں کہ وہ اس طرف بھی توجہ دے۔ وہ تو تھکا ہارا آ کر اس کی زلفوں کے سائے میں ایسا سوتا ہے کہ صبح کی خبر لے۔ لیکن میرے لیے یہ بات حیرت انگیز ہے کہ اسے اپنی نصف بہتر کے کرتوت کا کوئی علم نہیں بلکہ مجھے گمان ہے کہ وہ بہت کچھ جانتا ہے تاہم اس کی چشم پوشی میری سمجھ سے باہر ہے۔

یہ بات میرے لیے بھی انتہائی تکلیف دہ ہے۔ جب میں اسے صبح سویرے گھر کے لان میں جاگنگ کرتے ہوئے دیکھتی ہوں تو اس کی مردانہ وجاہت اور اس کے رنگ روپ پر میں مر مر جاتی ہوں اور کیسی بدنصیب ہے یہ عورت جسے اتنا شاندار شریک زندگی ملا لیکن شاید وفا اس کی سرشت میں نہیں جب ہی اس نے تین تین آشنا پال رکھے ہیں۔ کیا وہ تینوں بھی ایک دوسرے سے واقف ہیں؟

میں سمجھتا ہوں کہ یہ دھوکا دینے کے فن میں طاق ہے اور ان کے درمیان بھی راز داری برت رہی ہوگی۔ تاہم اس کے شوہر کو سب جانتے ہوں گے۔ چور کا دل بہت تھوڑا ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنی مطلب برآوری سے آگے کچھ اور جاننا نہیں چاہتے۔

کل رات ہلکی پھوار کے بعد جب موسم خوشگوار ہو گیا تو دونوں لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھ گئے اور کل پہلی مرتبہ دونوں میں اس موضوع پر بات ہوئی۔ برخوردار بڑے دھیمے لہجے میں زمانے کی اونچ نیچ سے اپنی شریک حیات کو آگاہ کر رہا تھا اور وہ اس پر شک کرنے کا مسلسل الزام لگائے جا رہی تھی اور ساتھ ہی اپنی پاکدامنی کا یقین بھی دلا رہی تھی۔ لیکن جب وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب آئی اور بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں تو سارے گلے شکوے جاتے رہے اور وہ ہمیشہ کی طرح اس کے ہر دعوے کو تسلیم کرتا چلا گیا۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس قدر وفادار شوہر جو شاید اپنی نظر میں بھٹکنے نہ دے۔ کیا وہ اپنی بیوی سے کامل وفاداری کا تقاضا بھی نہیں کر سکتا اور وہ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے کیوں برداشت کر رہا ہے اس طرح وہ کون سی وفاداری نبھا رہا ہے۔ اگر اس کی بیوی کو اس رشتے کے تقدس کی پروا نہیں تو آخر وہ کیوں برداشت کی آخری حد تک چلا جا رہا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اگر وہ چاہتا تو اسے راہ راست پر لا سکتا تھا لیکن وہ تو۔ دیوی کا ایسا پجاری ہے جسے اپنی پوجا کے علاوہ اور کسی چیز سے کوئی مطلب نہیں۔

اور آج تو انتہا ہو گئی۔ ایک اور نووارد۔ اس کی بھی وہی حیثیت دیکھی جو پہلے تین کی دیکھ چکی تھی۔ اس کے استقبال اور پذیرائی میں بھی وہ بچھی بچھی جاتی تھی۔ کیا اس کا ضمیر اتنا مردہ ہو گیا ہے کہ اسے اس پستی کا احساس نہیں جس میں وہ گرتی جا رہی ہے۔

خالق کائنات نے ہر شخصیت میں ایک پاسبان بٹھا رکھا ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر اسے نیکی و بدی غلط اور صحیح سے آگاہ کرتا رہتا ہے۔ ایسا نہیں کہ کوئی گناہ کرے اور اسے احساس نہ ہو۔ دراصل یہ ایک نظام ہے جس میں آپ اپنی اصلاح کے لیے ہر دم اعانت ملتی رہتی ہے۔ لیکن اس عورت نے نیکی کی ساری قوتوں کو دبا رکھا ہے اور گناہ کی راہ پر بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ چاہے اس کے بہکنے کے کتنے ہی اسباب کیوں نہ ہوں۔ اس کے شوہر کی ڈھیل اس کا سب سے بڑا سبب ہے اور میں اسے ہی قصوروار سمجھتی ہوں۔ یہ دونوں جب اس گھر میں نئے نئے آئے تو میں انھیں ایک دوسرے کا باوفا ساتھی جانتی ہوئی ان کے لیے ہر دم دعا گو رہتی تھی۔ میری خواہش تھی کہ جلد ان کے پیار کی نشانی کی شکل میں گھر میں معصوم بچے کی کلکاری سنائی دے جسے دیکھ دیکھ کر دونوں نہال ہو جائیں لیکن مجھے اپنے خوابوں کی ایسی تعبیر ملے گی سوچا نہ تھا۔

دوسرے روز صبح اُس نے اپنے ساتھی کو خاموش دیکھ کر پوچھا۔ کیا بات ہے؟ گم سم ہو۔ اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا آج میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا کہ آخر وہ اسے اس کے گناہ کی سزا کیوں نہیں دیتا؟

اور جب صبح وہ جاگنگ سے فارغ ہو کر تھکا ہارا کرسی پر بیٹھا تو تو میں بے آواز رینگتا ہوا اس کے پیروں تک گیا اور اس کی پنڈلی کو ڈس لیا اور بہت سارا زہر اس کے وجود میں انڈیل دیا۔ میرے نزدیک اس کی یہی سزا ہونی چاہیے تھی۔ اب کرسی پر اس کی لاش پڑی ہے جاؤ دیکھ لو اور یہاں سے کوچ کی تیاری کر لو لوگ ہماری تلاش میں سرگرداں ہو سکتے ہیں۔ تم نے اصل گناہگار کو کیوں چھوڑ دیا اور اس شریف النفس کی جان لے لی۔

یہ شخص زمین کا بوجھ تھا۔ جو اپنی ناموس کی حفاظت نہ کر سکے۔ اس کی حمیّت اس مرحلے پر بھی نہ جاگے وہ انسان نہیں۔ اس کی بیوی اپنے اعمال کی بنا پر خود انجام بلکہ عبرتناک انجام سے دوچار ہوگی۔ پروردگار نے ہمیں جو کاٹنے کی صلاحیت دی ہے اگر یہ نہ ہوتو لوگ ہمیں رسیاں بنائے کھیلتے نظر آئیں۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے اس کے پاس دفاع کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں۔ لیکن اس شخص میں ایک بھی نہیں تھی لہٰذا اس کے وجود سے میں نے زمین کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

''شمعِ عرفاں''

غالب عرفان (کراچی)

ہوا کے شور پر گزرا گمان پتھر کا
کہانی ریت کی تھی اور بیان پتھر کا

جو سنگسار ہوا وہ گناہ گار نہ تھا
مگر وہ لیتا رہا امتحان پتھر کا

بھڑکتے حُسن کی لو کب سہار سکتا تھا
چٹخ کے ٹوٹ گیا شمع دان پتھر کا

عجب بات ہے کہ اس کے شہر میں اب بھی
ہیں لوگ کانچ کے اور حکمران پتھر کا

اب اُس کے ہاتھ میں کیا ہے پتہ نہیں جس نے
مری پیشانی پہ چھوڑا نشان پتھر کا

جو موج موج کنارے سے ہم کلام ہوئی
تو سایہ دینے لگا سائبان پتھر کا

جہاں تلاش کیا میں نے شمعِ عرفاں کو
زمین موم کی نکلی مکان پتھر کا

○

ندیم ہاشمی (کراچی)

کوئی حسرت سی پلنے والی ہے
رات آنکھوں میں ڈھلنے والی ہے

اے مرے دل ذرا دھیان رہے
درد کی لے سنبھلنے والی ہے

آنے والی ہے اب سحر کوئی
شب کی صورت نکلنے والی ہے

آ بھی جاؤ کہ وقت کی دیوی
خواہشوں کو نگلنے والی ہے

مضطرب ہے نظر نظر میری
آرزو بھی مچلنے والی ہے

دل کے رشتے قریب لگتے ہیں
برف جیسے پگھلنے والی ہے

جس میں جیون کا روگ پایا تھا
وہ مصیبت بھی ٹلنے والی ہے

○

پنہاں (امریکہ)

زندگی بس کمال کرتی ہے
یعنی جینا محال کرتی ہے

روشنی عیب کھولتی ہے مرے
تیرگی کچھ خیال کرتی ہے

جو تنفس تھی وہ محبت اب
سانس لینا محال کرتی ہے

زندگی دیکھتی ہی رہ جائے
موت ایسا کمال کرتی ہے

شاعری بھی عجیب ہے پنہاںؔ
کیسے کیسے سوال کرتی ہے

○

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

روشنی ہے آنکھوں کی اور دِل نشیں ہے وہ
دُور جاکے کیا ڈھونڈیں پاس ہے یہیں ہے وہ

دوستی کے صدقے میں زہر تن میں بھرتے ہیں
ہم تو یہ سمجھتے ہیں مارِ آستیں ہے وہ

کیا وطن ہمارا ہے اِک مثال عالم میں
آسماں پہ چمکا ہے رونقِ زمیں ہے وہ

نور سا اُمڈتا ہے دِل کے گوشے گوشے سے
اس مکانِ ویراں میں ایک مہ جبیں ہے وہ

زلزلے سے بکھرے ہیں دوستی کے متوالے
ہم کہیں پریشاں ہیں سرگراں کہیں ہے وہ

اُس کی بے مثالی کا ہر طرف فسانہ ہے
شہر بھر میں تنہا ہے کس قدر حسیں ہے وہ

مان ہے زہیر اپنا جو بچھڑ گیا ہم سے
دِل کی اُجڑی بستی کا آج بھی مکیں ہے وہ

○

مراق مرزا (ممبئی بھارت)

ہو گا وہ مہربان ذرا انتظار کر
وقتی ہے امتحان ذرا انتظار کر

ہارے گا تجھ سے دھوپ کا لشکر کہ غیب سے
آئے کا سائبانؔ ذرا انتظار کر

شب کے مسافروں کو ہی دیتا ہے آسماں
سورج کا ارمغانؔ ذرا انتظار کر

ہے جس کو خود پہ ناز ہر اُس آفتاب کے
مٹ جائیں گے نشانؔ ذرا انتظار کر

ہو گا یہ معجزہ بھی کہ پتھر کے پھول سے
مہکے گا گلستانؔ ذرا انتظار کر

اس رات کی زمیں پہ بھی اترے گا ایک دن
تاروں کا کاروانؔ ذرا انتظار کر

دنیا نئی ہے خو وہی پرانے پرندکی
تھم جائے گی اڑانؔ ذرا انتظار کر

اُبھریں گے کل اُفق پہ نئے رنگ پھر مراقؔ
بدلے گا آسمانؔ ذرا انتظار کر

○

شگفتہ نازلی (لاہور)

علم کا روشن سا اِک دفتر، مرے اندر کھلے
آگہی کا دَر کے اندر دَر، مرے اندر کھلے

مجھ کو جو افلاک کی پہنائیوں میں لے چلے
وہ مگر معجز نما سا پَر، مرے اندر کھلے

جو رموزِ ساز اور آواز سے کر دے قریب
کوئی ایسا تال اور پھر سُر، مرے اندر کھلے

لے چلے جو اُجنبی سے راستے پہ دُور تک
ہو سکے تو ایسا اِک منظر، مرے اندر کھلے

آنے والے دَور سے کر دے مجھے جو آشنا
ایسا ہی احساس کچھ یکسر، مرے اندر کھلے

کر دے جو وجدان کی جانب ہمیشہ کے لیے
وہ سفر پھر ہم سفر بن کر، مرے اندر کھلے

جا کے جاں آزاد ہو جاؤں سبھی آلام سے
نازلی اِک پُر سکوں سا گھر، مرے اندر کھلے!

○

پروفیسر صدیق شاہد (شیخوپورہ)

نہ زیرِ بار کوئی کر سکا سوال مجھے ۔۔۔ انانیت نے بنا رکھا یرغمال مجھے
خطا معاف، میں گم تھا اک اور عالم میں ۔۔۔ پکارتا رہا شب بھر ترا خیال مجھے
ٹھٹھر رہا ہے بدن دھوپ کی تمازت میں ۔۔۔ یہ کس جہان میں لے آئی کوئی چال مجھے
میں پیار کرتا ہوں تجھ سے، تو بدگماں بھی ہوں ۔۔۔ تو بدگمانی کے گرداب سے نکال مجھے!
تری نظر تھی کہ جس سے میں سرفراز ہوا ۔۔۔ تری نظر ہی نے کرڈالا پائمال مجھے
تو جا چکا بھی نہیں ہے مگر ترا جانا ، ۔۔۔ ابھی سے رکھے ہوئے ہے بہت نڈھال مجھے
وہ میرے ربطِ نہاں کا اسیر ہے اب تک ۔۔۔ جوان رکھتا ہے شاہد یہی خیال مجھے

○

ملک زادہ جاوید (نوئڈا، بھارت)

سوکھی لکڑی میں نمی اچھی نہیں ۔۔۔ غم کے موسم میں خوشی اچھی نہیں
زندگی بے وا نظر آنے لگے ۔۔۔ اسقدر بھی سادگی اچھی نہیں
میرا سایہ کیوں بنا رہتا ہے تُو ۔۔۔ عشق میں دیوانگی اچھی نہیں
مت جلاؤ سکے ہونٹوں پر دیئے ۔۔۔ ان اندھیروں میں ہنسی اچھی نہیں
وہ نظر سے گفتگو کرتا ہے بس ۔۔۔ اُسکے اندر یہ کمی اچھی نہیں
حضرتِ جاوید سے ملیئے مگر ۔۔۔ شاعروں سے دوستی اچھی نہیں

○

حفیظ انجم کریم نگری (کریم نگر، بھارت)

مرا الگ خدا ہے نہ اُسکا جدا خدا! ۔۔۔ اس راز سے تو پردہ اُٹھا دے ذرا خدا!
دنیا بڑی خراب ہے ایسی بنا خُدا ۔۔۔ سب کے دلوں میں ڈال دے خوفِ خُدا اخُدا
سوئی بھی مانگنا ہے تو، تو مجھ سے مانگ لے ۔۔۔ قرآن میں یہ بول رہا ہے مرا خُدا!
کیوں دائروں میں قید ہے جھوٹے طِلسم کے ۔۔۔ انساں کی آج عقل کو کیا ہو گیا خُدا!
موسیٰ بھی کوہِ طور پہ بے ہوش ہو گئے ۔۔۔ بس میں کہاں ہے سب کے، تجھے دیکھنا خُدا!
بھنوروں کی گنگناہٹیں چڑیوں کی چہچہیں، ۔۔۔ گُن گان کر رہے ہیں ترے نام کا خُدا!
جس طرح رنگ و بو ہے گلابوں میں مشک میں ۔۔۔ کردار بھی ہمارے معطر بنا خُدا!
دل میں بھی تو ہی تو ہے مری سانس میں بھی تو ۔۔۔ انجم پکارتا ہے مدد کو خُدا خُدا!!

○

کرامت بخاری (لاہور)

بات تو صاف اور سادہ ہے — تم بتاؤ کہ کیا ارادہ ہے
تھک گئے ہو تو ہے یہی منزل — دم اگر ہے تو پھر یہ جادہ ہے
لوگ کہتے ہیں ظرف تھوڑا ہے — میں یہ کہتا ہوں غم زیادہ ہے
جتنا کُہنہ عزیز تر آشنا — زندگی بھی عجب لبادہ ہے
تنگ دِل آ بسے ہیں گلیوں میں — ورنہ یہ شہر تو کشادہ ہے
کیوں نہ ہو میرؔ سے مجھے نسبت — وہ بھی میرا ہی خانوادہ ہے

○

آصف ڈار (امریکہ)

اس انتہائے عشق سے بیزار کون ہے — خود میں مگن وہ ہستیٔ اسرار کون ہے
میں در پہ آ گیا ہوں تمنا لئے ہوئے — لیکن چھپا ہوا پسِ دیوار کون ہے
جو کچھ کہا' کہا ہے بہت احترام سے — تم ہی کہو کہ خوگرِ انکار کون ہے
راتوں کے آخری پہر ڈھونڈا کیا تمہیں — مجھ سا تمہارے شہر میں دلدار کون ہے
معلوم ہیں مجھے مری کوتاہیاں بھی — اتنے دکھوں سے برسرِ پیکار کون ہے
آصفؔ تمہارے ضبط کے سب معترف ہوئے — اب تو کہو کہ مرکزِ افکار کون ہے

○

عرش صہبائی (جموں)

ذہن کے پردے پہ ہیں دُھندلی سی تصویریں کئی — زندگی اک خواب ہے لیکن ہیں تعبیریں کئی
ختم ہوتے ہی نہیں ہیں آرزو کے سلسلے — کیا کہوں پہنا گئے وہ دل کو زنجیریں کئی
حق پرستی کے لئے مخصوص ہیں دار و رَسن — اک ذرا سے جُرم کی خاطر ہیں تعزیریں کئی
جب کبھی اس دل کو تڑپاتی ہے یادِ رفتگاں — میری نظروں میں اُبھر آتی ہیں تصویریں کئی
اس نگاہِ شوق کو رہتا ہے اُس کا انتظار — اس نگاہِ شوق سے ہوتی ہیں تقصیریں کئی
درد۔ حسرت۔ یاسیت۔ افسردگی۔ بے چارگی — اس دلِ خوش بخت کو حاصل ہیں جاگیریں کئی
میرا ماضی بھی ہے اِن میں حال میں فردا بھی ہے — دل کی دیواروں پہ آویزاں ہیں تصویریں کئی
عرشؔ یہ نقطہ سمجھتے ہیں فقط اہلِ شعور — آگہی سے وہم کی کٹتی ہیں زنجیریں کئی

○

کرشن پرویز (روپڑ، بھارت)

ہم سب کی نگاہوں میں اسی بات پہ کھٹکے
سچ بات کہی سامنے دنیا کے ہے ڈٹ کے
اس دور کے لوگوں کا چلن دیکھ کے ڈر ہے
رہ جائے نہ انسان کا رتبہ کہیں گھٹ کے
اب رسموں رواجوں کو بدلنے پہ تلے ہیں
آ جائے نہ پتھر کا وہی دور پلٹ کے
چلتا ہی نہیں کوئی محبت کی ڈگر پر
کیوں لوگ محبت کی حسیں راہ سے بھٹکے
اک لفظ محبت کی جو وسعت ہے نہ پوچھو
آ جاتی ہے دنیا بھی اسی دل میں سمٹ کے
مذہب کا کہیں دھرم کہیں ذات کا جھگڑا
انسان تو بس رہ گیا فرقوں میں بٹ کے
پرویزؔ اگر نام کمانا ہے جہاں میں
جو کام کرؤ کرنا زمانے سے وہ ہٹ کے

○

سمیع نوید (میانوالی)

ہر اک خیال کی رنگین آرزو آنکھیں
نمازِ شوق ہے اور شوق کا وضو آنکھیں
ازل سے حسن میں اک درد ہے تماشائی
ازل سے شوخ ہیں ساجن کی خوبرو آنکھیں
وفا کا خواب سرِ چشم اب بھی زندہ ہے
تمہارے پیار میں اب بھی ہیں سرخرو آنکھیں
میں اپنے دوست کا اشکوں سے نام یوں لکھوں
ہر ایک حرف میں جیسے ہوں روبرو آنکھیں
بڑے ہی ناز سے ان میں جمال بہتا ہے
بڑے غرور سے تکتی ہیں آبجو آنکھیں
میں اپنے درد کے ہاتھوں خموش رہتا ہوں
ترے جمال سے کرتی ہیں گفتگو آنکھیں
ازل سے سوچ رہا ہے دماغ میّت کا
کفن سے جھانک رہی ہیں لہولہو آنکھیں
نویدؔ حسن کے پربت پہ چار سو بارش
مگر وجود کے ساون میں چار سو آنکھیں

○

جتندر پرواز (پٹھان کوٹ، بھارت)

وہ نظروں سے میری نظر کاٹتا ہے
محبت کا پہلا اثر کاٹتا ہے
مجھے گھر میں کبھی چین پڑتا نہیں تھا
سفر میں ہوں اب تو سفر کاٹتا ہے
یہ ماں کی دعائیں حفاظت کریں گی
یہ تعویذ سب کی نظر کاٹتا ہے
تمہاری جفا پر میں غزلیں کہوں گا
سنا ہے ہنر کو ہنر کاٹتا ہے
یہ فرقہ پرستی یہ نفرت کی آندھی
پڑوسی پڑوسی کا سر کاٹتا ہے

○

خوف اور اجنبیت کے درمیاں

حمیدہ معین رضوی (لندن)

بچپن میں ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ ہمارا انڈیا سے کچھ لینا دینا ہے۔

ہم تو پنجابی تھے۔مگر والد صاحب کی ریٹائر منٹ کے بعد پھوپھیوں کے بابا کے پاس خطوط آنے شروع ہوئے کہ ان کی یہ بھی اسلامی ذمہ داری ہے کہ اپنے خونی رشتہ داروں سے ملاقات کریں اور اب جبکہ وہ ریٹائر ہو چکے انکے اور اس شرعی فرض کے درمیاں کوئی چیز حائل نہیں ھونی چاہیے۔بابا نے حامی بھر لی میں لندن میں تھی۔میں نے بھی اصرار کیا کہ انکو جانا چاہیے کیوں کہ وہ اکثر کہتے تھے۔''مجھے بہنوں سے ایسی محبت ہے کہ جہاں انکا پسینہ گرے میں خون بہانے کو تیار ہو جاتا بس ہمارے گھروں میں بیٹیوں سے بہت پیار کا رواج تھا'' چنانچہ میں نے بھی بابا سے اصرار کیا کہ وہ ضرور جائیں دونوں بھائیوں مظہر اور سعید نے اطمینان دلایا کہ گھر سے گھر تک جہاز سے پہنچادیں گے اور یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت جہاز کراچی سے دہلی اور دہلی سے گورکھ پور فلائٹ جاتی تھی یہ اپریل ۱۹۸۸ کی بات ہے۔امی اور بابا دونوں انڈیا گئے اور اکتوبر تک واپس آگئے اکتوبر میں واپس آئے تو میں نے اپنی درخواست داخل کر دی میں بھی تو چہیتی بیٹی ہوں اگر وہ ہندوستان نہ جاتے تو کبھی یہاں آنے کی ہمت نہ کر پاتے تاہم اچھی بات یہ تھی کہ وہ ہندستان گئے۔یہ دوسری بات کہ شومی قسمت سے ہماری بڑی پھوپی جان جو گورکھپور کی تعلیمی تاریخ کا اہم حصہ تھیں انتظار نہ کرسکیں اور اجل کو لبیک کہہ گئیں والد صاحب کو اسکا ہمیشہ افسوس رہا اگرچہ وہ واحد پھوپی تھیں جو پاکستان آکر ہم سے مل بھی گئی تھیں۔

جون ۱۹۹۸ میں بابا لندن آئے۔میں نوکری کر رہی تھی وقت کی کمی ساتھ بیٹھنے کی حسرت پوری نہ ہوتی تاہم جتنا وقت ملتا اور ہم بات چیت کر پاتے تو امی اور بابا مستقل انڈیا کا ذکر کرتے جیسے کہ یہ ایک انوکھا تجربہ تھا اور انھیں خوشی تھی کہ انھوں نے میری بات مانی اور یہ تجربہ کیا انکی خوشی اور ذوق شوق دیکھ کر میرے اشتیاق اور تمنا نے بھی کروٹ لینی شروع کی جو سمجھتی تھی کہ میرا انڈیا سے کوئی لینا دینا نہیں۔

بابا دسمبر ۱۹۹۸ میں پاکستان گئے جنوری ۱۹۹۱ میں میں پاکستان گئی پھر کراچی سے انکے ساتھ پنجاب گئی۔کراچی انھیں پسند نہیں تھا پنجاب جانے کے نام پہ فوراً تیار ہو جاتے اور بہت خوش ہوتے۔میں واپس آنے لگی تو کہنے لگے.. بھئی معاف کرنا تمھیں اکیلے جانا پڑ رہا ہے اگرچہ سردی پنجاب میں بہت زیادہ ہے تاہم اب آیا ہوں تو رہ لوں کچھ دن۔میرا تو گھر لندن میں ہے مجھے تو آنا ہی تھا۔صرف یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ میرا انکے ساتھ سفر آخری ہے کیونکہ دو ماہ کے اندر انکا انتقال ہوگیا۔بابا کی موت اور اسکے بعد کے تکلیف دہ واقعات نے دکھ کی سولی پہ زندگی کے کئی قیمتی برس چھین لئے۔میں دھند میں لپٹی دنیا سے بےزار کئی برس یوں بتا گئی کہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا۔

میں غم کی دھند میں لپٹی تھی۔۔۔تو پھوپی کا فون آگیا انھیں بھی والد صاحب کی موت کا بہت صدمہ تھا، کہنے لگیں ''آجاؤ مل کر اکٹھے رولیں گے صبر آجائے گا دیکھنے کی بڑی حسرت ہے'' ابھی غور کر رہی تھی کہ اس دوران میری دوسری پھوپی بھی فوت ہو گئیں اور ایک ہی رہ گئیں، وہ میرے والد صاحب کی بہت چہیتی بہن تھیں میں تڑپ گئی۔جانا ہی ہوگا۔ادھر بارہ بنکی سے میری خلیا ساس نے بھی بہت پیار سے بلایا۔''میری اور خالو کی زندگی میں آجاؤ۔بعد میں کون پہچانے گا۔جو لگن مجھے ہے کسی اور کو نہ ہوگی سب عزیزوں سے تفصیلی ملاقات ہو جائے گی تو آتی جاتی رہنا'' میں نے اپنی سگی ساس کو کبھی دیکھا نہیں میری پیدائش سے پہلے وہ اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں شوق بھڑک گیا۔ساس نہ سہی ساس کی بہن سہی۔

معین نے عمر سے دس سال پہلے رٹائر منٹ لے لی تھی۔مجھے منصوبہ بندی کرنی تھی چھٹی کے لئے۔خالہ ساس اور پھوپی کی محبت میں کشاں کشاں صرف تین ہفتے کے لئے چھٹی لے کر انڈیا جانے کے لئے تیار ہوگئی۔کچھ بے تعلقی سی بھی تھی۔یہ اجنبی لوگ جو کہتے ہیں میرے رشتہ دار ہیں، کیوں اتنی محبت سے بلا رہے ہیں۔تاہم طے ہوا کہ چل کر دیکھنا چاہئے۔مجھے کچھ خوف بھی تھا۔اور اجنبیت تو بہت تھی۔

موسم بہار میں میں نے پہلی دفعہ انڈیا جانے کے لئے ویزے کی درخواست دی جو منظور ہوگئی۔برٹش پاسپورٹ تسلیم کرلیا گیا کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ہم لوگ پی آئی اے سے دہلی جانے کے لئے جہاز میں بیٹھے تو جہاز چل ہی نہیں رہا ہے۔واہمے سے گھیرنے لگے۔ایک بار کچھ پولیس والے بھی آئے۔پھر پولیس والوں کے ساتھ چار لوگ لائے گئے۔اتفاق سے ہم دونوں بیچ کی دو سیٹوں پہ بیٹھے تھے۔میرے میاں کی ساتھ والی سیٹ پہ ان چاروں میں سے دو بیٹھ گئے۔بیچ میں راستہ چھوڑ کر باقی دو۔پولیس والے انھیں چھوڑ کر جیسے ہی نیچے اترے جہاز چل پڑا۔چاروں کی حالت سے مفلوک الحالی پکار پکار کر اعلان کر رہی تھی۔اس وقت تک مجھے یہ معلوم تھا کہ یہ غربت کے مارے لوگ ہیں۔ایک کے پیروں میں جوتے بھی نہیں تھے۔سخت دکھ ہوا وہ سب ۲۰ سے ۲۵ کے درمیان تھے۔تین تو کچھ بول رہے تھے۔مگر جو لڑکا میرے شوہر کے بائیں طرف بیٹھا تھا وہ شکل سے لگ رہا تھا سزائے موت ہونے والی ہے۔اسکے کپڑے میلے، اور بوسیدہ۔رنگ اڑا چہرہ اترا ہوا، ہونٹ خشک۔عمر بمشکل بیس۔ہم پوچھے بنا نہ رہ سکے۔اسکے آنسو بہنے لگے۔ساتھ والے لڑکے نے بتایا۔اسے کسی ایجنٹ نے ابوظہبی کے لئے جعلی ویزا لے کر دیا تھا۔بیچارے نے صرف تین ماہ کام کیا تھا کہ پکڑا گیا۔دو ہفتے جیل میں رہا پھر انکو پولیس ہتھکڑی ڈال کر کراچی تک لائی اور ہمارے دہلی جانے والے جہاز پہ سوار کرادیا۔گھر سے کوئی سامان لانے کی اجازت بھی نہ ملی۔کام پہ ہی پکڑ لیا۔کوئی مہلت نہ دی۔

بقول اسکے ایک جوڑے کپڑے کی گٹھڑی تھی کچھ چھوٹے موٹے تحفے جیسے مصنوعی بندے، ہار بہنوں کے لئے خریدے تھے۔اس نے پھر اپنے آنسو پونچھے۔میں سوچے بنا نہ رہ سکی کہ میرے بیٹے جتنی اسکی عمر اور۔۔۔ایسی

دکھوں کی یلغار۔اسکے ساتھیوں نے بتایا۔کہ ہم وہیں اسکے دوست بنے تھے اور چھٹی پہ جارہے ہیں ہم سب بھی بہت غریب ہیں۔مگر اسکا مسئلہ یہ ہے کہ یہ ائیر پورٹ سے باہر نکلے گا تو بھوک۔اور۔۔۔۔اور۔۔۔یہ تو اسے تین ماہ کی تنخواہ نہیں ملی۔؟ میں نے پوچھا۔اس پہ وہ لڑکا اور رونے لگا۔اسکے ساتھیوں نے بتایا کہ وہ تو غنیمت ہے انھوں نے واپس بھیج دیا ورنہ لوگ جیل میں پڑے سڑتے ہیں کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا،اور اسکا المیہ یہ تھا کہ وہ دور اڑیسہ وغیرہ کے کسی گاؤں میں رہتا تھا اسکے پاس دھیلہ نہیں اور پیر میں جوتے نہیں کرائے کے پیسے نہیں ۔۔۔اس نے بات جاری رکھی۔پھر تبصرے اور مشورے کے انداز میں کہا۔''بھیا بھیک مانگتے چلے جانا۔اور کیا کرسکو گے؟

مگر اس انڈین ایجنٹ کو پکڑا نہیں جاسکتا جس نے یہ فریب دیا؟

بیگم صاحبہ،ایجنٹ ایک شہر کولوٹ کر دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں پھر وہاں سے تیسری جگہ۔کون انھیں پوچھے۔؟

غریب کی کوئی نہیں سنتا،اپنے (M.P) سے کہو۔

نہیں جی۔ یہ تو ویسے بھی جاہل ہے پھر گاؤں کا ہے۔اسے کیا پتہ؟۔یہ نیتا لوگوں کو کیا جانے؟۔

وہ لڑکا پھر روتے ہوئے کہنے لگا۔میں تو یہیں بھوک سے مر جاؤں گا۔اتنی دور کا کرایہ کہاں سے آئے گا؟

تھوڑی دیر میں کچھ ناشتہ وغیرہ آیا بیس منٹ میں دہلی ائیر پورٹ آنے والا تھا۔وہ اٹھ کر ٹائیلٹ گیا تو میں نے پھر اسکے دوستوں سے پوچھا اسکا نام کیا ہے؟ ''اسکا نام شیام لال ہے۔ ہم سب ہندو ہیں، اسنے فخر سے کہا ہے''۔ہم تینوں بمبئی جارہے ہیں۔اسکے بڑے سپنے تھے بہن کے لئے یہ لوں گا ماں کے لئے وہ۔ماں نے باپ کی آخری نشانی ایک رہنے کی کوٹھری بیچ کر ابو ظبہی جانے کا انتظام کیا تھا اب وہ۔۔۔کسی پلیا کے نیچے ٹاٹ گھیر کے رہتی ہے۔وہ ابھی ٹائیلٹ سے آیا نہیں تھا۔میں نے معین سے جلدی سے مشورہ کر کے طے کیا کہ ہمیں کچھ کرنا چاہئے ۔ ایسے موقعے پہ میں خوف سے کانپ جاتی ہوں کہ قیامت کے دن کہیں اس وقت کسی انسان کی مدد نہ کرنے پہ پکڑ نہ ہو جائے۔۔میرا دل بہت آزردہ ہو گیا تھا۔اور سخت بے چینی سوار تھی۔انھوں نے میری رائے سے اتفاق کیا،اور اس لڑکے سے تاکید سے کہہ دیا کہ وہ امیگریشن کے باہر ہمارا انتظار کرے۔کہیں جائے نہیں۔

وہ جلدی نکل گیا۔ہمیں دیر لگی اسکے باوجود کہ برطانوی پاسپورٹ تھا۔میں مسلسل دعا کرتی رہی کہ وہ چلا نہ جائے ورنہ میرا دل خود کو بہت گنہگار محسوس کرے گا۔کہ میں کچھ نہ کرسکی۔

جب ہم سامان لے کر باہر آئے تو اللہ کا شکر کیا وہ منتظر کھڑا تھا۔اسکے کرائے کا۔گھر والوں کے لئے کچھ تحفوں کا اور اندازاً ایک مہینے کے گھر کے خرچ کے پیسے دیئے۔ہم صرف اتنا ہی کرسکے جس کا افسوس ہے ہمیں بھی مجبوری تھی پر دیسی اور مسافرت گھر ہوتے تو واقعی اسکے مستقبل کے لئے کچھ کرسکتے۔وہ پیسے لیتے ہی ہمارے پیروں پہ سجدے میں گر گیا۔معین نے جلدی سے اسے اٹھا کر گلے لگایا۔حسب عادت پیسوں کی حفاظت کرنے ، چوراُچکّوں سے ہوشیار رہنے،اور اپنے ہی ملک میں کام ڈھونڈنے پہ ایک لمبی تقریر نما نصیحت فرمائی جو اسنے توجہ سے سنی پھر ہم نے اس کو دعا کے ساتھ رخصت کیا،اور ابوظبہی کے شیخوں کو کوستے باہر کی طرف چلے تو یاد آیا کہ انکی نصیحت کچھ زیادہ لمبی ہو گئی تھی۔اور میرا خالہ زاد بھائی اور بہن باہر گرمی میں سوکھ رہے ہوں گے۔ ہندوستان سے میری اجنبیت ختم ہو چکی تھی۔مجھے ہندوستان اور ہندستانی اپنے جیسے ہی لگنے لگے۔

عبدلواحد اور رئیسہ اپنے بچوں کے ساتھ ملے۔مارچ کا آخر تھا اور گرمی سے ہمارا دم نکل رہا تھا۔روہنی کا علاقہ ائیر پورٹ سے گھنٹے بھر سے زیادہ کی ڈرائیو پہ ہے۔گاڑی میں بیٹھ کر عبدلواحد نے کہا''ہم تو سمجھے کسٹم نے روک لیا ہے''میں نے انھیں بتایا،کسٹم اور امگریشن والوں نے تو دو منٹ بھی نہیں لگائے کچھ پوچھا بھی نہیں تین دن ہمیں دہلی میں رہنا تھا ہمیں ہمارے خالہ زاد بھائی عبدلواحد علی نے دہلی کی ہر تاریخی چیز دکھائی۔

جنھیں دیکھ کر خوشی کم غم زیادہ ملے۔ ہر عمارت دیکھ کر مسلمانوں کے زوال پہ بہت رونا آیا۔تاریخی زوال پہ نہیں شخصی اور ذاتی زوال پہ جہاں مٹنے کا احساس بھی نہیں۔شاہی مسجد کی تقریباً سوسوا سو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر مسجد بنی ہے جس کی اونچائی قلعے کی اونچائی کے برابر ہے سیڑھیوں کا صرف بیچ کا حصہ خالی تھا باقی دائیں بائیں پھٹے چرسی کپڑوں اور کھانے کی دو کانیں تھیں،ہڈیاں اور بچا کھچا کھانا بے تکلفی سے زمین پر پھینکا جارہا تھا کتےّ دور بیٹھے ہڈیوں پہ جھپٹنے کے منتظر تھے کچھ کتے ہڈی چچوڑنے میں مصروف تھے۔جگہ جگہ لوگ کھا پی رہے تھے اور بچا کھچا کھانا پھینک رہے تھے جس سے مکھیوں اور گندگی میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا تھا سیاح لوگ حیرت سے اس گندگی کے منظر کو دیکھتے ہوئے گذر رہے تھے۔سیڑھیوں کے دونوں طرف گھاس سے بھرے دو میدان تھے۔جس میں جوان لوگ کھیل رہے تھے اور زور زور سے غلیظ گالیاں بک رہے تھے۔ایک اور بھیڑ بھاڑ کی وجہ تھی یہ ذیقعد کا آخری ہفتہ تھا اور ذوالحجہ کی آمد آمد اسلئے ہر طرف بکروں کے ریوڑ تھے مریل سے بکرے شاہی مسجد کی سیڑھیوں پہ ٹہل رہے تھے۔کچھ اوپر تک پہنچ گئے تھے،یعنی مسجد کے پھاٹک تک میں نے سوچا قربانی کے بکرے جو ہوئے مسجد دیکھنا چاہتے ہیں۔

ریوڑ سیڑھیوں کی دونوں جانب گھاس کے میدان میں استراحت فرما رہے تھے مسجد تک پہنچنے کیلئے سیڑھیوں پہ چڑھی تو دور تک کا علاقہ نظر آرہا تھا اور جو لوگ نظر آرہے تھے بے چارے سب غریب اور مزدور طبقے کے لوگ تھے۔سب سے قابلِ رحم بھیک مانگتی ہوئی برقعہ پوش عورتیں لگیں،دروغ بر گردنِ راوی، کسی نے اطلاع دی کہ ضروری نہیں یہ برقعہ پوش سب عورتیں مسلمان ہوں۔یہاں برقعہ بہت بڑا Cover up ہے۔کسی مذہب کی عورت ہو بھیک کے لئے استعمال کرسکتی ہے،عزت بیچنے کے لئے استعمال کرسکتی ہے جاسوس اسے استعمال کرتے اور کرواتے ہیں۔محبوب سے ملنے ملانے کا معاملہ بھی اسکے ذریعے نپٹایا جاسکتا ہے۔

سب سے اوپر والی سیڑھی پہ کھڑی چاروں طرف نگاہ دوڑاتے

ہوئے میں تاریخ کی کئی صدیوں کے زخم کھا گئی۔اسی وقت عصر کی اذان ہونی شروع ہوگئی۔اللہ سب سے بڑا ہے۔ میں اذان سنتی رہی اور مسجد کو دیکھتی رہی، سرخ پتھر کی یہ مسجد جسکا فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھاوضو کی جگہ کائی اور گندگی سے بھری ہوئی تھی۔سنا گیا کہ یہ بھی مسلمانوں کی اپنی غلطی ہے حکومت سے جو گرانٹ ملتی ہے اسکو دانائی سے خرچ نہیں کیا جاتا۔ ہر تاریخی عمارت پہ اقوامِ متحدہ کا نوٹس لگا ہوا تھا کہ ہر ملک کی یہ قانونی ذمہ داری ہے کہ تاریخی عمارتوں کی حفاظت کریں مگر مجھے تو ہر عمارت رو بزوال نظر آئی حالانکہ یہ عمارتیں ہی حکومت کی ساکھ بڑھانے کا ذریعہ ہیں قطب مینار کی حالت بھی بے انتہا ابتری کا شکار تھی۔ جہاں ہم صبح گئے تھے۔ہم نے عصر کی نماز ادا کی اور اس مسجد کی کشادگی اور خستہ حالی پہ یہ آیت پڑھتے ہوئے ''زمین میں سیاحت کرکے دیکھو کیسا ہوا انجام نافرمانوں کا'' القرآن نیچے جانے کو سیڑھیوں کی جانب بڑھے تو بکروں کی دھاچوکڑی نے ہماری چوکڑی بھلادی، میں میں کی آواز سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔معین نے حفاظت کی خاطر میرا ہاتھ تھام لیاا اور ہم دونوں گھستے پستے نیچے پہنچے جہاں میری خالہ زاد بہن اور اسکا شوہر گاڑی میں ہمارے منتظر تھے۔ہمیں ابھی قلعہ دیکھنا تھا شام کی قیامت خیز ٹریفک شروع ہونے سے پہلے ہمیں وہاں پہنچنا تھا۔وہاں مغلوں کے زوال پہ ایک شو بھی تھا۔سامنے قلعہ نظر آرہا تھا مگر وہ ہی معاملہ تھا کہ ''پاس رہ کر بھی کتنی دوریاں'' بہر حال ہم پہنچ گئے دھڑکتے دل اور ڈبڈبائی آنکھوں سے ہم گیٹ میں داخل ہوئے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسلئے کہ ہم نے بچپن میں ہزاروں ایسی کہانیاں سن رکھی تھیں جن کا کوئی نہ کوئی رشتہ لال قلعہ کی منظّم فائرنگ سے جڑا ہوا تھا ہر جاننے والے کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار ضرور شہید ہوا تھا جو پاکستان کی سرزمیں سے محبت کے جرم میں موت کی نیند سلا دیئے گئے تھے۔ میرا دل چاہا آج ملک لوٹنے والوں اور دہشت گردی کو اسلام بتلانے والوں، ایمان بیچنے اور بک جانے والوں سے کہوں کاش تمہیں کوئی اس طرح جمع کرکے موت کے گھاٹ اتار دے۔

تم جو نفرت کی پوجا کرتے ہو نفرت پھیلاتے ہو اور وہ خون بہارہے ہو جس کا تقدس تم پرواجب ہے۔اور پھر تم خود کو مسلماں کہتے ہو۔قلعہ بالکل مسجد کے سامنے تھا مگر ون وے کی وجہ سے آدھا گھنٹہ صرف ہوا گاڑی سے اتر کے گیٹ کی طرف بڑھے۔ ٹھٹھکتے ہوئے ہم سب قلعہ کے گیٹ میں داخل ہوئے۔عجیب سے احساسِ زیاں کی دھند قلعے کو دیکھ کر محسوس ہوئی ہم داخل ہوئے سب سے پہلے تو اس شخص کی عقل اور احساسِ جمال سے اندھے ہونے پہ رونا رویا۔جس نے قلعہ کی خوبصورتی اور حسن کو مسخ کرنے کو وہاں انتہائی کریہہ شکل پانی کی ٹنکی لگادی ہے ایک طرف کچھ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ایک طرف کوڑا کرکٹ لوگوں کی بے حسی پہ حیرت ہے اتنے بڑے دہلی شہر میں ایک صاحبِ ذوق زندہ نہیں کہ اس حرکت پہ سراپا احتجاج بن جاتا قطب مینار تو شاید انگریز ہی برباد کرگئے تھے۔باقی یہ فنِ تعمیر زوال کا شکار کیوں ہے؟۔ممکن ہے ان اداروں نے بھی شکستِ تعمیر کا فلسفہ پڑھا ہوا اور اس نیستی کو کارآمد سمجھتے ہوں۔انھوں نے یہ بھی تو پڑھا ہوگا یا نہیں شاید نہیں پڑھا ہوگا۔اور یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ

A thing of beauty is a joy for ever

Art can only be created once , and even the same person cannot create thesame thing again may be Picture of the Sun flower and Monaliza or Taj Mahel or Lal Qila.

اقوامِ متّحدہ کے ادارے بھی اندھے ہوگئے اس تاریخی عمارت کو برباد کرنے کی واقعی کوشش ہو رہی ہے۔مگر کوئی آواز نہیں اٹھ رہی ہے۔فن اور جمالیاتی اشیاء ملک کا سرمایہ اور قومی دولت ہے اور اسکا مذہب اور سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔میں اپنے خیالوں میں اداسی سے ٹہلتی جارہی تھی کہ گھاس پہ ایک ہدہد کو دیکھا اسنے بھی شانِ استغنا سے ہمیں دیکھا۔اور مصروف نغمہ رہی ہم نے آہستہ سے وڈیو بنالی، ایسا محسوس ہوا کہ لاہور کے شاہی قلعے میں کھڑے ہیں۔کالج کا پورا گروپ تھا۔ہم لوگ گھاس پہ بیٹھے سینڈوِچ کھارہے تھے اور سیاست بگھار رہے تھے تو ایسے ہی ہدہد آکر بیٹھ گئی اور یہ بحث شروع ہوگئی کہ ہدہد بیٹھا ہے یا بیٹھی ہے اور اس عالمانہ بحث میں ہمیں اپنی بس تک پہنچنا بھول گیا اور پھر خوب ڈانٹیں پڑیں۔میں نے خود کو یقین دلایا۔ یہ لاہور نہیں ہے اگرچہ لگ لاہور رہا تھا۔ عجیب بات کہ لوگوں کے رنگ و روپ بھی ویسے ہی لاہوریوں جیسے۔ پنجابی بھی ویسی۔۔اور پھر اکثریت اردو بھی اچھی بول رہی تھی گو وہ لاکھ اس کو ہندی کہیں کہ ہے نہیں ہے۔ہمیں وہ چھوٹی سی مسجد بطورِ خاص اچھی لگی جو سنگِ مرمر کی تھی اور انتہائی گندی رکھی جانے کے باوجود زبانِ حال سے کہہ رہی تھی۔اس مسجد میں بادشاہ تہجد پڑھا کرتے تھے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ وہ کونسا بادشاہ تھا۔ قلعے کا گرم پانی اور ٹھنڈے پانی کا نظام بھی اچھا لگا مگر اس کی حالت ایسی خستہ تھی کہ کچھ میں متاثر نہ ہوسکی ڈھلتے سورج کی آخری کرنوں میں ہم نے قلعہ کی جتنی فلم بنا سکتے تھے بنالی خصوصاً اس سنگِ مرمر کی مورتی مسجد کی۔

پھر میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جو کبھی نہیں دیکھا تھا۔میں نے قلعہ کی دیوار سے نیچے پچھواڑے جھانکا پہلی بات حیرت انگیز معلوم ہوئی کہ پچھواڑے کی نیچائی بہت زیادہ تھی ہر چیز بہت چھوٹی نظر آرہی تھی اور یہاں آتے وقت محسوس بھی نہ ہوا تھا کہ ہم اتنی بلندی پہ چڑھے ہیں راستہ سیدھا ہی لگا، دوسرے اتنا زیادہ انسانی ہجوم بھی کبھی نہیں دیکھا تھا، غالباً ادھر غریب طبقے کی کوئی منڈی وغیرہ تھی۔کھانے پینے کی چیزوں سے لیکر فرنیچر اور برتن اور جانے کیا کیا۔اس لاکھوں کے ہجوم سے صرف غربت عیاں تھی اور مجھے حیرت نہ ہوگی اگر کوئی بتائے کہ ان فلاکت زدہ لوگوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا۔اس قیامت کے ہجوم کو دیکھ کر مجھے چکر سا آگیا۔نظام لدین، لال قلعہ۔شاہی مسجد اور اسکے اردگرد کے علاقے میں مسلمانوں اور غریبوں کی اکثریت اور بھر مار دیکھی تو۔ **Slum Dog Millionaire** والا منظر تھا، یہ منظر جو ایشیا کے ملکوں کا طرۂ امتیاز ہے۔اور اس معاشرہ کا بخت اور انعام ہے جہاں انگریزوں کے بلند اقبالی نے حکومت کی ہے۔

جہاں طبقاتی تفریق ہے۔ جہاں اپنے ملک سے غداری کرنے والوں کو سراہا جاتا ہے۔ جہاں اسلام کو گالی دینے والوں کو سونے میں تولا جاتا ہے۔انعامات دیئے جاتے ہیں برقعہ پوش عورتیں بھیک مانگ رہی تھیں اور لوگ جھڑک رہے تھے۔''بس بچے پیدا کئے جاؤ تم لوگوں کو اور کام کوئی کام نہیں۔ویسے مجھے کسی نے یہ بھی بتایا (دروغ بر گردنِ راوی) کہ برقعہ بھیس بدلنے کا بہت اچھا ذریعہ ہے۔ بھیک مانگنے آوارگی کے مشن پہ جانے شوہروں اور والدین سے چھپ کر دوستوں سے ملاقات کو جانے کے لئے کسی بھی مذہب کی عورت استعمال کرسکتی ہے بلکہ لندن میں ایک وا قف کار ہندستانی خاتون نے یہ بھی بتایا کہ prostitution کے لئے بھی نچلے درمیانی طبقے کی اونچے خواب دیکھنے والی لڑکیاں اسکو استعمال کرتی ہیں۔ نچلے درمیانی طبقے کی کالج یونیورسٹی کی طالبات کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیوں کے سے ٹھاٹھ کرنے کے لئے رات کو پانچ ستارہ ہوٹلوں میں کچھ سیشن لگا لیتی ہیں انھوں نے کہا اس میں بلاتفریقِ مذہب لڑکیاں ایسا کرتی ہیں۔طبقاتی تفریق حد سے زیادہ ہے۔ انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ مسلمان لڑکیاں ابھی اس بزنس میں بہت پیچھے ہیں اسلئے کہ وہ backward ہیں انھیں ابھی ہوا نہیں لگی ہے ترقی کی یا والدین لکیر کے فقیر ہیں۔

پاکستان میں بھی معاشی تفریق ہے مگر ہندوستان میں یہ تفریق کئی قسموں میں ہے اور یہ طبقاتی تفریق حد سے زیادہ ہے اور جتنے بھوکے ننگے وہاں نظر آتے ہیں پاکستان میں نہیں نظر آتے تاہم ہندوستان میں ظاہری فلاکت، یعنی بھوک اور ننگ جتنا نظر آتا ہے وہ پاکستان میں نظر نہیں آتا پھر بھی ایک بات خاص جو میں نے محسوس کی وہ یہ کہ یہاں کے عوام امن پسند، خاکسار، اور تقدیر پرست ہیں۔صدیوں کی ذات پات کی تفریق نے انھیں چل کر یقین دلا دیا ہے کہ انکے لئے کچھ نہیں۔اونچے ذات والوں کا ہر چیز پہ حق ہے۔ پاکستان کی خوشحالی بھی اچھے انتظام کی مرہونِ منت ہرگز نہیں یہ غریب عوام دوسرے ملکوں میں جان کھپاتے ہیں تو معاشی حالات بہتر ہو جاتے ہیں ملک کا خزانہ کم سے کم اور قرضے زیادہ سے زیادہ ہو رہے ہیں۔

ہندستان کی ملکی معیشت اور قوتِ زر مضبوط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان نے بہت سے مسئلے بزورِ شمشیر و طاقت حل کر لئے ہیں۔ اسکی بے پناہ افرادی قوت سے سب ڈرتے ہیں۔جیسے امریکہ سے ڈرتے ہیں جہاں تک دنیا بھر میں مسلمانوں کی آبادی اور ذلت کی بات ہے سورہ نحل کی ایک آیہ کافی ہے یہ فلسفہ سمجھنے کیلئے ''اللہ تعالیٰ ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے جو پورے امن اور اطمینان سے تھی (خوشحالی کی بہتات تھی) رزق ہر طرف سے چلا آتا تھا پھر انھوں نے کفرانِ نعمت کیا(اللہ کے احکامات کو پس پشت ڈال دیا) تو انکی بداعمالیوں کی سزا یوں ملی کہ بھوک اور خوف انکے تن کا لباس ہو گئے۔خوف جان کا' ایمان کا' عزت کا۔

چہاردانگِ عالم میں محرومی کا آسیب تعاقب میں ہے اور ناکامی اور بھوک آگے آگے۔

قلعہ ہم دیکھ چکے تھے سورج کی الوداعی کرنیں مرتے ہوئے دن پہ گریاں سی تھیں۔وقت کے آج اس حصے میں میں کھڑی تھی جہاں ہزاروں لوگوں کے قدم پڑے ہوں گے۔ ہزاروں بار دلی لٹی، ہزاروں بار خون کے دریا بہے۔وقت کسی کے لئے نہیں رویا۔ مینا بازار شہزادیوں کی خرید و فروخت۔ پھر شہزادیوں کا شہر میں مارے پھرنا، پھر جانے کیوں مجھے غرناطہ اور اور قرطبہ کے محلات اور مکینوں کی ذلت اور مراکش میں انکے بھیک مانگنے کی داستانیں اور غریبوں کے خون کے بہتے دریا، میں لرز گئی۔سورج غروب ہو گیا تھا ہم نے مغرب کی نماز ادا کی اور شو کے انتظار میں بیٹھ گئے ایک بات اور۔۔۔۔مچھروں کے حملے بھی بالکل پاکستانی مچھروں جیسے لگے بھنبھنا کر کہہ رہے ہیں۔آخر کو تو خون کے رشتے ہیں سرحدیں رشتے تھوڑی توڑ سکتی ہیں۔شو کا مزہ کرکرا کر دیا۔ان مچھروں نے۔

شو ایک ریڈیائی تمثیل پہ مشتمل تھا اور صوتی اثرات اور مکالموں کے ساتھ بہادر شاہ ظفر کی اس قلعہ میں آخری رات کا منظر تھا۔ پس منظر سے انگریزی فوجوں کی گولہ باری اور لوگوں کی چیخ پکار بھی سنائی دے رہی تھی اور قلعہ والوں کا ہراس اور جان کا خوف، فاعتبروا یااولی الابصار۔

شام کو گھر کے لئے گاڑی میں بیٹھے تو قیامت کا ہجوم بھی کراچی کی ٹریفک کو مات کر رہا تھا۔ویسا ہی ہجوم البتہ یہاں ایک عجیب چیز دیکھی۔ حیران اور پریشان ہوئے وہ یہ تھا کہ Dual carraige way کے بیچوں بیچ مسٹنڈے بیل بیٹھے ہوئے ہیں۔مزے مزے جگالی فرما رہے ہیں شانِ استغنے سے دائیں بائیں جائزہ لیتے جا رہے ہیں۔میں تو کانپ گئی کہ اگر یہ حضرت طے کرتے ہیں کہ اب اِسطرف کا سروے مکمل ہو گیا اور اب مخالف سمت چل کر نظارہ فرمائیں تو پھر ٹریفک کا کیا ہوگا؟ اور ان مہاتما کا اپنا کیا ہوگا؟ ٹیکسی والے نے تبصرہ کیا۔جی ہونا کیا ہے؟ کہ کچھ نہیں ہوگا۔اگر کوئی غریب عورت گزرنے لگے تو ڈرائیور مار جائیں گے مگر ان کے لئے انھیں رکنا ہوگا۔۔۔ میں سخت پریشاں ہوئی یہ کیا حماقت ہے غیر ملکی کیا کرتے ہوں گے؟

ایک بات اور انہونی معلوم ہوئی میری خالہ زاد بہن کے گھر کے باہر تین منٹ کے فاصلے پہ میدان میں ایک بہت بڑا برگد کا درخت تھا۔درخت کا قطر ڈیڑھ گز ہوگا اس کے گرد اینٹوں کا گولائی میں چبوترہ بنا تھا یہ چبوترا اتنا بڑا تھا کہ اس پہ بلا مبالغہ بیس لوگ گھیرا ڈالکر بیٹھ سکتے تھے۔ گول چبوترے کی بیرونی دیوار کی گولائی صرف ایک فٹ چوڑی اور لکھوری اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔بیچ کا دائرہ کچی مٹی کا رکھا گیا تھا چبوترہ زمین سے ایک فٹ اونچا تھا۔یعنی اس کچی جگہ پہ پانی چھڑکا جا سکتا بلکہ لپائی بھی ہوئی لگتی تھی۔ برگد کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھنا کتنا اچھا لگتا ہے، اور وہاں کچھ دھوتی والے حضرات تلک وغیرہ لگا کر کبھی گیروے کپڑے پہن کر بیٹھے ہوتے پر عجیب بات جو مجھے لگی وہ یہ تھی کہ اس درخت کی جڑ سے قریب قریب دائرے میں دودھ، مٹھائی اور بھی کھانے کی چیزیں ڈال دی جاتیں پوچھنے پہ میرے بہن بہنوئی نے بتایا کہ صبح جو گھنٹی اور کچھ گیت نما گانے کی آواز آتی ہے اور ترنم آپ پوچھ رہی تھیں نا وہ اس نغمۂ عبادت کی آواز ہے جسے بھجن کہتے ہیں۔

پنڈت جی زیادہ تر تازی چیزیں تو گھر لے جاتے ہیں مگر باقی کچھ چیزیں اس درخت کے لئے چھوڑ جاتے ہیں،اس درخت کے اردگرد سڑے ہوئے کھانے اور دودھ کی الٹی جیسی بدبو سے ناک نہیں دی جا رہی تھی پھر جب دھوپ تیز ہوتی اور انسان نہ ہوتے تو کتے بلیاں استراحت فرماتے اور اپنی تواضع فرماتے کوے اپنے بھائی بندوں کی مشاورت کرتے۔دوپہر کو لوگوں کو بیدار رکھتے۔مجال ہے کوئی آرام کر سکے۔میں حیران ہوئی بیحد یہ کیسی پوجا کی جگہ اور کیسی پوجا ہے؟ بہرحال خالق نے خود انسان کو آزادیِ انتخاب دی ہے جس کا جی چاہے پوجا کرے۔میں کون تے خوامخواہ۔۔۔۔میں مسلمانوں سے ہی نالاں رہتی ہوں کہ مسجدوں کے لوٹے ٹوٹے ہوتے ہیں اور غسلخانے گندے ہوتے ہیں۔

یہ بھی اتفاق تھا کہ اسی دن مجھے اسماعیلی عبادت گاہ لوٹن پارک جانے کا ارادہ تھا۔ہم گئے بھی پیرس کے میوزیم کی طرح کی شیشے کی چھت اور پوری عمارت شفاف لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ عمارت ایشیا میں ہے خاص کر جب صبح والی عبادت کا انداز دیکھا اور شاہی مسجد کی کائی زدہ عمارت یاد آئی تو سوچا ہم کیوں یہ صفائی نہیں رکھ سکتے؟

ایک جگہ لکھا تھا'' کسی بھی فرقے کے لوگ اپنے طریقے سے یہاں عبادت کر سکتے ہیں''

یہاں بھی انکی رواداری کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکی اور فوراً نمازِ ظہر ادا کر لی، ہمارے رسولﷺ نے سفارت میں آنے والے ایک عیسائی وفد کو مسجد میں عبادت کی اجازت دی تھی اور ہم آج وہابی، بریلوی، شیعہ اور سنی اگر کوئی دوسرے فرقے کا آدمی مسجد میں داخل ہوجائے تو پاگلوں کی طرح اسے دھونے لگتے ہیں۔مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے،واقعی اسکی صفائی سے دل خوش ہوگیا۔وہاں سے ہم لوگ نظام الدین اولیا گئے۔بہت چھوٹی چھوٹی گلیوں اور بھیڑ بھاڑ سے گذر کر مزار تک پہنچے تنگ گلیوں میں دوکاندار ہمارے ہاتھ ڈوپٹے بیچنے کے لئے جان کو آگئے۔پھڈے بازی کے اڈے لگ رہے تھے اسلئے کہ ان سے ڈوپٹہ خرید کر لوگ مزار پہ چڑھائیں اور وہ چند لمحوں میں وہ ڈوپٹے واپس لاکر کسی دوسرے گاہک کے ہاتھ بیچ دیں کیا ٹھگی ہے۔؟ ویسے بھی بھلا اتنے بڑے بزرگ کو اتنی مدت کے بعد ڈوپٹوں کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ وہ ڈوپٹے بیچنے کے لئے ہمارے پیچھے دوڑے اور انکار کے باوجود جان چھوڑنے پہ تیار نہ ہونے والے سے ہم نے یہی سوال جڑ دیا۔کہ خواجہ کو ڈوپٹہ کیوں چاہیئے؟ اسنے حیرت سے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور پھر ایسے مایوسی سے گردن ہلاتا چلا گیا گویا ہم نے اسلام ترک کر دیا ہو۔ہم سوچتے ہوئے مزار میں فاتحہ کیلئے داخل ہوگئے ایک صاحب بڑا سا رجسٹر لئے جنت میں داخلے کا پروانہ صرف چند ہزار میں بانٹ رہے تھے۔صرف چند ہزاروں کا سوال تھا۔

بغیر جواب دیئے ہم مزار کے کمرے سے باہر فقیروں کی بھیڑ میں سے گزرتے ہوئے واپس آرہے تھے تو دیکھا ایک سوکھی دبلی ہندو عورت ایک ہاتھ میں بے حد بیمار بچہ اور دوسرے ہاتھ میں موٹا تگڑا مرغا لئے کھڑی تھی۔میں نے پوچھا۔بی بی کیا بات ہے؟'' کہنے لگی میرا بچہ کئی ماہ سے بیمار ہے مجھ سے مجاور نے کہا ہے ایک مرغا مزار پہ چڑھاؤ تو بچہ ٹھیک ہوجائے گا''۔میں نے دل میں کہا upon my dead body یہ مرغا مجاور کو ہرگز نہ ملے گا۔میں نے اس عورت سے کہا دیکھو میں بھی پیر ہوں سیدزادی ہوں میری بات مانو۔یہ مرغا لے جا کر کٹوا کے یخنی بنا کر بچے کو پلاؤ۔اور پھر اسکے گوشت کو پکا کر پورا کنبہ بیٹھ کر اکٹھے کھاؤ۔میں بچے پہ دعا پڑھ دیتی ہوں میں نے وہ ہی دعا پڑھی جو رسول اللہﷺ حضرت حسینؓ پہ پڑھتے تھے میں نے چپکے سے بچے کے ہاتھ میں کچھ دیکر کہا یہ پیروں کی طرف سے تحفہ ہے اس سے بچے کا علاج کروالینا اور اگلے ہفتے گھر بیٹھ کر ایک اور مرغا بچے کو کھلانا برکت ہوگی پیروں کے ہاتھ سے ضرور لینا چاہیے پرساد ہے۔''مگر پیر تو صرف لیتے ہیں'' اس نے کنفیوز ہو کر کہا۔میں نے تاکید کی کہ اب جلدی سے بھاگو یہاں سے،وہ واقعی جلدی سے بھاگی مجھے خطرہ تھا کہ کہیں مجاور مرغے کے نقصان کی وجہ سے مجھے مرغا نہ بنادے بیچاری عورت آنسو پونچھتی تیز تیز آگے چلی گئی میں نے دعا بھی کی اللہ بچے کو صحت دے جس طرح جاتے ہوئے اس نے آخری بار مجھے دیکھا تو لگ رہا تھا کہ اسے مجاور سے کہیں زیادہ میری بات کا یقین آگیا تھا کہ بچہ میری دعا سے ٹھیک ہوجائے گا باقی اللہ جانے کیا ہوا اس بچے کا میں بچے کے لئے دعا کرتی رہی کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔اس سے زیادہ میرے بس میں نہ تھا۔

وہاں سے ہم ہمایوں کے مقبرے پر گئے۔اور پھر انڈیا گیٹ گئے جہاں آزادی کے لئے لڑنے والوں کے نام ایک دیوار پہ لکھا تھا ہمارے ایک عزیز آزاد ہند فوج میں جاپان میں اتحادیوں کے خلاف لڑے تھے اور فوت ہوگئے تھے۔اور سید احمد بریلوی کے ساتھ تو سارا ددھیال شہید کر دیا تھا بھلا کس نے یاد رکھا ہوگا؟ کس نے انکا نام لکھا ہوگا؟ مگر کسی نے بھی نہ لکھا ہو تو بقول میرے دادا کے عزت سے جئے عزت سے مر گئے کافی ہے۔

اس دیوار کا فنِ تعمیر اور علاقہ شانزاں لیزاں کی یاد دلا رہا تھا۔اردگرد بے انتہا بڑا پارک تھا۔بعد میں جہاں سے گزر رہے تھے بہت بڑا جدید طرز کا بازار تھا مگر وقت کی کمی کے باعث میں نے ارادہ بدل دیا۔اور نہیں گئے یورپ میں امریکہ میں بہت بڑے بڑے بازار دیکھے۔کوئی دلچسپی نہیں تھی۔گھر جا کر آرام کرنا بہتر محسوس ہوا۔

دوسری صبح ہمیں ایک بہت اہم جگہ جانا تھا جو میری زندگی میں ہی اہم نہیں تھی ہندستان کی تاریخ میں بھی تھی۔فن کی تاریخ میں بھی جس میں وقت کو شکست دینے کی طاقت تھی یعنی آگرہ جانا تھا۔تاج محل دیکھنا تھا میری زندگی میں اسکی اہمیت اسلئے ہے کہ وہ میری جائے پیدائش ہے۔

صبح آفس جانے والوں کی ٹرین سے پروگرام بنایا۔میری خالہ زاد بہن بہنوئی اور بچے اسٹیشن تک پہنچانے آئے لاکھ منع کرنے کے باوجود انھوں نے دو لوگوں کے درمیان پورا ناشتے دان بھر کر دے دیا تھا غالباً ہندوستانی مہمان نوازی کا حصہ ہے۔یورپ میں یہ سب اہتمام نہیں ہوتا۔

آگرے سے ایک اسٹیشن پہلے اتفاق سے ٹی۔ٹی صاحب آگئے ہم نے ان سے ہوٹلوں اور کار کرائے پہ لینے کے لئے معلومات حاصل کی انھوں نے مشورہ دیا کہ گاڑی دن بھر کے لئے ڈرائیور سمیت لیے لیں بہتر ہوگا۔جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ میری جائے پیدائش ہے تو وہ ایک دم بہت خوش ہوئے کہنے لگے پھر تو آپ میکے آئی ہیں پہلے ہمارے گھر چلیں وہیں ٹھہریں میں نے پورے خلوص سے انکا شکریہ ادا کیا۔اتنا کہہ دینا بڑی بات ہے آج کا زمانہ ہوتا تو کوئی ہندو ہرگز زبانی بھی یہ نہ کہتا کہ میرے گھر ٹھہر جاؤ وہ مجھے دہشت گرگردانتا۔یہی نہیں ٹی۔ٹی صاحب نے ہمیں ایک پرائیویٹ کار والے سے متعارف بھی کروادیا کہ جتنے دن آگرہ میں ہیں ہم روزانہ کے حساب سے اسے دن بھر کے لئے ملازم رکھ لیں۔ ہمیں اس کی وجہ سے بہت سی الجھنوں سے نجات مل گئی، وہ ہمارے سارے سامان کے ساتھ ہمیں ہوٹل لے گیا۔اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے کہ ہم لوگ ہوٹل پہنچ گئے ابھی مارچ کا آخر تھا مگر گرمی شدید محسوس ہو رہی تھی۔ چونکہ صبح بہت سویرے اٹھے تھے اسلئے ہم نے رئیسہ اور واحد علی کا دیا ہوا ناشتہ مزے سے کھایا اور ائیر کنڈیشن چلا کر سونے کے لئے لیٹ گئے، دو گھنٹے سو کر میری آنکھ کھل گئی معین سوتے رہے۔میں سوچنے لگی۔کچھ کچھ یادیں خواب سے بیدار ہونے لگیں کچھ سنی سنائی نے بھی حسین روپ دھارا۔

ہمیں صرف اتنا معلوم تھا کہ ہمارے بابا تاج گنج روڈ پہ رہتے تھے اور تاج محل کے بیرونی گیٹ کے اندر جو سرخ پتھروں کی عمارت تھی اس میں ان کا آفس تھا۔اسی لئے آفس کے بہت قریب اسی سڑک پہ رہنے کا گھر تھا۔گھر کا بڑا سا لکڑی کا نقش ونگار والا دروازہ سنگِ مرمر کی بارہ سیڑھیاں چڑھ کر اسکے بعد آتا دس فٹ ضرور اونچا اور آٹھ فٹ چوڑا ہوگا اس میں داخل ہونے کے بعد گھر کا پائیں باغ شروع ہوتا تھا باغ نیم دائرے کی صورت تھا بیچ باغیچے میں ایک بڑا سا چبوترہ تھا جس پہ غالباً بید کی کرسیاں ڈالکر مرد بیٹھتے تھے۔اسکے چاروں کونوں پہ ٹکا کر کاٹیج نما چھت تھی جیسی مری وغیرہ میں ہوتی ہے دیواریں نہیں تھیں۔شام کو پانی چھڑکا جاتا تو وہ چبوترا ٹھنڈا ہو جاتا اور سورج غروب ہونے کے بعد بیٹھنا بہت اچھا لگتا چاروں طرف سے خوب ہوا آتی بڑے بڑے درخت تھے۔ چاروں طرف آم جامن اور نیم شیشم کے چچا بتاتے تھے کہ ''سرکاری مالی تو صرف پودے لگاتا تھا پھل پھول باقی وقت دیکھ بھال وہ کرتے تھے انھیں شوق بہت تھا کئی پھل انھوں نے لگائے تھے جن سے بندر اور لنگور اپنی تواضع کرتے تھے اور وہ ڈنڈا لیکر انھیں بھگاتے پھول بھی کافی تھے چمپا چنبیلی جوہی بیلا'' یہ سب چچا بتاتے تھے اور یہ بھی کہ اسوقت انکی عمر پندرہ سال کی تھی جامن کے درخت میں جھولا پڑا تھا جس پہ شام کے بعد خواتین جھولا جھولتیں غالبا دن کو خواتین کو باغ میں آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔بے پردگی ہوتی اگرچہ بقول چچا کے باغ کی دیواریں آٹھ فٹ اونچی تھیں اور گھر بارہ سیڑھیوں کے اوپر تھا یہ سب قصے چچا بیان کرتے تھے جو اس سنی سنائی کی بناء پہ ہم نے لوگوں سے پوچھا تھا۔اکثر لوگوں نے ہمیں پاگل سمجھا۔ایک صاحب اپنے ہی جیسے نظر آئے۔ان سے پوچھا۔تاج گنج روڈ اور اس پہ باغیچی والا گھر کہاں ہے؟۔وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے میں وہ بچہ ہوں جسکا پسندیدہ کھلونا گم ہو گیا ہو۔کہنے لگے تاج گنج روڈ کے اکثر گھر ہوٹلوں میں بدل گئے ہیں۔تاج محل کی مرمت کی وجہ سے راستے بند کئے ہیں کل تاج محل کے اندر جا کر بڑے دروازہ سے باہر آیئے گا ممکن ہے کوئی سراغ لگے۔ہم اپنا سا منہ لیکر ہوٹل واپس آگئے گرمی کی وجہ سے تھکن اور تھکن کی وجہ۔۔۔بہر حال ہم دونوں ارد گرد گھومتے رہے اور رات کا کھانا کھا کر واپس آئے۔شہر رات کی رانی خصوصاً گرمیوں میں بہار دیتی تھی بقول چھوٹے چچا یہاں بندر بہت تھے۔گیا وہ وقت اور کہاں گئے وہ لوگ؟ میں جو چچا جان کے پیچھے گھومتی اور موقعہ ہاتھ آتے ہی کیاری خراب کر دیتی۔نصف دائرہ کی صورت کے باغ میں ایک نل بھی لگا تھا اسکے گرد پکا چوبچہ (کھرا) سا بنا تھا اس سے نالیوں کے ذریعے کیاریوں میں پانی پہنچانے کا نظام تھا۔ایک طرف ٹماٹر بھی لگے تھے بندروں کے علاوہ چچا کی غیر موجودگی میں بھی حملہ آور ہوتی تھی۔ چچا کہتے کان پکڑ کر کہو اب نہیں چھوؤں گی۔ میں فوراً کان پکڑ لیتی۔اور کہتی توبہ۔چچا جان کہتے تھے ''میں ٹماٹروں کو اس بچگانہ ادا پہ قربان کرنے پہ تیار ہو جاتا اور تمھیں گود میں لے لیتا''

جیسے ہی معین سو کر اٹھے ہم نہا دھو کر اور تر و تازہ ہو کر باہر نکلے سورج کی تیزی اب کم ہو گئی تھی اور شام فرحت بخش محسوس ہوئی آب و ہوا مجھے صاف ستھری اور شام فرحت بخش ایسی لگی جیسے سیالکوٹ کی شام ہو جیسی میرے بچپن میں سیالکوٹ کی شامیں ہوتی تھیں تاج گنج میں ٹہلتے ہوئے اندازہ ہوا کہ بندر درختوں سے آتے تھے۔تاج محل کے چاروں طرف پہلے نیم، جامن، شیشم اور جانے کون کون سے درختوں کا جھمکٹا تھا تاج گنج محلّہ کے گھروں میں بھی اسی طرح گھنے درخت تھے اس سلسلے سے بندر اینڈیاتے پھرتے اور گھروں میں ادھم مچاتے۔

اب ان ذاتی گھروں کی جگہ ہوٹلوں نے لے لی ہے ہم رات کا کھانا ایک بہت اچھے ریسٹورنٹ میں کھانے کے لئے گئے جہاں مغربی اور مشرقی دونوں کھانے موجود تھے ہم نے حسب عادت پوچھا گوشت حلال ہے؟

وجہ یہ تھی کہ وافر مقدار میں اور مختلف نوع شرابیں موجود تھیں۔مینیجر مسکرایا، جی یہاں زیادہ کھانے کا بزنس مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ چونکہ زیادہ گاہک غیر مسلم اور غیر ملکی ہوتے ہیں اس لئے ہمیں شراب رکھنی پڑتی ہے۔مگر گوشت حلال ہی ہوتا ہے۔آپ تردد نہ کیجئے لوگوں کی اردو کا لہجہ ہندو مسلم کوئی ہو بہت اچھا اور اپنا اپنا لگا۔صاف شفاف دلکش کھانے سے فارغ ہوئے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔تھوڑی دیر ٹہلے پھر گاڑی کو فون کر دیا، جانے ہوا میں کیا چیز تھی؟ کیا جادو تھا لوگ جو کہتے ہیں یا محاورہ ہے کہ جہاں ناک رگڑی ہوتی ہے وہاں سے انسان کا خاص تعلق ہوتا ہے ''تو تمہاری نار آواز دے رہی ہوگی''۔میرے میاں مذاق بنا رہے تھے۔ میں تھوڑی سی ناراض ہوئی۔پھر اس بات میں کچھ صداقت محسوس ہوئی ورنہ کیوں؟ میں مسحور سی محسوس کر رہی تھی۔دوسرے دن ہمیں تاج محل دیکھنا تھا۔

مجھے رات کو بستر پہ لیٹے لیٹے خیال آیا کہ میرے دادا جان پٹنہ میں

پیدا ہوئے وہیں تعلیم حاصل کی پھر کسی خاندانی سیاست کی وجہ سے سب کچھ چھوڑا اور گورکھپور آبسے قانون کے پیشے سے تعلق تھا جج سے کسی اصولی معاملہ پہ بحث چھڑ گئی، اس نے کسی دیسی ہندو چپراسی کو گالی دے دی تھی۔ دادا جان کا خیال تھا کہ وہ اپنے فرائض پورے کر رہا ہے تو اسکی عزت ہر ایک پہ فرض ہے جس میں گورا جج بھی شامل ہے۔ گورے کو حیرت تھی کہ اس انڈین کی جرأت کیسے ہوئی مجھ پہ تنقید کی۔ لہٰذا قبل اسکے کہ جج انھیں نوکری سے برطرف کر کے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرتا فوراً استعفےٰ دے کر دس اور سنائیں اور کورٹ کے پچھلے کمروں کو خیر باد کہہ کر باہر آگئے۔ اور اسی دن تحریکِ خلافت کے کارکردگار میں نام لکھوالیا پھر کانگریس میں آگئے۔ سنا ہے بہت تکلیفیں اٹھائیں مگر۔۔۔ سفرِ حیات کا جاری رہا تھکن کے بغیر۔۔ جیل بھی گئے واپس آئے تو آنکھوں کی روشنی پہ گہرا اثر پڑ چکا تھا۔ سیاست کو بھی چھوڑنا پڑا۔۔ بھاگ دوڑ، محنت، آزادی کے خواب اور پھر آگرے آمد۔ بابا برابر شام کو پائیں باغ میں آرام کرسیاں ڈال کر خبریں سناتے۔ بہت سے اردو انگریزی کے اخبارات سنتے۔ بابا بتاتے ہیں الیکشن کی صبح دادا جان نے سب سے کہا۔

مسلم لیگ کو ووٹ دینا حالات بہت خراب ہوگئے ہیں، وہ جو اپنائیت تھی وہ ہوا میں تحلیل ہورہی ہے وہ جو آپس کی محبتیں تھیں اعتماد تھا نمک کی طرح گلا جارہا ہے، ابا آپ کسے ووٹ دیں گے؟ سنا ہے چچا نے پوچھا۔ وہ مسکرائے، میں تو اپنے سفر پہ جارہا ہوں میرے ووٹ کا اب مصرف نہیں رہا۔ اور اس رات کی صبح وہ تہجد کے لئے نہ اٹھے تو معلوم ہوا وہ اپنے طویل سفر پہ روانہ ہوچکے ہیں۔ بابا اور باقی لوگوں نے اتنی بار یہ واقعہ دہرایا کہ مجھے ازبر ہوچکا تھا، وہ اسی شہر میں آرام کر رہے ہیں کون جانے وہاں بھی کوئی بستی بس چکی ہو، جانے کیا نام تھا اس قبرستاں کا؟ کاش کہیں نام لکھ لیا ہوتا اب کوئی بتانے والا نہیں رہ گیا۔ بڑے چچا، ان کا حافظہ ہی ٹھیک نہیں رہا۔ مجھے بے حد مایوسی ہوئی۔ کیا معلوم تھا کہ ابھی اور مایوسیاں میری منتظر تھیں، سوائے ایک فرق کے۔ آگرے میں جہاں کھانے پینے کی دکانیں تھیں وہاں میں نے ایک عجیب چیز دیکھی۔ کالے، کالے سفید دونوں رنگوں کے، بھورے کالے اور بھورے رنگ کے سور ایسے گھوم رہے تھے جیسے پاکستان کے چھوٹے شہروں میں گائیں پھرتی تھیں یا گاؤں میں مرغیاں چگتی ملتی ہیں میں تو سانس روک کر کھڑی رہی سخت موڈ خراب ہوا۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش۔۔ ہم ہوٹل کی طرف چل پڑے صبح سویرے اٹھنا تھا گاڑی بمع ڈرائیور آنی تھی جتنی جلدی نکلتے بہتر ہوتا۔

صبح کو محلّہ تاج گنج سے گزرتے ہوئے ہم نے ان بندروں کو تلاش کیا جنھوں سے ہم میں سے کسی سے پوچھا سنا ہے یہاں ایک زمانے میں بندر اور لنگور بہت ہوتے تھے کہاں گئے؟ مسکرا کر فرمانے لگے ''سب پاکستان چلے گئے میں نے بھی خوش دلی سے فوراً کہا۔۔۔ نہیں ناممکن بندر اپنے پجاریوں اور وفاداروں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ وہ ہمیں گھورتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

تاج گنج روڈ کی طرف جو داخل ہونے کا صدر دروازہ تھا بند تھا اسلئے کار اس سڑک پہ بھی نہیں گئی پچھلے دروازے سے گئی اور مجھے ایک بار سر پیٹ کر رونے کا دل چاہا۔ تاج محل کی بیرونی دیوار پہ اپلے تھپے ہوئے تھے۔ ہم نے ناک پہ رومال رکھا اور منتظمین کی کورذوقی کا ماتم کرتے اندر داخل ہوئے روش پہ چلتے ہوئے ہم نے داہنی طرف نظر اٹھائی اور وہ نظر لوٹ کر نہ آسکی۔ دل نے دھڑکنے سے انکار کر دیا۔ اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر۔ علامہ اقبال کو ایسا ہی محسوس ہوا ہوگا اور انھوں نے مسجدِ قرطبہ کے حوالے سے لازوال نظم لکھی اور میں روتی رہی روتی ہی چلی گئی۔۔۔ جانے صدیاں بیت گئیں۔۔۔ سورہ رحمان میرے وردِ زبان رہی۔ بیچ والی بڑی محراب پہ اوپر سے نیچے سورہ رحمان اور سورہ یسین لکھی ہوئی تھی۔ مگر معلوم یہ ہوتا تھا کہ جواہرات جڑے ہیں۔ رنگوں کا امتزاج ہو کہ نگینوں کی جڑائی۔ میں نے اپنے ڈوپٹے سے دو انچ کا حصہ صاف کیا تو معلوم ہوا کہ یہ حسن اور تب و تاب دھوئیں کی سیاہی کے باوجود ہے ورنہ اسکی اصل چمک ہیرے کی طرح ہے۔

میں نے اندر جا کر قبروں پہ فاتحہ پڑھا اور جمنا کی طرف بنچ پہ بیٹھ کر گزرے ہوئے وقت پہ آنسو بہاتی رہی۔ وقت جو میری زندگی میں تھا تو مجھے اسکی خبر نہیں تھی وقت جب امی بابا دادی اور دوسرے رشتے دار اور گھومنے آنے والے مہمانوں کے ساتھ یہاں آیا کرتے تھے انھوں نے لاتعداد چاندنی راتیں یہاں بیٹھ کر اور حسنِ ازل کے پرتو سے محظوظ ہوتے ہوئے گزاری تھیں اور بارہاسنگِ مر مر کے اس فرش پہ گھٹنوں گھٹنوں دوڑ کر میں نے بابا کا پیچھا کیا تھا، یہیں بابا نے انگلی پکڑ کر مجھے چلنا سکھایا تھا۔ خیالوں کے سلسلے مہینوں سے برسوں پہ محیط ہوگئے۔ پھر صدیاں لپیٹ میں آگئیں۔ ''ابنِ خلدون سامنے کھڑا تھا۔ تاریخ پہ رونا عقلمندی نہیں ہے وقت کو اور تاریخ کو سمجھنا اہم ہے''۔ جمنا ریت میں لیٹا راوی کی یاد دلا رہا تھا۔۔۔ اداسی دل میں اترتی ہی چلی گئی۔۔۔ ظہر میں نے آتے ہی پڑھی تھی اور اب میں نے گھوم کر دیکھا سائے لمبے ہوگئے تھے۔ جانے میرا وہم تھا یا حقیقت۔ مجھے مدھم سی اذان کی آواز سنائی دی۔ میں نے ہجوم کو دیکھا۔ بھیڑ بڑھ رہی تھی۔ بند ہونے کا وقت قریب تھا مسز گاندھی کے قتل کے بعد سے سنا ہے حکومت محتاط ہوگئی ہے۔ کسی متعصب سیاسی جماعت نے انتباہ کیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ تاج محل کو بم سے اڑا دیا جائیگا۔ اسلئے تاج محل جلدی بند کر دیا جاتا ہے۔ میں نے بھیڑ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے عصر کی قصر نماز پڑھی اور آگرے کے سب سے بڑے قبرستان میں سونے والے اپنے دادا جو تحریکِ خلافت کے اہم مجاہد تھے انکے لئے اور اسلام آباد کے حسین قبرستان کو اپنی آرامگاہ بنانے والے اپنے بابا جان کے لئے دعا کی۔ اور غروبِ آفتاب کی آخری کرنوں کو تاج محل کے کلس سے گلے ملتے چھوڑ کر باہر آگئے۔۔۔ اور پھر وہی جنت سے جہنم کی طرف سفر۔۔۔ اپلوں کی گندگی۔۔۔ اور مچھروں کی بھنبھناہٹ سے گذر کر ہم نے مغلیہ دور کی ہی نہیں انسانی تاریخ کی بلا مبالغہ حسین ترین عمارت کو خدا حافظ کہا۔ خدا کرے کہ کسی نیتا کو خیال آگیا ہو اور اب ایسی گندگی سے گزرنا نہ ہوتا ہو اور لوگ صدر دروازے سے داخل ہوتے ہوں۔

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا' امریکہ)

قسط......۲

سلطانہ آپا

ریلوے میں ملازمت ملنے کے بعد میرے والدین کو کھڈرو لائین کی ریلوے کالونی میں رہنے کو ایک کوارٹرمل گیا یہیں میری والدہ کے دو بھائی فضل محمد اور مظہر محمد بھی رہتے تھے۔ اسی کے ساتھ ابا کے پھوپی زاد بھائی سید مبارک حسین جو اب انکے ہم زلف بھی ہو چکے تھے اپنی اہلیہ یعنی میری والدہ کی بڑی بہن مشتری بیگم کے ساتھ اگلی گلی میں رہ رہے تھے۔ یہ زمانہ نسبتاً بے فکری اور آرام کا تھا۔ ریلوے کی آمدنی صرف دو میاں بیوی کے لئے ضرورت سے زیادہ تھی اور تمام قریبی رشتہ دار بھی آس پاس تھے۔ بقول میرے ماموں بس یوں سمجھو کہ روز مال پوئے پکتے تھے اور پایوں کی دعوت ہوتی تھی۔ میری والدہ اپنی بھاوجوں میں بھی بہت مقبول تھیں کیونکہ وہ انہیں اپنی سہیلیاں اور بہنیں سمجھتی تھیں۔

۱۹۲۶ میں میر پور خاص میں زبردست سیلاب آیا جس سے شہر کی زندگی مفلوج ہو گئی۔ سنا ہے کہ لوگ چار پائیوں کے پایوں کے ساتھ گھڑے باندھ کر انہیں کشتیوں کی طرح چلایا کرتے تھے۔ سیلاب کے بعد گندگی اور ناقص نکاسی آب کی وجہ سے بیماریاں بھی پھیلیں اور کہا جاتا ہے کہ کئی اموات ہوئیں۔ اللہ کے فضل سے ہمارا کنبہ اس سے محفوظ رہا ایک تو ریلوے کالونی اپنے جدید قسم کے نکاسی آب کی وجہ سے اس سیلاب سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوئی اور پھر ریلوے کالونیوں کا صفائی اور صحت کا نظام بھی بہت اچھا تھا۔

ریلوے کی ملازمت میں کسی ایک جگہ مستقل طور پر تعیناتی نہیں رہتی اور عام طور سے جلدی جلدی تبادلے ہوتے رہتے ہیں کچھ عرصے یہاں کام کرنے کے بعد ابا کا تبادلہ جودھ پور ہو گیا اور میرے والدین جودھ پور میں آبسے یہاں تو اور بھی رشتہ دار تھے اس لئے یہاں انکو اور زیادہ لوگوں سے ملنے اور تعلقات بڑھانے کا موقعہ ملا۔

یوں تو انکی زندگی بہت آرام سے گذر رہی تھی مگر آئندہ کئی سال تک میرے والدین کو اولاد کی خوشی نصیب نہیں ہوئی اس دوران میری اماں کے پانچ بچے ہوئے مگر وہ سب پیدائش کے فوراً بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ساری پیدائشیں گھر پر ہی دائیوں کے ہاتھوں ہوئی تھیں اور میری والدہ کے مطابق ہر چیز نارمل ہوتی تھی پھر بھی پیدائیش کے چند ہی روز بعد یہ بچے اللہ کو پیارے ہو جاتے تھے۔ ان میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ کچھ تو اتنی جلدی مرے کہ ابھی انکے نام بھی نہیں رکھے گئے تھے۔ میں آج ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے یہ جانتا ہوں کہ تیسری دنیا میں آج بھی INFANT MORATALITY بہت زیادہ ہے تو اس زمانے میں سندھ اور راجستھان کے صحرا میں ایسا ہونا قرین قیاس نہیں اس کے علاوہ INFANT SUDDEN DEATH SYNDROME تو آج بھی ایک معمہ ہے تو اس زمانے میں اس بات کا پتہ لگانا تو بالکل ناممکن ہو گا کہ ان اموات کی کیا وجہ تھی۔

بہر حال اس چیز نے ہمارے کنبے کی اقتصادی حیثیت پر بعد میں بہت اثر ڈالا کہ جب میرے ابا صرف پچپن سال کی عمر میں لازمی طور پر ریلوے سے ریٹائر کئے جا رہے تھے تو انکے بچے ابھی بہت چھوٹے تھے اور اس لئے ہم انکے ریٹائیرمنٹ کے بعد شدید مالی بحران کا شکار ہو گئے۔ اگر پہلے پیدا ہونے والی اولاد زندہ ہوتی تو وہ یقیناً اس قابل ہوتی کہ ابا کا سہارا بنتی۔

یہ صورت حال اس قدر دہشت ناک تھی کہ اس سے قسم قسم کے توہمات جنم لے رہے تھے اور لوگ طرح طرح کی باتیں بنا رہے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ کسی نے جادو ٹونا کر دیا ہے کوئی کہتا تھا کہ ان دونوں میاں بیوی نے کوئی بھاری گناہ کیا ہے۔ میری اماں کسی جادو ٹونے کو نہیں مانتی تھیں نہ ہی وہ ایسے کسی وہم میں مبتلا تھیں کہ یہ کسی گناہ کی سزا ہے۔ وہ صبر و شکر سے اس کو اللہ کی مرضی سمجھ کر قبول کئے ہوئے تھیں۔

پھر بھی لوگوں نے انہیں اور ابا کو بہت سمجھایا اور مجبور کیا کہ وہ کسی بزرگ کے آستانے پر جا کر دعا کریں اور اللہ سے اسکے کرم کی التجا کریں۔ آخر کار یہ سوچتے ہوئے کہ اللہ کے برگزیدہ بندے بھی اللہ اور رسول کے قریب ہوتے ہیں میری اماں اور ابا جودھ پور سے اجمیر خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر گئے اور چادر چڑھا کر اولاد کی زندگی کی بھیک مانگی۔ اس کے بعد یہ لوگ دہلی خواجہ نظام الدین اولیا کے آستانے پر گئے اور وہاں بھی یہی دعا کی اور اس کے ساتھ اللہ سے بھی لو لگائی اور خلوص دل سے اس سے رحم کی درخواست کی۔ ان دوروں کے بعد ابا کا تبادلہ جودھپور سے میر پور خاص ہو گیا اور یہ لوگ میر پور خاص آ کر پھر کھڈرو لائین میں رہائش پذیر ہو گئے۔

کچھ ہی مہینوں کے بعد یہیں یعنی میر پور خاص میں میری سب سے بڑی بہن سلطانہ آپا پیدا ہوئیں۔ انکی پیدائش سارہ دائی کے ہاتھوں ہوئی وہ پاکستان بننے کے بہت عرصے بعد تک بقید حیات تھی اور اپنے پیشے کی وجہ سے

ایک خاص شہرت اورعزت کی حامل تھی۔ پاکستان بننے کے بعد جب دوبارہ ہمارا
کنبہ میر پور خاص میں رہا تو مجھے یاد ہے کہ سارہ دائی ہمارے یہاں آیا کرتی تھی
اور میرے ابّا اور امّاں اس کی خاص آؤ بھگت کرتے تھے۔انکی پیدائش کے بعد ابّا
پھر انہی درگاہوں پر اپنی منت پوری کرنے گئے مجھے اب بھی یاد ہے کہ میرے ابّا
سلطانہ آپا سے انتہائی محبت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میری بیٹی کا بال بال مٹّوں
میں بندھا ہے۔سلطانہ آپا میرے ابّا کی سب سے بڑی اولاد تھیں اور خدا نے
انہیں انتہائی ذہین دماغ، اعلیٰ ذوق، نازک جذبات اور خیالات کی بلندی سے
سرفراز کیا تھا اپنے ان اوصاف کی بنا پر انکا ہمارے کنبے اور خاص طور سے میری
شخصیت پر دیرپا اثر پڑا جسکا تذکرہ بعد میں آئیگا مگر اس سے پہلے ایک اور ایسی
شخصیت کا تذکرہ ضروری ہے جسے ہمارے خاندان میں ہر بچے کے لئے ضرب
المثل کا درجہ حاصل ہے اور یہ تھے سید ذوالفقار حسین۔

سید ذوالفقار حسین

یہ ۱۹۳۰ کے عشرے کا نصف اوّل تھا۔ میرے والدین
میر پور خاص میں رہ رہے تھے اور انکے ساتھ خاندان کے کچھ اور لوگ بھی یہاں
اپنی ملازمت کی وجہ سے رہائش پذیر تھے۔اس وقت سید علی اصغر صاحب جو اب
تک خاندان کے سب سے بڑے تھے اور اپنے مرتبے اور ریلوے میں انتہائی با
اختیار نوکری کی وجہ سے خاندان کے تمام لوگوں کو اپنی ہمدردطبیعت کی وجہ سے
بہت فیض پہنچا چکے تھے ریٹائیر ہو کر واپس مراد آباد جا کر بس گئے تھے۔مرادآباد
میں انکے چھوٹے بھائی سید علی صفدر پہلے ہی ریل کی ملازمت سے وابستہ تھے اور
انہوں نے اس زمانے کے لحاظ سے وہاں ایک بہت شاندار مکان بنوایا تھا۔اس
طرح ہمارا خاندان مراد آباد، جودھپور اور میر پور خاص میں بٹا ہوا تھا۔

ادھر میری بڑی خالہ مشتری بیگم جو سید مبارک حسین کی اہلیہ تھیں کے
سب سے بڑے بیٹے سید ذوالفقار حسین اب جوانی کی سرحدوں میں تھے اور
میرے ننھیال میں اس وقت انکی شادی کا معاملہ سب سے مقدّم تھا۔اس مقام پر
مناسب ہوگا کہ میں اپنی سب سے مرغوب شخصیت اور خاندان کی ایک ایسی قد
آور ہستی، جو آنے والوں کے لئے قابل تقلید اور ضرب المثال بن گئی، کی زندگی پر
کچھ روشنی ڈالوں۔

میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ مشتری بیگم اور سید مبارک حسین کی
شادی بڑی حد تک ڈاکٹر مظفر حسین کے مرتبے کے زور پر ہوئی تھی شادی کے
بعد سید علی اصغر صاحب کی مہربانی سے مبارک حسین صاحب کو ریلوے کی معمولی
نوکری مل گئی تھی جس میں انکا کثیر العیالی کی وجہ سے بس کھینچ تان کر گذارا ہو جاتا
تھا۔اس کے ساتھ ہی ہماری نانی کی اولاد کا تعلیمی اور معاشی پس منظر اور
معیار زندگی بھی بوجوہ، خاندان کے باقی لوگوں سے کم تر تھا جس کا احساس انکی
تیسری نسل کو بہت زیادہ تھا۔باقی خاندان کے معیار پر آنا اور ہمسری کے ساتھ
سر اٹھا کر چلنا صرف ایک ہی طرح ممکن تھا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کی جائے اور تعلیم
کے بل پر وہی عہدے اور مرتبے حاصل کئے جائیں جو خاندان کے اعلیٰ ترین لو
گوں نے حاصل کئے تھے۔اس وقت تک بیاجی کے خاندان میں سب سے با
اختیار اور قابل عزت ملازمت انکے بڑے بیٹے سید علی اصغر نے کی تھی۔مجھے بتایا
گیا ہے کہ اس زمانے کو دیکھتے ہوئے اور خاص طور سے میری نانی کے خاندان
کے سماجی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات تقریباً ناممکن سمجھی جاتی تھی کہ ان کی
نسل سے کوئی فرد اپنے مرتبے اور سماجی حیثیت میں سید علی اصغر کی برابری کر سکے گا
ان حالات میں اللہ تعالیٰ کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ ترقی کسی کی جاگیر نہیں ہوتی اور یہ
انسان کی اپنی صلاحیتوں اور قوت ارادی پر منحصر ہوتی ہے۔اس نے اصغری بیگم کی
نسل میں جو خود بھی اپنے بھائی سید علی اصغر کی کفالت میں تھیں ایک ایسے شخص کو جنم
دیا جو اپنی محنت، مضبوط قوت اردی اور صلاحیتوں کے بل پر اسی مرتبہ کو پہنچا جو کبھی
سید علی اصغر صاحب کو حاصل تھا اور یہ تھے مشتری بیگم اور سید مبارک حسین کے
بیٹے سید ذوالفقار حسین۔

ذوالفقار بھائیجان جو میری بڑی خالہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے
۱۹۱۰ میں جودھپور میں پیدا ہوئے۔وہ اس قدر ہمہ صفت انسان تھے اور اتنی بہت
سی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے کہ اگر ان سب کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ کیا
جائے تو یہ صرف ایک فرضی داستان لگے گی اور لوگ اس پر یقین کرنے میں پس و
پیش سے کام لینگے۔شاید یہ انکے والد کا، جو نہ صرف کم تعلیم یافتہ تھے بلکہ جسمانی
طور پر بھی بہت منحنی اور کمزور تھے، اپنا احساس محرومی تھا کہ مجھے خود ذوالفقار بھائی
جان نے بتایا کہ انکے ابّا جب انہیں بچپن میں شفقت سے گلے لگایا کرتے تھے تو
وہ ان سے بار بار ایک ہی بات کہا کرتے تھے کہ ''ذلّو بس تو میرے لئے دو کام
کر دے۔ایک یہ کہ تو اتنی ورزش کر اور کھا پی کر ایسی جان بنا کہ لوگ تجھے دیکھیں
اور دوسرا یہ کہ میں تیرے گلے میں بی۔اے کی ڈگری لٹکتی دیکھوں''۔یاد رہے
۱۹۳۰ میں بی اے کی ڈگری بڑی چیز تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ذوالفقار بھائی جان کو صلاحیتیں بھی ایسی دی تھیں اور پھر
انکی قوت ارادی بھی ایسی مضبوط تھی کہ وہ جو چاہیں کر سکتے تھے۔انہوں نے دل لگا کر
ایسی محنت اور توجہ کے ساتھ تعلیم حاصل کی کہ نہ صرف اپنے نصابی تقاضے پورے کئے
بلکہ ہر وہ چیز پڑھ ڈالی جو پڑھنے کے قابل تھی۔اپنی زندگی کے آخیر تک وہ کچھ نہ کچھ
پڑھتے رہے۔میں نے زندگی میں آج تک کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس نے ان
سے زیادہ کتابیں پڑھی ہوں۔اسی وجہ سے انکا علم اس قدر دقیق تھا اور انکی عام
معلومات اس قدر وسیع تھیں کہ وہ آرٹس کے گریجویٹ ہونے کے باوجود سائنس اور
دوسرے شعبوں کے بھی عالم تھے۔انہوں نے ناموافق حالات کے باوجود تعلیم
جاری رکھی اگر چہ میٹرک کے بعد انکو بہت اچھی ملازمتوں کی پیش کشیں تھیں مگر
انہوں نے اپنے باپ کی خواہش پوری کرنے کے لئے آخر کار جودھپور کے کالج سے

۱۹۳۲ء میں بیچلر آف آرٹس کی ڈگری حاصل کی اور بقول انکے گھر آ کر اپنی ڈگری اپنے گلے سے اتار کر اپنے ابّا کے گلے میں ڈال دی۔

ذوالفقار حسین نہ صرف انہوں نے اپنے ابّا کی یہ خواہش پوری کی بلکہ انکی دوسری خواہش بھی بدرجہ اتم پوری کی یعنی لڑکپن سے تن سازی اور ورزش پر اتنی سنجیدگی سے توجہ دی کہ ریاست میں کئی تن سازی کے انعامات اور اعزازات جیتے۔اب بھی ایسے لوگ بقید حیات ہیں جو اس بات کے عینی گواہ ہیں کہ انہوں نے سرکس کے پیشہ ور پہلوانوں کو چیلنج کر کے اپنے سینے پر کئی من کی پتھر کی سلیں تڑوائیں۔

اس کے علاوہ اپنی قوت کا ایسا حیرت انگیز مظاہرہ کیا کہ وہ عرصے تک لوگوں کے ذہنوں پر طاری رہا۔اس زمانے میں انہوں نے سنا تھا کہ کچھ پیشہ ور پہلوان اپنے ہاتھ سے کار کے پہیے کو پکڑ کر کار کو روک دیا کرتے تھے۔ انہوں نے جودھپور کے راجہ کی کار کے ڈرائیور سے کہا کہ وہ یہ مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔ڈرائیور سے یہ بات طے ہوئی کہ وہ جھٹکا دے کر کار کو نہیں اٹھائیگا بس جب یہ ایک ہاتھ سے پہیئے کو مظبوطی سے پکڑ لینگے تو وہ آہستہ آہستہ رفتار بڑھائیگا حتیٰ کہ اس کی رفتار دس میل فی گھنٹہ ہو جائے۔وقت مقررہ پر لوگوں کا ایک جم غفیر جمع ہو گیا انہوں نے پچھلا ایک پہیہ پکڑ لیا اور ڈرائیور نے آہستہ آہستہ رفتار بڑھائی یہاں تک کہ کار دس میل فی گھنٹہ کی حد کو پار کر گئی۔کار کے تین پہیے گھوم رہے تھے اور کار اپنی جگہ ساکن تھی۔سنا ہے کہ لوگوں نے اس قدر تالیاں بجائیں اور بعد میں پورے شہر میں انکا جلوس نکالا گیا اور انکے گلے میں اتنے ہار ڈالے گئے کہ سانس لینا مشکل ہو گیا۔

کھیلوں کے بھی شوقین تھے اور فٹبال میں اس قدر نام پیدا کیا کہ یونیورسٹی اور بعد میں آل انڈیا مقابلوں میں حصہ لیا۔انہی کھیلوں کی وجہ سے کئی دفعہ زخمی ہوئے اور جسم کی کئی ہڈیاں بھی تڑوائیں۔

اہم بات یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ وہ ایک عالِم، انتہائی پڑھے لکھے اور مہذب شخصیت تھے۔اسی کے ساتھ وہ ایک مفکر بھی تھے فلسفہ ویسے بھی بی اے میں انکا خاص مضمون تھا انہوں نے فلسفہ حیات اور فلسفہ کے تناظر میں مذہب کی تعریف میں نجی محفلوں میں معرکتہ الآرا لیکچر دئے اور کئی مقالات لکھے جو اس وقت کے جریدوں میں شائع ہوئے۔پہلوانی اور اس سے متعلق حرکتیں تو صرف وہ اپنے باپ کی آرزو پوری کرنے کے لئے کر رہے تھے۔ اس دور میں بھی جب عام مسلم گھرانوں میں تھیٹر اور موسیقی خاص طور پر کلاسیکی موسیقی کو بڑی حد تک بدعت اور قابل اعتراض سمجھا جاتا تھا وہ تھیٹر کے شوقین تھے اور بہترین ایکٹر اور شاندار گلوکار تھے انہوں نے نہ صرف کالج کے ڈراموں میں باقاعدگی سے حصہ لیا اور مختلف لیڈنگ رول کئے بلکہ جب وہ خود ایک بڑے عہدے پر لگے تو انہوں نے اپنے محکمے میں شوقیہ ڈرامہ کلب کی بنیاد رکھی۔اور کئی ڈراموں کی ہدایت کاری کے فرائض انجام دئے۔

اتنے بہت سے نصابی اور غیر نصابی اعزازات کے بعد اور ''گلے میں بی اے کی ڈگری'' کے ساتھ تو وہ کسی بھی اعلیٰ گھرانے کی بہترین لڑکی سے شادی کے خواہشمند اور حقدار ہو سکتے تھے۔ ہماری نانی اور انکی اولاد نے اس بات پر بہت سنجیدگی سے غور کیا کہ ذوالفقار بھائی جان کے لئے خاندان کے کس گھر میں دست سوال دراز کیا جائے۔ذوالفقار بھائی جان کے کارناموں اور تعلیمی اہلیت نے ان کے گھر والوں میں زبردست خود اعتمادی پیدا کر دی تھی آخر کار سب نے اتفاق رائے سے اس بات کا فیصلہ کیا کہ علی اصغر صاحب کی چھوٹی بیٹی رشیدہ بیگم کے لئے ذوالفقار حسین کا رشتہ دیا جائے۔رشیدہ بیگم خوش ذوق دراز قد نازک اندام اور پر کشش دوشیزہ تھیں جنکے چہرے پر ہر دم ایک مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔اس رشتہ نے اگرچہ خاندان میں ہلچل مچا دی مگر جوڑا مناسب تھا اور حقیقت میں اس وقت پورے خاندان میں ذوالفقار بھائی جان کا ہم پلّہ کوئی نہیں تھا اس لئے یہ رشتہ منظور کر لیا گیا۔

''نو گاؤں'' کی روائیت کے عین مطابق ذوالفقار بھائی جان کی شادی سے کچھ مہینے پہلے انکے ابّا سید مبارک حسین صاحب کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنے بڑے بیٹے کا سہرا دیکھنے کی حسرت دل میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔بہر حال انکی شادی بڑے اہتمام اور شان و شوکت سے ہوئی اور دولہا ہاتھی پر بیٹھ کر بارات لیکر گیا۔جودھپور میں ہاتھی پر بارات جانا اس وقت کے لحاظ سے شان و شوکت کا اعلیٰ ترین مظاہرہ تھا۔

ذوالفقار بھائی جان کا بی اے کرنا یا علی اصغر صاحب کی دختر سے شادی کرنا انکی نظر میں خاندان میں اعلیٰ ترین مرتبہ حاصل کرنے کے لئے اب بھی کافی نہیں تھا۔اب انہوں نے اس ملازمت کا امتحان دیا جو سید علی اصغر صاحب کیا کرتے تھے۔اس وقت بھی یہ ملازمت زیادہ تر انگریزوں یا بہت ہی ذہین اور چنیدہ ہندوستانیوں کو ملتی تھی۔ذوالفقار بھائی جان حسب توقع اس امتحان میں کامیاب ہوئے اور اپنی ٹریننگ کے لئے ہندوستان کے مشہور ریلوے ٹریننگ مرکز چندوسی چلے گئے۔کچھ ہی مہینوں کے بعد یعنی ۱۹۳۵ء میں وہ اسی ملازمت پر مستقل طور پر تعینات ہو کر میر پور خاص کے اسی بنگلے میں رہائش پذیر ہوئے جس میں کبھی خود سید علی اصغر صاحب رہائش پذیر تھے۔بقول میری والدہ اللہ ارادوں کا ساتھ دیتا ہے۔

ذوالفقار بھائی جان کی یہ کہانی انکی بعد کی نسلوں کو بار بار سنائی گئی اور میں تو اس سے اسقدر متاثر ہوا کہ میری اپنی زندگی میں ایسے کئی مقام آئے جب میں نے انکی زندگی کو اپنے سامنے ایک مثال کے طور پر رکھا اور اس سے سبق حاصل کیا۔

فضل ماموں کا المیہ

یہاں میں اسی دور کے ایک اور قابل ذکر واقعہ کو احاطہ تحریر میں لانا چاہتا ہوں۔

ایک بار پھر میں یہ لکھتا چلوں کہ یہ ۱۹۳۰ء کے نصف کا زمانہ تھا اور اسوقت میرے والدین میر پور خاص میں رہ رہے تھے۔ اسی کے ساتھ میری والدہ کے دو بھائی مظہر محمد قریشی اور فضل محمد قریشی بھی اپنی ریلوے کی ملازمتوں کی وجہ سے میر پور خاص ہی میں رہائیش پذیر تھے۔ مظہر ماموں تو ریلوے میں میرے ابا ہی کی طرح گارڈ تھے مگر فضل محمد لوکو کے شعبے میں جہاں انجنوں کی مرمت اور دیکھ بھال کا کام ہوتا ہے میکینک تھے۔

میری والدہ کے پانچ بھائی تھے ان میں سب سے بڑے ظفر محمد اسکے بعد مظہر محمد پھر فضل محمد، قمر محمد اور ثاقب محمد تھے اگر چہ میری نانی اصغری بیگم سید زادی تھیں مگر انکی شادی قریشی خاندان میں نذر محمد قریشی سے ہوئی تھی اس لحاظ سے انکی اولاد آج بھی اپنے نام کے آگے قریشی کا استعمال کرتی ہے اور یہ بھائی قریشی بردران مشہور تھے۔ میں یہ پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ اپنے والد کی بیماری اور نا وقت انتقال کے سبب ان بھائیوں کی تعلیم بہت زیادہ نہ تھی اور انہوں نے معمولی تعلیم حاصل کر کے ذریعہ معاش کی خاطر ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ان سب کی زندگی بڑی دلچسپ ہے اور انکی اولاد نے بعد میں حیرت انگیز ترقی کر کے لوگوں کی نگاہوں کو چکا چوند کر دیا مگر اس کا تذکرہ بعد میں مناسب مواقعوں پر آئیگا۔

تعلیم معمولی تھی اور ملازمتیں بھی معمولی مگر تھے اسی خاندان کے اس لئے اپنے معیار زندگی۔ لب ولہجہ اور خوش مزاجی اور زندہ دلی میں اپنی مثال آپ تھے اور ساتھ ہی اپنے اندر کچھ ترک خون کی آمیزش اور ماں اور باپ دونوں کی طرف سے شکل وصورت اور خوبصورتی کے نہایت اچھے جینز کی وجہ سے مردانہ حسن ووجاہت کا نمونہ تھے۔ یوں تو میں نے سنا ہے کہ ظفر ماموں کے سوا سبھی بھائی اپنے حسن میں یکتا تھے مگر فضل ماموں ان میں سب سے زیادہ حسین تھے۔ اپنے انتہائی گورے گلابی رنگ اور گھنگریالے بالوں کے ساتھ یہ کسی یونانی دیومالائی کہانی کا کردار لگتے تھے انکی شادی نوجوانی میں، جب یہ اٹھارہ سال کے تھے میری نانی کی چھوٹی بہن اکبری بیگم کی دوسری بیٹی سروری بیگم سے ہوئی تھی جو شادی کے وقت پندرہ سال کی تھیں۔ میں جس زمانے کا تذکرہ کر رہا ہوں اس وقت انکی شادی کو سات سال ہو گئے تھے۔ انکے سب سے بڑے بچے سعید اختر کی عمر پانچ سال، چھوٹے بیٹے کی عمر تین سال اور سب سے چھوٹی بیٹی کی عمر تین ماہ تھی۔ لوکو شیڈ میں سخت محنت کر کے یہ اپنا گذر کر رہے تھے اگر چہ بہت زیادہ مالی فارغ البالی نہیں تھی مگر اپنے حال میں مطمئن اور اپنی چھوٹی سی فیملی میں خوش تھے راجستھان اور سندھ میں آج بھی پانی کی قلت ہے اور نلوں میں پانی صرف چند گھنٹوں کے لئے آتا ہے اس لئے یہاں کے باشندوں کا دستور ہے کہ یہ لوگ پانی کا ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ اس کے لئے لوہے کے بڑے بڑے ڈرم (BARRELL) بڑے مقبول تھے اور انکی بڑی مانگ تھی اس قسم کے ڈرم کا ملنا کسی کنبے کے لئے ایک نعمت مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ یہ ڈرم یا تو تیل کی کمپنیاں استعمال کے بعد لوگوں کو مفت میں دے دیا کرتی تھیں یا پھر ایسے ڈرم ریلوے میں تعمیر کے لئے جو کولتار استعمال ہوتا تھا اس کے استعمال کے بعد لوگوں کو مل جاتے تھے۔

ایک دن اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر آتے ہوئے انہیں ایسا ہی ایک بڑا ڈرم نظر آیا جس کا کولتار ابھی ابھی ختم ہوا تھا انہوں نے کام کرنے والے عملے کے سپر وائیزر سے درخواست کی کہ یہ ڈرم انہیں دے دیا جائے اس لئے کہ بچوں کے ساتھ پانی ذخیرہ کرنے کی مشکل ہو رہی ہے۔ ریلوے میں سبھی ایک دوسرے کو جانتے تھے اس بھلے مانس نے کہا فضلو یہ کونسی پوچھنے کی بات ہے ابھی لے جاؤ مگر اسکو صاف کرنا مشکل ہوگا۔ وہ ڈرم لیکر خوشی خوشی گھر آئے۔ میں نے سنا ہے کہ ڈرم ملنے کی وجہ سے ماموں اس قدر خوش اور پر جوش تھے کے انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا اور سوچا ابھی دن ہے پہلے اسکو صاف کر لیا جائے۔ جن لوگوں نے کولتار (جسے اس زمانے کی اصطلاح میں ڈامر کہا جاتا تھا) لگے ڈرم یا کنستر دیکھے ہیں انہیں معلوم ہے کہ انکو صاف کرنا تقریبا ناممکن چیز ہے اور اس میں بہت مشکل اور محنت لگتی ہے۔ پھر کولتار پانی سے نہیں دُھلتا اس کے لئے یا تو خاص قسم کے کیمیائی محلول درکار ہیں یا پھر ان کو آگ پر پگھلا کر صاف کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے انکے پاس کیمیائی محلول تو تھا نہیں۔۔ سبھی لوگ اس کو آگ پر پگھلا کر صاف کیا کرتے تھے۔ انہوں نے بھی گھر کے باہر تین اینٹیں رکھ کر آگ روشن کی اور ڈرم کو آگ پر رکھا تا کہ تیز آنچ پر کولتار پگھل جائے اور یہ اسکو کر چھے سے کھرچ کھرچ کر صاف کر لیں جب آگ بہت تیز ہو گئی اور کولتار پگھلنے لگا تو یہ قریب گئے اور جھک کر کر چھے سے اس کو کھرچنے کی کوشش کرنے لگے اسی وقت ایک زور کا شعلہ بھڑکا اور یہ آناً فاناً شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ ایک شور مچ گیا ریلوے کالونیوں میں گھر پاس پاس ہوتے ہیں اور سب کو ایک دوسرے کی خبر ہوتی ہے لوگوں نے بچایا اور معلوم نہیں کیسے آگ بجھائی۔ گھر میں ہی چار پائی پر ڈالا پاؤں سے سینے تک جلے تھے اور تکلیف کی زیادہ شکایت نہیں کر رہے تھے اس زمانے میں میر پو خاص میں کوئی بڑا ہسپتال یا جدید قسم کی سہولتیں نہیں تھیں۔ جو کچھ ہو سکتا تھا آرام پہچانے کے لئے کیا گیا ریلوے ڈاکٹر نے بھی آ کر دیکھا ادھر میری والدہ روتی پیٹتی پریشان حال پہنچیں خاندان کے دوسرے لوگ بھی پہنچے۔ وہ ہوش میں تھے اور بڑے حوصلے کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ پھر یہ لوگ اس بات سے بھی تھوڑا سا مطمئن تھے کہ اگر چہ جلے تو کافی تھے مگر درد کی شکایت نہیں کر رہے تھے بس بہت زیادہ پیاس تھی اور بار بار پانی مانگتے تھے۔ میرے آج کے قارئین یہ یاد رکھیں کہ ۱۹۳۵ء کے میر پور خاص تو کیا کراچی میں بھی انٹرا وینس INTRAVENOUS کی سہولت نہیں تھی۔ سب لوگ رات بھر انکے چاروں طرف بیٹھے رہے پانی دودھ اور پھلوں کے عرق دئے گئے مگر پیاس نہیں بجھتی تھی اب کمزوری ہونے لگی تھی بار بار اپنے بچوں کو بلاتے تھے۔

بڑے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھتے تھے بیوی کو دیکھتے تھے پھر غنودگی طاری ہونے لگی اور آخر کار صبح ہوتے دم توڑ دیا۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اسی وقت کھڈر ولائین کا قبرستان بند کر دیا گیا تھا اس لئے انہیں میر پور خاص کے بڑے قبرستان بھان سنگھ آباد میں سپردِ خاک کیا گیا مجھے آج بھی حیرت ہوتی ہے کہ لوکوشیڈ کی کالونی سے یہ قبرستان کوئی دو میل دور ہے اور اس زمانے میں یہاں تک کوئی پکا راستہ بھی نہ تھا۔ کیسے ان کی میت کو اتنی دور لایا گیا ہوگا۔ مختصر یہ کہ ایک قیامت تھی جوان کے لواحقین پر گذر گئی۔

یہاں میں ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے اس مسئلے کی کچھ وضاحت کرنا چاہتا ہوں جلنا آج یعنی ۲۰۱۰ میں بھی، ایک انتہائی خطرناک طبی مسئلہ ہے جلنے کی شدت کو اس طرح ماپا جاتا ہے کہ جسم کا کتنا فیصد حصہ متاثر ہوا ہے۔ ستر فیصد سے زیادہ حصے کے متاثر ہونے کے بعد انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں بھی مریض کا بچنا محال ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ان ممالک میں جلنے والوں کے علاج کے خاص یونٹ بنائے گئے ہیں۔ دوسری اہم بات اور عام لوگوں کے لئے یہ اطلاع حیران کن ہوگی کہ اگر جلنے کے زخم زیادہ شدید اور گہرے ہوں تو ان میں درد نہیں ہوتا اس لئے کے درد کا احساس کرنے والے اعصاب بھی جل جاتے ہیں۔ اس لئے درد کی غیر موجودگی ایک اچھی خبر نہیں بلکہ دراصل یہ ایک سنگین علامت ہے اور آخیر یہ کہ شروع گھنٹوں میں موت کی وجہ پانی اور ایسے ہی جسمانی رقیق ماڈوں کے زیاں کی وجہ سے ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ فضل ماموں کا اس حادثہ سے بچنا ممکن نہ تھا۔ یہ ایک سنگین اور افسوس ناک حادثہ تھا اور انکے لئے اور انکے کنبے کے لئے اللہ نے یہی لوحِ محفوظ پر لکھ دیا تھا اور انکے پسماندگان کا اس آزمائش سے گذرنا ان کا مقدر تھا۔

اس کنبے کے مزید حالات آئندہ ابواب میں آئینگے مگر یہاں اس افسوسناک واقعہ کے بعد انکے پسماندگان پر جو مصیبت نازل ہوئی اسکا مختصر تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

سروری بیگم جنہیں میری والدہ دلہن بھابی اور ہم دلہن ممانی کہتے تھے بائیس سال میں بیوہ ہوگئی تھیں انکے بچے اسقدر چھوٹے تھے کہ انکی شیر خوار بیٹی صرف تین ماہ کی تھی دو بچے ابھی صرف انگلی پکڑ کر چلنے کے قابل ہوئے تھے۔ اس پر سروری بیگم کے پاس کوئی تعلیم یا ایسا ہنر نہیں تھا کہ وہ اپنا گذر کر سکیں خاوند سے محروم ہونے کے بعد یہ یقینی تھا کہ دو ماہ میں مکان خالی کرنے کا بھی نوٹس ملنے والا ہے۔ ادھر انکے سسرال میں کسی کی بھی مالی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ انکی کفالت کر سکتا۔ ساس خود بیوہ تھیں اور اپنی بیوائیگی کے اول زمانے میں خود اپنے بھائی کے دستِ نگر رہی تھیں۔

اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے خاندان کے اہم اور ذی حیثیت افراد نے ان پر زور دیا کہ مالی سہارے کے لئے دوسری شادی کر لی جائے۔ کچھ لوگوں کے نام بھی لئے گئے جو نکاح ثانی کے خواہش مند تھے اور صاحب جائیداد ہونے کی وجہ سے انکی کفالت بھی کر سکتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا کے کہ چھوٹے دیور سے بھی نکاح کروایا جا سکتا ہے مگر انہوں نے کہا کہ اب انکی تمام دولت اور انکی زندگی کا واحد محور صرف انکی اولاد یہ تین یتیم بچے ہیں اور یہی انکے مرحوم شوہر کا تحفہ اور انکی امانت ہیں۔ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ وہ اپنا سہاگ سجا کر بچوں کو سوتیلے باپ اور سوتیلے گھر کے جہنم میں جھونک دیں اس قدر کم عمری اور اسقدر پختہ خیالات۔۔۔انہوں نے عزم مصمم کیا کہ وہ خود کمر ہمت باندھیں گی اور اپنے بچوں کو خود پال پوس کر جوان کریں گی۔

انکی والدہ امروہہ میں ایک بہت امیر و رئیس خاندان میں بیاہی گئی تھیں یہ حکیموں کا خاندان تھا اور نواب رامپور جب بھی امروہہ آتے تھے تو انہی کو شرف مہمان داری حاصل ہوتا تھا مگر اب اس خاندان کے بھی حالات بہت اچھے نہیں تھے انکے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور انکے چچا نہ صرف انکی والدہ کی کفالت کر رہے تھے بلکہ انکے ساتھ اپنے خاندان کی کئی اور بیواؤں کو بھی سہارا دے رہے تھے۔ سروری بیگم امروہہ چلی گئیں اور وہاں باقائدہ تعلیم پانے کے لئے اسکول میں داخلہ لیا بچوں کو انکی والدہ نے رکھا اور انکے چچا نے انہیں بھی سہارا دیا۔ انہوں نے امروہہ سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور اسکے بعد ٹیچر ٹریننگ کا ایک چھوٹا ڈپلومہ لیا اور یو پی کے محکمہ تعلیم میں لڑکیوں کے اسکول میں استانی کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی پاکستان بننے کے بعد وہ میر پور خاص آگئیں اور یہاں کے گرلز اسکول میں اپنے ریٹائر ہونے تک ملازمت کرتی رہیں اور اپنے تینوں بچوں کو جوان کیا۔ ہر سال وہ اپنے شوہر کی برسی پر قرآن خوانی کرواتی تھیں اور ہم سب بھان سنگھ آباد کے قبرستان میں فضل ماموں کی قبر پر پھول چڑھانے جاتے تھے اس بات سے قطع نظر کے انکا یہ فیصلہ کہ انہوں نے اپنی جوانی کو اپنے بچوں کی خاطر خاک میں ملا دیا اور زندگی کے ریگستان میں تنہائی کا ایک طویل سفر کاٹا صحیح تھا یا نہیں، میں انکے کردار سے، انکی قوت ارادی سے، انکی ہمت سے بیحد متاثر تھا اور میرے دل میں انکے لئے آج بھی زبردست عزت اور احترام ہے۔ میری نظر میں ایسے لوگ روشنی کا مینار ہیں جنہوں نے دوسروں کی بہبود کے لئے اپنی ذات اور اپنی خوشیوں کی قربانی دے دی۔

ابّا کی علالت اور میری پیدائش

فضل ماموں کے مرنے کے بعد پاکستان کے وجود میں آنے تک جو مزید قابل ذکر واقعات ہوئے اب کچھ انکا بیان۔

جیسا میں نے پہلے تحریر کیا ہے میری والدہ اپنے بھائیوں کے ساتھ میر پور خاص میں ریلوے کی کھڈر ولائین کالونی میں رہ رہی تھیں۔ اس زمانے میں بلکہ میں یہ کہونگا کہ پاکستان بن جانے کے بعد بھی میر پور خاص ایک پر امن

شہر تھا اور خاص طور پر ریلوے کالونی میں لوگ گھروں کو کھلا چھوڑ دیتے تھے اور دروازوں پر تالا لگانے کا رواج نہیں تھا۔ دن کے وقت گھر والے عموماً اپنے چھوٹے موٹے کام کرنے یا خواتین دل بہلانے اگر پڑوس میں چلی جاتی تھیں تو دروازوں کو صرف بھیڑ کر جاتی تھیں۔ میری والدہ کے قریب ہی اسی ریلوے کالونی میں انکی بڑی بھاوج مظہر ماموں کی بیوی رہتی تھیں جن سے ان کی بڑی دوستی تھی اور یہ صبح کام سے فارغ ہو کر اور بچوں کو اسکول بھیج کر گیارہ بجے کے قریب انکے یہاں کچھ اچھا وقت گذارنے چلی جاتی تھیں۔

یوں تو میرے ابّا کا کنبہ ریلوے کی آمدنی میں متوسط طریقے سے با آرام گذر کر رہا تھا مگر انکے پاس کوئی قیمتی چیز نہیں تھی اس لئے بھی دل غنی تھا۔ یہی خیال رہا ہوگا کہ ہے ہی کیا جو کوئی لیجائیگا۔ مگر انہیں اسکا خیال نہیں رہا کہ انکے پاس انکی شادی کا زیور اب بھی موجود تھا اور وہ زیور بھی اسی طرح اللہ توکل انکے کھلے صندوق میں پڑا ہوا تھا۔ ایک دن جو یہ مظہر ماموں کے یہاں سے واپس آئیں تو انکا صندوق کھلا پڑا تھا کپڑے بے ترتیبی سے باہر بکھرے ہوئے تھے اور زیور کا ڈبہ غائب تھا۔ یہ دن دہاڑے کی چوری تھی۔ نہ کوئی سراغ تھا نہ ہی کسی پر شک کیا جا سکتا تھا۔ لوگوں نے کہا بھی کہ ریلوے پولس کو بلایا جائے مگر میری والدہ نے کہا کہ وہ بیکار آس پڑوس اور ملنے جلنے والوں کو تنگ کریں گے اور پولیس کو بلانے پر تیار نہیں ہوئیں۔ وہ دل کی بہت بڑی تھیں اور ہمیشہ راضی برضا۔ سنا ہے کہنے لگیں نصیب کا نہ تھا نہ رہا اور پھر یہ مصرعہ پڑھا

نہیں محتاج زیور کا جسے صورت خدا نے دی

محلے کی عورتیں ڈر رہی تھیں کہ شام کو شوہر آ کر بہت ناراض ہونگے مگر ہمارے ابّا تو بہت ہی درویش فطرت اور فقیر طبیعت کے انسان تھے۔ سنا ہے یہ ماجرا سن کر اپنی مخصوص مسکراہٹ سے کہا "بیوی۔۔ تمہاری قسمت میں نہیں تھا نہ رہا"۔ اس کا تذکرہ یہاں اس لئے ضروری ہے کہ جب ہمارے کنبے کو مستقبل میں مختلف مواقعوں پر روپوں کی ضرورت پڑی تو اس زیور کو یاد کیا جاتا تھا کہ اگر وہ ہوتا تو بیچ کر کام چلا لیا جاتا۔ یہاں یہ تحریر کرنا بھی مناسب ہے کہ جب تک میں نے ڈاکٹر بن کر اور امریکہ آ کر اپنی ضد پر امّاں کو سونے کے کڑے نہ بنوا کر دئے اس وقت تک انکے پاس سونے کی ایک کیل تک نہیں تھی۔ یہاں یہ بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ کڑے بھی ناظم آباد میں ایک موٹر سائیکل سوار نے، جب وہ اکیلی ذوالفقار بھائی جان کے یہاں سے واپس اپنے گھر آ رہی تھیں ان سے زبردستی اتروالئے اور فرار ہو گیا۔ کم بخت نے کڑے اتنی بیدردی سے کھینچے تھے کہ ہاتھوں پر خراشیں پڑ گئی تھیں جس دن انکا زیور چوری ہوا تھا اُس دن کے بعد سے میری والدہ ہر تقریب میں چاہے وہ کتنی ہی اعلی پیمانے کی ہو کانوں اور ہاتھوں میں صرف نازک نازک پھول پہن کر جاتی تھیں اور پھر بھی اپنے حسن وجمال سے محفل میں ہر ایک کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھیں۔

ابّا کی نوکری کی وجہ سے یہ کنبہ کبھی میر پور خاص، کبھی جودھپور کبھی میٹرتا روڈ اور کبھی باڑمیر میں رہتا تھا۔ اب میری بڑی بہن سلطانہ آپا کے علاوہ میرے بڑے بھائی سلطان بھائی جان بھی پیدا ہو چکے تھے۔ سلطانہ آپا کی پیدائش تو میر پور خاص کی تھی مگر سلطان بھائی جان مراد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ میری والدہ وہاں کسی کی شادی میں شریک ہونے گئی تھیں۔ یہ بات اس لئے دلچسپ ہے کہ کسی نے سچ کہا ہے کہ انسان کی زندگی میں دو اہم ترین چیزوں پر اسکا اپنا کوئی اختیار نہیں ایک اسکا اپنا نام اور ایک اسکی جائے پیدائش۔ سلطان بھائی جان بعد میں راجپوتانے سے بہت متاثر تھے اور وہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ راجپوتانے کے ہیں اور راجپوتانے کی محبت میں کبھی کبھی تو اسقدر آگے بڑھ جاتے تھے کہ خود کو راجپوت ہی کہلانا چاہتے تھے جس پر میرے ابّا برہم ہوتے تھے وہ کہتے "ہم اصلی نسلی سید ہیں اور یوپی کے ہیں۔ ہم کیوں ہوتے راجپوت!!" پھر ہم سب سلطان بھائیجان کو چڑھانے کے لئے کہتے تم تو پیدا بھی راجپوتانے میں نہیں بلکہ مراد آباد یوپی میں ہوئے ہو تم کہاں سے راجپوت ہو گئے؟؟۔ اس پر وہ بڑے جزبز ہوتے۔

سلطان بھائیجان کے پانچ سال بعد میری بڑی بہن ریحانہ آپا جودھپور میں پیدا ہوئیں۔ اب سلطانہ آپا اور سلطان بھائی جان بڑے ہو چکے تھے اور میری امّاں کو انکی تعلیم کی فکر تھی۔

تعلیم کی تو وہ دیوانی تھیں اور ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ تعلیم سے انسان کے نہ صرف کردار پر جلا آ جاتی ہے بلکہ اسکی ظاہری شکل وصورت پر بھی علم کی وجہ سے ایک خاص وقار برسنے لگتا ہے۔ ابّا کی ملازمت کبھی کبھی ایسے چھوٹے چھوٹے شہروں میں ہوتی تھی جہاں تعلیم کا مناسب انتظام نہ تھا لڑکوں کے اسکول تو پھر بھی تھے مگر لڑکیوں کے اسکول نہیں تھے۔ اس لئے جب سلطانہ آپا اور سلطان بھائی جان اسکول جانے کی عمر کے ہوئے تو وہ مستقل طور پر جودھ پور میں رہنے لگیں ابّا حسب معمول چھوٹی جگہوں پر کام کرتے تھے اور ہفتے دو ہفتے میں اپنے بیگم بچوں سے ملنے جودھپور آ جایا کرتے تھے۔

امّاں کے لئے اپنے تین معصوم بچوں کے ساتھ تنہا جودھپور میں رہنا آسان نہ تھا کہ خبر آئی کہ باڑمیر میں ابّا بیمار پڑ گئے ہیں۔ یہ بیماری یقیناً بہت سنگین ہو گی اس لئے کہ اسکا تذکرہ میری امّاں اپنی ضعیفی میں بھی بار بار کرتی تھیں۔ انہیں ابّا کی تیمارداری کے لئے بچوں کو لیکر باڑمیر جانا پڑ گیا۔ باڑمیر حیدر آباد سندھ سے جودھپور مین لائین پر راجپوتانے کے ریگستان میں ایک بہت چھوٹا اور بد رونق مقام تھا۔ یہاں سانپوں کہ بہتات تھی۔ بجلی کی سہولت بھی نہیں تھی اور سخت گرمی پڑتی تھی۔ ابّا کو بخار چڑھتا تھا اور اتر کر نہیں دیتا تھا۔ کئی دن یہی سلسلہ رہا۔ جو بھی ڈاکٹر تھے انہوں نے ملیریا اور اندازے سے دوسری دوائیں دیں۔ پنسلین ایجاد نہیں ہوئی تھی ایک انٹی بائیوٹک ایم اینڈ بی 693 نئی نئی آئی تھی وہ بھی

دی گئی مگر حالت بگڑتی چلی گئی۔ آج مجھے گمان ہے کہ یہ ٹائیفائیڈ تھا جو بگڑ گیا تھا۔ ٹائیفائیڈ کا طریاق کلورومائیسیٹین ابھی دریافت نہیں ہوئی تھی۔

کمزوری کا یہ عالم ہو گیا کہ اٹھنا بیٹھنا تو درکنار بات بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ بتاتی ہیں کہ انہوں نے گھر کے کمرے کو ہسپتال کے کمرے کا روپ دیدیا تھا۔ دن میں کئی کئی بار تھرمامیٹر لگا کر بخار کا چارٹ بناتی تھیں۔ دواؤں کی شیشیاں سرہانے رکھ دی تھیں۔ تیز بخار چڑھنے پر تسلے میں ٹھنڈا پانی تلووں کی مساج کے لئے موجود ہوتا تھا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ یک دم ٹمپریچر گرنا بھی خطرناک ہے اس لئے ہردم گرم پانی بھی تیار رہتا تھا کہ تولیاں بھگو کر جسم پر رکھتی جائیں۔ طبیعت بگڑتی گئی اور آخرکار ہذیان بکنے لگے تیز بخار سے بدن کو جھٹکے لگنے لگے۔ رات کا وقت تھا کہتی ہیں بغیر برقعہ بھاگی ہوئی ڈاکٹر چٹرجی کے یہاں گئیں وہ اپنی بہن کی طرح سمجھتا تھا اور انکی خدمت گذاری سے بہت متاثر تھا فوراً آیا اور ابّا کی حالت دیکھ کر بڑا مایوس ہوا اور یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ بہن اب تیرا اور انکا دونوں کا اللہ حافظ ہے بس اب تو دعا کر۔۔

امّاں ہم بہن بھائیوں کو بتاتی ہیں کہ اس کے بعد وہ اتنا روئیں کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ پھر مصلّے پر بیٹھ کر رات بھر روتی رہیں اور سجدے کرتی رہیں۔ سوچتی تھیں کہ تین معصوم بچوں کے ساتھ کہاں جائینگی؟ کون سہارا دیگا؟ بچوں کا مستقبل کیا ہوگا در در ٹھوکریں کھائیں گے اور تیرے میرے ٹکڑوں پر پلیں گے۔ بار بار خدائے ذوالجلال سے رحم کی بھیک مانگتی تھیں اسی پریشانی اور عالم بیقراری میں جائے نماز ہی پر سجدہ کرتے ہوئے گر کر آنکھ لگ گئی۔

کہتی ہیں کہ ایسا محسوس ہوا کہ روشنی کا ایک چھپا کا ہوا جس سے آنکھ کھلی یوں لگا کوئی آوازیں دے رہا ہے۔ نیند کی وجہ سے پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا پھر معلوم ہوا۔ ابّا کی آواز تھی وہ بہت دنوں کے بعد خود سے پانی مانگ رہے تھے۔ یہ تڑپ کر اٹھیں اور بھاگ کر پانی کا کٹورا منہ سے لگایا۔ کہنے لگے خود پیوں گا۔ بس اس مبارک دن سے طبیعت بہتر ہونی شروع ہوئی اور مکمل صحت یاب ہوئے۔

اس کے بعد اپنی وفات تک میرے ابّا کبھی بیمار نہیں پڑے اور جیسا میں نے لکھا ہے انہوں نے میری زندگی میں اپنی ریلوے کی ملازمت میں ایک دن کی بھی چھٹی نہیں کی۔ انکا انتقال چہتر سال کی عمر میں اچانک ہوا اور انکو دیکھ کر میرے ڈاکٹر دوست حیران ہوتے تھے کہ اس وقت تک انکو کوئی بیماری حتیٰ کہ بڑھاپے کی عام بیماریاں بھی نہیں تھیں۔

انکی بیماری سے امّاں کے علاوہ انکے عزیزوں کو بھی ایک جھٹکا سا لگا اور خاص طور پر اس حقیقت سے کہ باڑمیر بہت چھوٹی جگہ ہے اور ابھی بچے چھوٹے ہیں میرے عزیزوں نے جو جودھپور ریلوے میں اچھا اختیار رکھتے تھے ابّا کا تبادلہ جودھپور کروالیا اور اس طرح یہ کنبہ پھر ایک جگہ ہو گیا اسی زمانے میں ریحانہ آپا کے ساڑھے پانچ سال بعد میں جودھ پور میں گھر ہی میں پیدا ہوا۔ سنا ہے میرے پیدا ہونے پر ہمارے خاندان کی ایک خاتون جو بہت حسین، ذہین، تعلیم یافتہ، شاعرہ اور ادیبہ ہیں، اور جن پر میں ایک علیحدہ باب لکھوں گا، نے میرا نام ڈاکٹر فیروز عالم رکھا یعنی ڈاکٹر پیدائیشی طور پر میرے نام کا حصہ ہے۔ یہ حیرت انگیز بات ہے اور اس سے انکا خلوص جھلکتا ہے۔ سنا ہے انہوں نے اسی دن میری والدہ سے کہا تھا جعفری پھپّی میں اسکا نام ابھی سے ڈاکٹر فیروز عالم رکھ رہی ہوں آپ دیکھنا اللہ اسکو ڈاکٹر بنائیگا۔ شاید اس وقت اللہ تعالیٰ آسمان پر انکی یہ دعا سن رہا تھا اور اسے میرے ذریعہ میرے والدین کو آسودگی عطا کرنی تھی اس لئے اس نے میرے والدین کی دعاؤں سے مجھ پر اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دئے اور اب یہ دور آیا کہ آج پاکستان سے امریکہ اور کراچی سے لاس انجلز تک ہر قانونی ڈاکومنٹ میں میرا نام ڈاکٹر فیروز عالم درج ہے۔

☆

- بقیہ -

جزیرے پیار کے

''روپے کمانے کے لیے تو کچھ مشکلیں اٹھانی ہی پڑتی ہیں۔''

''باڑ میں جائیں تمہارے روپے۔ مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ خدا نے مجھے جتنا دیا ہے، کافی ہے۔ چند روپیوں کے لیے میں اپنا سکھ چین نہیں گنوا سکتی۔'' اس کے چہرے پر بشاشت تھی، اطمینان تھا اور سکون تھا۔ میں اپنے کیے پر نادم ہو گیا۔ میں نے اس کی محبت کو دولت کے ترازو میں تولنا چاہا تھا مگر وہ تھی کہ کسمپرسی میں بھی مجھے محبت کا سبق سکھا گئی۔

آج اس واقعے کو پیش آئے ایک زمانہ بیت چکا ہے۔ اس دوران زندگی اپنی مخصوص ڈگر پر چلتی رہی۔ ہم دونوں نے وقت کے ساتھ مفاہمت کر کے اپنے اپنے ہمسفر چن لیے، بچے پیدا کیے اور دل کے زخموں پر یادوں کے پھاہے لگائے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں جب بھی کبھی ایک دوسرے سے یوں ہی ملاقات ہو جاتی ہے تو دونوں کے چہرے تمتما اٹھتے ہیں اور دل میں خوشیوں کا ایک طوفان سا اٹھتا ہے۔ ہم نے بارہا مندروں اور مسجدوں میں ایک دوسرے کی خوش حالی کے لیے دعائیں مانگیں ہیں اور یہ کبھی بھی نہ سوچا کہ غیر مذہبوں کے لیے یہ دعائیں قبول ہونگی بھی یا نہیں۔

☆

''بدصورتی کے درمیاں''

عصرِ نو

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

ہر طرف پھیلی ہوئی
بدصورتی کے درمیاں
آج کے انسانوں کو جینا
اور
مرجانا بھی ہے

جیتے جی یاں
اپنے پیاروں کے لئے

جو بنے
جیسا بنے
کرنا بھی ہے
بھرنا بھی ہے
اپنی محنت کے
پسینے سے، لہو سے
اپنے پیاروں کے لئے

ہر طرف پھیلی ہوئی
بدصورتی کے درمیاں
خوب صورت خواب لانا
اور دکھلانا بھی ہے

آج سے پہلے کبھی
زندگی
اتنی بے معنٰی نہ تھی

جبر کے پھیلے ہوئے جبڑوں میں
یہ جکڑی زمیں
یہ زماں

آدمی
کیڑے مکوڑے
رینگتی مجبوریاں۔
دیو ہیکل، دیو قامت
مالکوں کے ہاتھ میں

اپنی اپنی گردنوں کی
ڈوریاں
دے کر مگن اور شادماں

اک رواجی اور مشینی زندگی
جینا
عبث۔
کارِزیاں

رائگاں
سب رائگاں،
سب رائگاں۔۔!!

اندیشے

انور سدید
(لاہور)

میں اپنے زمانے کی گردش میں
یہ دیکھتا ہوں
زمیں چل رہی ہے
مگر مجھ کو ساکن نظر آ رہی ہے

میں اس کرۂ ارض پر
اک جزیرے کے ویران کونے میں
بیٹھا ہوں...... پاؤں سمیٹے
نظریں نیچی کیے
سانس روکے ہوئے

میں اپنے زمانے کی گردش میں
دورِ رواں سے چراتا ہوں آنکھیں
مگر سوچتا ہوں......
فقط میں یہی سوچتا ہوں
کہیں وقت نوکیلے پنجوں سے
میرے بڑھاپے کو گھائل نہ کر دے؟
مرے اسّی برسوں کی ساری کمائی کو زائل نہ کر دے
یہی سوچتا ہوں
فقط میں یہی سوچتا ہوں

○

ایک نظم

ملک زادہ منظور احمد
(لکھنؤ، بھارت)

ہمارے شعروں میں مقتل کے استعارے ہیں
ہماری غزلوں نے دیکھا ہے کوچۂ قاتل
صلیب و دار پہ نظمیں ہماری لٹکی ہیں
ہماری فکر ہے زخمی، لہو لہان ہے دل
ہر ایک لفظ پریشاں ہر ایک مصرع اُداس
ہم اپنے شعروں کے مفہوم پر پشیماں ہیں
خدا کرے کہ جو آئیں ہمارے بعد وہ لوگ
ہمارے فن کی علامات کو سمجھ نہ سکیں
چراغ دیر و حرم سے کسی کا گھر نہ جلے
نہ کوئی پھر سے حکایات رفتگاں لکھّے
نہ کوئی پھر سے علامات خونچکاں لکھّے
فصیلِ دار، سروں کے چراغ، رقص جنوں
سراب، تشنہ لبی، خار آبلہ پائی
دریدہ پیرہنی، چاک دامنی، وحشت
سموم، آتشِ گل، برق، آشیاں صیّاد
روائتیں یہ مرے عہد کی علامت ہیں
علامتیں یہ میرے شعر کا مقدر ہیں
خدا کرے کہ جو آئیں ہمارے بعد وہ لوگ
ہمارے فن کی علامات کو سمجھ نہ سکیں
چراغ دیر و حرم سے کسی کا گھر نہ جلے
نہ کوئی پھر سے حکایات رفتگاں لکھّے
نہ کوئی پھر سے علامات خونچکاں لکھّے

پوسٹ مارٹم

ڈاکٹر سید سعید نقوی

(نیویارک امریکہ)

زہر کے کتنے رنگ ہوتے ہیں
شام رنگ
اودا، پیلا اور ہرا
ہر رنگ کی تاثیر جدا
اک سے ہو بس خون سفید
اک سے فضا ہو سموم
کچھ سیال کی مانند
دوڑتے ہیں رگ وپے میں
زہر پیلا حیا کا قاتل
نیلگوں زہر سے قرابتدار
اپنے رشتوں کو بھول جاتے ہیں۔
سرد کمرے کی نیم تاریکی
میں اپنے پوسٹ مارٹم پر
کھوج رہا ہوں بیٹھا
کون سا زہر تھا وہ
پتھر کی جس نے دی ہے شکل
رنگ و نسل کے حوالوں کو
حسب و نسب کے اشاروں کو
رواداری اور محبت کے
جو اثاثے میرے ضمیر کے تھے
زہر نے چھین کر ایسا
چکنا پتھر بنا دیا جس پر
کوئی تریاق کام کرتا نہیں
بس اک آس ہے صراحی سے
نشتر ہو قلب کے اوپر
خون فاصد اگر نکل جائے
اور پھر سے جاری ہوں
میری روح کی سانسیں

میں تیری تمنّا سے دستکش ہوا

ڈاکٹر جواز جعفری

(لاہور)

تیرے گھر کے سامنے
کُتوں کا میلہ لگا ہے
جو سب کے سب
اگلے پنجوں کے درمیان سر رکھے
تیرے بدن کے کسی لوتھڑے کی خواہش میں پڑے
اُونگھ رہے ہیں!
میں زندگی کی بشارت مُٹھی میں لیے
تیرے دروازے پر دستک دیتا ہوں
تیری بُو پا کر سارے کتے
مجھ پر بھونکتے بھونکتے
ایک دوسرے سے الجھ پڑتے ہیں
مگر تیری آنکھیں
کتوں کی غرّاہٹ سے
اپنے لیے سرشاری کشید کرتی ہیں!
پس میں انبوہِ سگاں کے رُوبرو
تیری تمنا سے دستکش ہوا
تُو اپنے بدن کی ہڈی
جس کے سامنے جی چاہے ڈال!

○

داتادربارپرحملہ

ارشادعرشی ملک (اسلام آباد)

اب کے داتا کا بھی دربارلہورنگ ہوا
یہ وہ دربارکہ جوامن کا گہوارہ تھا
یہ وہ دربارجوالفت کارواں دھاراتھا
جوغریبوں کوامیروں کو،بہت پیاراتھا

یہ وہ دربارکہ جس تک تھی رسائی سب کی
یہ وہ دربارجوسنتاتھادہائی سب کی
جہاں مذہب کونہ مسلک کوتھاپرکھاجاتا
نہ حسب کو،نہ نسب کو،جہاں دیکھاجاتا
جہاں غربت،نہ امارت کی تھی تفریق کوئی
جہاں زردار،نہ بےزرکی تھی تحقیق کوئی
کوئی دیوان،جہاں،خاص نہ تھا،عام نہ تھا
نام والانہ تھاکوئی،کوئی بےنام نہ تھا
چین،ہی چین تھا،ہنگامۂ ایاّم نہ تھا

جوق درجوق چلی آتی تھی خلقت ساری
آس واُمیدکا،خوراک کالنگرجاری
بھوک مٹ جاتی دل وپیٹ کی باری باری
کتنی صدیوں سےتھاروشن،یہ محبت کاچراغ
زردموسم میں بھی سرسبزرہا،عشق کاباغ
دہریےبھی یہاں پاتےتھےعقیدت کاسراغ

کس نےکاٹی ہیں یہاں آکےسروں کی فصلیں
کون انساں کی مٹانےپہ تُلاہےنسلیں
باڑنفرت کی سرِراہ اگانےوالو
خانقاہوں پہ جلےدیپ بجھانےوالو
قتل کی رسم سرِراہ چلانےوالو
بومیں بارودکی جنت کوکمانےوالو
خودکشی کرکےبڑاجشن منانےوالو

تم کہ کرتےہو،عقیدوں کی بناپرحملہ
اب کےتوتم نےکیا،بادِصباپرحملہ
مردِدرویش کے،پیغامِ بقاپرحملہ
ایک صوفی کی محبت کی صداپرحملہ
یہ توحملہ ہےعقیدت پہ،وفاپرحملہ
آس واُمیدپہ اورحرفِ دعاپرحملہ
دلِ مظلوم کی ہاں آہِ رساپرحملہ
مارپائیں نہیں جس شخص کوصدیاں عرشی
کس لئےکرتےہواُس مردِخداپرحملہ

○

دوھے

سیفی سرونجی (سرونج،بھارت)

اردو والے دُور سے تکتے ہیں تصویر
جیسے اپنے دیش میں مانگے بھیک فقیر

میں نے سچی بات کہی ہوکر جب مجبور
جتنے میرے یار تھے ہوگئے دل سے دور

چھت پرمیری رات کوجب بھی نکلاچاند
دل کی دھڑکن اور بھی پھرتو ہوگئی ماند

ہندومسلم لاکھ ہوں یا ہوں وہ انگریز
ہولی کھیلےخون سے وہ سارے چنگیز

○

یہ کیسا دَور آیا ہے معاذ اللہ

ڈاکٹر شبابؔ للت
(شملہ، بھارت)

معاذ اللہ یہ کیسا دَور آیا ہے
کہ جس میں ہم شریفوں کو
شرافت کی سند لینی پڑے گی
مجرموں سے، قاتلوں، اغوا کنندوں
دشمنِ انسانیت، رشوت، سمگلنگ کے
خداؤں سے......

خدایا ہم فقیروں کی نجابت
نیکی کردار پر معصومیت پر
فیصلہ صادر کریں گے
چور، اُچکّے، چرس گانجے اور
کالے دھن کے سوداگر......
معاذ اللہ
یہ کیسا دَور آیا ہے

○

''ملتے بچھڑتے موسم''

شگفتہ نازلی
(لاہور)

ملنے اور بچھڑنے کا سلسلہ تو رہتا ہے......
جھڑنے اور اُگنے کا مرحلہ تو رہتا ہے ......
پھول پات آتے ہیں، کھلتے اور بکھرتے ہیں......
لوگ آتے جاتے ہیں، ملتے اور بچھڑتے ہیں......
ملنے اور بچھڑنے سے، کھلنے اور بکھرنے سے......
رونے، مسکرانے سے، روٹھنے، منانے سے......
زندگی عبارت ہے، جذبوں کی وضاحت ہے......
سارے پتے اِک اِک کرکے، گرتے چلے جاتے ہیں......
اور ہوا کی زد میں آ کر پھر بھٹکتے رہتے ہیں......
بے لباس شاخیں اُن کو یونہی تکتی رہتی ہیں......
اور بہار آنے پر یُوں دھرتی، مسکراتی ہے......
کونپلیں مہکتی ہیں اور شگوفے کھلتے ہیں......
سبز سبز پتوں کے پیرہن سے خوش ہو کے......
شاخیں لہلہاتی ہیں، پودے جھوم جاتے ہیں......
پتوں کی طرح سے لوگ پیرہن بدل کر پھر......
آتے جاتے رہتے ہیں، جاتے آتے رہتے ہیں......
آنا جانا ایسے ہی چلتا چلا جاتا ہے......!

○

رباعیات

پی۔پی۔سریواستو رند

(نوئیڈا، بھارت)

مقروض میری فکر ہوئی جاتی ہے
مضمون نیا سوچ کے گھبراتی ہے
احباب کی صحبت کا اثر ہے اے رند
اک فصل رباعی کی اُگی جاتی ہے

سوکھے ہوئے زخموں کی کسک زندہ ہے
سیلن بھرے کمرے کی مہک زندہ ہے
چھیڑے نہ کوئی رند ابھی گرم الاؤ
بجھتے ہوئے شعلوں کی بھڑک زندہ ہے

ہر شاخ پہ سنّاٹے کا ڈیرا دیکھا
سہمی ہوئی چڑیوں کا بسیرا دیکھا
پرجھاڑتی تنہائیاں دیکھیں اے رند
جب گھر میں گھٹاٹوپ اندھیرا دیکھا

تنہائی کا اک غول لئے پھرتا ہوں
زیور کئی انمول لئے پھرتا ہوں
سوچ میں کئی رند تعاقب میں مگر
میں رات کا کشکول لئے پھرتا ہوں

جلتے ہوئے شعلوں سے بغاوت کرلوں
سنسان سی راتوں سے رفاقت کرلوں
اے رند اگر کربِ مسلسل تھم جائے
کچھ دیر تو خوابوں سے محبت کرلوں

سورج کا ہوا قتل فضا ہے رنگین
ماحول مکدّر ہے ہوا ہے غمگین
بیوہ جو ہوئی شام تو گیسو بکھرے
اب رات خدا جانے کتنی ہو سنگین

○

کتابو......!

سید تحسین گیلانی

(بورے والا)

کتابو۔روٹھتی کیوں ہو......
ابھی مجھکو لباسِ تنگ نے ڈھانپا ہوا ہے
ابھی تو اک قدم میرا کسی جنگل کی دلدل میں دھنسا ہے
ابھی میں پیٹ کی ہی قید میں جکڑا ہوا ہوں
مجھے کیا چاند سے لینا
ابھی تو میں زمیں کے پہلے دروازے پہ دستک دے رہا ہوں
ابھی تو سمت میری بھی معمہ اک بنی ہے
میں رسموں کے کنویں میں اب تلک لٹکا ہوں
مرا تو جسم اب بے جسم ہو کر گیا ہے
میری تو موت بھی مر مر کے مجھ میں مرگئی ہے
مگر تم روٹھی کیوں ہو۔میں کوشش کر رہا ہوں
پر مجھے ہے ایسی جنگ کا سامنا
جس میں مقابل میں کھڑا ہوں
میں خود سے لڑ رہا ہوں......!!!
مجھے کچھ وقت دو پہلے میں ان جھلسی ہوئی لاشوں کا گریہ
اور اِن معصوم ننھے چیتھڑوں کا بین کرلوں
اور خود میں یہ لگی آتش بجھا لوں
پھر ذرا سا آنسوؤں کا غسل کرلوں
اور اس بارود میں کھل کر نہالوں
پھر ملیں گے
مجھے کچھ وقت دے دو تم
کتابو روٹھتی کیوں ہو

○

''وصیت نامہ''

امتیاز ابڑو

وصیت نامہ تیار ہے
جس میں انگور کے دانے رکھے ہوئے نہیں ہیں
ایک گرفتاری ہے
جو جُدائی ہے
ایک سرد کہانی ہے
اور ایک گم شدہ جزیرے کا درد ہے
وصیت نامہ
کسی شکست خوردہ وقت کا ہے
جو
اپنے شہروں کے اغوا کے وقت
غروب رہا ہے
کسی منصف کا ہے
جس کے ہاتھ میں قلم تھا
مگر دستخط کسی اور نے کیے
کسی طوائف کا ہے
جس کی جھولی میں پیسے بھی تھے
اور دل بھی
جس کی زندگی
ایک چھاؤں سے شروع ہوئی
اور ایک جنسی عضو پر ختم ہوئی

یہ وصیت نامہ
کسی کا بھی ہو سکتا ہے
ایک سپاہی کا بھی
جو کہ سیٹی بجانا بھول گیا
اور ایک محبّ شیدی پیدا ہوا
ایک ڈاکٹر کا بھی
جس نے ایک چھری اُٹھائی
اور ایک افیمی پیدا کر لیا
اس وصیت نامے میں
بہت کچھ ہے
جو آپ اپنے بچوں کو ضرور پڑھانا
ورنہ وہ آپ کو
قتل کر دیں گے
اس میں ایک رات کا سفر ہے
جب سب لوگ جاگ جائیں تو
اپنی اپنی محبوباؤں کو پڑھوائیں
اس میں
ایک بچے کا بھی ذکر ہے
جس کو ایک کھلونا دینا ہے
کھلونا کیسا بھی ہو
یہ آپ پر منحصر ہے
پھر چاہے آپ ایک
جھنجنا دیں یا ایک چھوٹی سی توپ

۔ سندھی سے ترجمہ ۔
نوید سروش
(میر پور خاص)

دوھے

بھگوان داس اعجؔاز

(دہلی، بھارت)

شوق کہے چل اُڑ نڈر، سمے کہے پھر سوچ
پنچھی گرہ گردش میں نہیں پنکھ نہ لے کوئی نوچ

شوق سبھی زر مال کے، اونٹ باندھے کھونٹ
ورنہ پاؤں پسا رہے، پی پانی دو گھونٹ

یہ کیسی سود گری، خالی جیبوں چاہ
بندہ ڈیٹر بلاند کا اونٹ سواری واہ!

دنیا کی گھڑ دوڑ میں، کیا کچھوے کا ساتھ
سودا بڑی دکان کا، بکتا ہاتھوں ہاتھ

ہم بھی جیون کا جُوا، کھیلے خالی ہاتھ
جیسے بچّہ کھیلتا پر چھائیں کے ساتھ

کہاں مجھے لے آئی ہے اونچے قد کی ہوڑ
اپنی بانہیں کاٹ کر لی ٹانگیں میں جوڑ

شغل عشق بازی کا بھی، مہنگا سودا جان
جیب میں ہو پیسہ کھلا اور بدن میں جان

قد ہوتا آکاش تک لمبے ہوتے ہاتھ
ہم بھی رات گزارتے کچھ تاروں کے ساتھ

پانو پانو کی ٹھوکریں، دیں گی ہوا نکال
ہمیں گیند کے شوق نے بنا دیا فٹ بال

یہ سن کر گھبرا گیا، آج وہ تیرا انداز
کہے زمانہ آگ سے کھیل رہا اعجؔاز

○

حبیب جالب

جہانگیر اشرف

(برمنگھم، برطانیہ)

اب تو ہر بے نوا شعلہ بیاں
جالؔب ساسخنور مگر کہاں

ہر مصرعہ ظالم کے لیے نشتر
ہر شعر بے کسوں کا ترجماں

عمر بھر ظلمت انساں کے گیت لکھے
بہت بلند اُسکی نظر میں رُتبہ انساں

ہر یزید کو للکارا سرِ دار اُس نے
اپنے کہنے پہ ہوا نہ کبھی پشیماں

جب کہا ''حرفِ حق'' کہا اُس نے
کب وہ کسی آمر کا ثنا خواں

''حرفِ سرِ دار'' اُسکے نام سے وابستہ
قافلۂ حق کا وہ میرِ کارواں

○

مجتبیٰ حسین کا جاپان چلو

گوپی چند نارنگ
(دہلی، بھارت)

مجتبیٰ حسین میرے دوست ہیں۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں وہ آپ میں سے بہتوں کے دوست ہیں۔ یہ غلط فہمی وہ اکثر پیدا کر دیا کرتے ہیں۔ بعض لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ ان کے خاص دوست ہیں۔ ان کے خاص دوستوں اور عام دوستوں کا حلقہ بھی خاصا وسیع ہے لیکن ایک معاملہ اور بھی ہے نہ صرف یہ کہ وہ میرے خاص دوست ہیں بلکہ میرے پڑوسی بھی ہیں۔ کسی بھی پڑوسی کے بارے میں آپ کچھ کہہ لیں تنقیدی رویہ نہیں اپنا سکتے۔ تو جو کچھ بھی میں کہوں گا وہ اسی رشتے سے ہوگا۔ مجتبیٰ صاحب کے بارے میں جب جب سوچتا ہوں، ایک بات کی طرف میرا خیال بار بار جاتا ہے۔ ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی فکر تونسوی کے یہاں برسوں پہلے۔ غالباً ان کے دوسرے مجموعے کی رسم اجرا تھی۔ مجھے اس وقت بھی خیال آیا تھا کہ اکثر ہماری تاریخ میں یلغار شمال سے جنوب کی طرف ہوتی رہی ہے۔ کئی بار شمال نے جنوب کو زیر کیا ہے لیکن ہماری ادبی تاریخ میں دو سانحے ایسے ہیں کہ جنوب نے شمال پر دھاوا بولا اور شمال کو زیر کر لیا۔ ایک زمانہ تو اورنگ زیب کے فوراً بعد کا ہے آخری مغل تاجداروں کا۔ جب ولی کا دیوان دہلی پہنچا تھا اور دہلی کی گلیوں میں ولی کی غزلوں نے ایک نئی گونج پیدا کر دی۔ اورنگ زیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ خاندیش میں دکن میں خیموں میں گزارا تھا پھر جو شمال اور جنوب میں رابطہ پیدا ہوا اور راہیں استوار ہوئیں تو اس کے بعد سے (اگر چہ لسانی رابطے تو پہلے بھی تھے) شعری رابطہ باقاعدہ قائم ہوا تو دکن نے دہلی کے دل کو جیت لیا۔ دوسری بات ہمارے زمانے میں یہ کام مجتبیٰ حسین نے سرانجام دیا ہے۔ ادھر دہلی والوں کی ادبی زندگی میں ایسی کچھ کمی تھی کہ جب مجتبیٰ حسین یہاں آئے تو انھوں نے بہت جلد دلوں کو مسخر کرنا شروع کیا اور مزاح کی محفلوں میں ایک نئی معنویت پیدا ہوگئی۔ یہ نہیں کہ یہاں مزاح کا چرچا نہیں تھا۔ تھا، فکر تونسوی لکھ رہے تھے، دوسرے احباب بھی ہیں، کبھی کبھی مزاح کے شعرا بھی آجاتے ہیں، مشاعروں میں شعری نشستوں میں، لیکن یہ بات نہیں تھی۔ ہمارے یہاں ہر طرح کا ادب تخلیق ہو رہا تھا۔ غزل تھی، نظم تھی، افسانہ تھا، ڈراما تھا، ناول تھا لیکن مزاح نگاری جس کو صحیح معنویت میں مزاح نگاری کہا جاتا ہے، اسے دہلی کی زندہ ادبی روایت کا حصہ مجتبیٰ حسین نے بنایا اور یہ معمولی کارنامہ نہیں ہے چنانچہ اس طرح جنوب اور شمال کے دکن اور دہلی کے رشتے کو ایک بار پھر انھوں نے جوڑ دیا۔ ابھی شمس الرحمٰن فاروقی نے فرمایا کہ بعض لوگ مزاح نگار کو ادب میں دوسرے درجے کا مسافر سمجھتے ہیں۔ اگر چہ ادب میں درجہ بندی سے مفر نہیں لیکن یہ پوری سچائی بھی نہیں کیونکہ اول تو پھر سب کو شاعری کرنا چاہیے کیونکہ شعرا پہلے درجے کے مسافر ہیں، اس لیے دوسرے، تیسرے یا چوتھے درجے کے شعرا کو اول درجے کے نثر نگاروں پر ترجیح دینی لازم آئے گی۔ حقیقت کا دوسرا رخ یہ ہے کہ صنف چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی، فنکار چھوٹا یا بڑا ہوتا ہے، یعنی جو بھی ہو جس میں کمال اچھا ہے، پھر آپ کسی درجے میں سفر کرتے ہوں، مزاح کو کہیں رکھیں، لیکن ادب کا کوئی تصور طنز و مزاح کے بغیر مکمل نہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہر ادب میں طنز یہ پیرائے کی جس میں لغوی معنی کی تقلیب ہوتی ہے، نیز شگفتہ تحریروں کی، ہنسنے ہنسانے کی، ظریفانہ تحریروں کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ کسی بھی زبان کا ادب اگر معاشرے سے ہم کلامی کا حوصلہ رکھتا ہے تو اس میں مزاحیہ عنصر ضرور ہوگا۔ کسی بھی ادب کا تصور آپ اس کے مزاحیہ حصے کے بغیر نہیں کر سکتے۔ یاد رہے طنز و مزاح ادب سے جب جب غائب ہوا ہے معاشرہ بیمار ہو گیا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو فرخ سیر، جعفر زٹلی کو قتل نہ کروا دیتا۔ ان دنوں ہم اردو میں آفات ارضی و سماوی کے جس دور سے گزر رہے ہیں، ہنسنے ہنسانے کی بڑی ضرورت ہے۔ ادھر یہ صلاحیت معاشرے میں کچھ کم ہو گئی ہے۔ یہ نہیں کہ اردو میں روایت نہیں تھی۔ شاعری میں خاصی روایت رہی ہے، لیکن یہ ذاتی حملوں کی روایت تھی۔ حریف کو نیچا دکھانے کی ہجو نگاری اور پھکڑپن کی۔ نثر میں جو بات پطرس، کنہیا لال کپور، رشید احمد صدیقی، ابن انشا نے پیدا کی، اس روایت کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے خصوصاً پطرس کی روایت کو۔ مجتبیٰ حسین کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اس راہ میں قدم بڑھایا ہے۔ وہ ترقی کر رہے ہیں۔ ان کے فن کے اندر بڑی وسعت ہے اور جتنے حربے، جتنے طریقے جتنی تکنیک ہو سکتی ہیں مزاح پیدا کرنے کی، فطری طور پر یہ سب ان کے فن میں موجود ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ برابر لکھ رہے ہیں اور ان کے قلم کی روشنائی خشک نہیں ہوئی۔ مزاح کس طرح پیدا ہوتا ہے یا کس طرح پیدا کیا جاتا ہے۔ میں تو کہوں گا کہ مزاح نگار اگر وہ فطری طور پر مزاح کی طرف راجع نہیں ہے اور محض کوشش و کاوش سے بات بناتا ہے تو بہت جلد بے نقاب ہو جاتا ہے اور اپنے سفر میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ بہت سی ایسی مثالیں ہیں جن کے نام لینے سے کچھ حاصل نہیں۔

جتنے بھی گُر ہیں اس فن کے مجتبیٰ حسین ان سب سے واقف ہیں اور ان حربوں کو وہ نہایت سہولت سے فطری طور پر برتتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو وہ Born Humourist ہیں۔ اگر چہ ادب میں پیدائشی کچھ نہیں ہوتا ہر چیز تربیت وسعی و توجہ سے وجود پاتی ہے۔ طنز و مزاح کی جان تعریض ہے اور یہی حربہ مجتبیٰ حسین کے فن میں مرکزیت رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ خود کو سیدھا سادا سمجھ لیتے ہیں جیسا کہ بعض احباب کا خیال ہے بلکہ یہ سادہ لوحی نظر کا دھوکا ہے مزاح کی نقاب ہے۔ تعریض کے فن کو جس خوبی سے مجتبیٰ برتتے ہیں وہ

دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر اس طرح سے پرتیں کھول کر لفظوں کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے آرٹ میں اس سے کیا کیا کام لیا جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین مبالغے کو کس طرح سے برتتے ہیں۔ تقابل کو کس طرح برتتے ہیں، غیر متناسب اشیا یا عوامل کو کس طرح لاتے ہیں، نیز زبان سے مزاح کس طرح پیدا کرتے ہیں، یہ سب دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہماری شاعری میں بالخصوص یہ روایت رہی ہے کہ محض زبان سے مزاح پیدا کیا گیا۔ زبان کی صوتی و معنوی مناسبتوں یا تضاد کی مدد سے مضحک پہلوؤں کو ابھارنے کی خصوصیت رشید احمد صدیقی کے یہاں خاصی نمایاں ہے۔ مجتبیٰ حسین صورت حال (Situation) سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں اور طنز خصوصاً سماجی طنز کی آمیزش سے بھی لطف بیان کا سماں باندھتے ہیں۔ یاد رہے کہ مزاح کے لیے ذہانت بہت ضروری ہے اور طنز کے لیے سماجی شعور۔ اپنے معاشرے کی کمیوں کا اس کی کوتاہیوں کا اس کی طاقت کا اندازہ ہونا بہت ضروری ہے۔ احساس نہ ہو تو بات نہیں بنتی۔ ایک دو مثالیں پیش کروں گا، تفصیل کا وقت نہیں۔ دیکھیے تعریض کو وہ کس طرح سے برتتے ہیں۔ کتابوں کا جو شوق جاپان میں ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جاپان کی آبادی تقریباً ساڑھے گیارہ کروڑ ہے اور سال بھر میں تقریباً 80 کروڑ کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ گویا ہر جاپانی سال بھر میں ساڑھے چھ کتابیں ضرور خریدتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ پڑھنے لکھنے کے معاملے میں شہرت رکھنے کے باوجود پچھلے تین برسوں میں ہم نے کوئی کتاب نہیں خریدی۔ ہاں، ادیب دوستوں کی کتابوں کے اعزازی نسخے ضرور قبول کرتے ہیں اور انھیں پڑھے بغیر ردی میں بیچ دیتے ہیں۔"

اس طرح جب وہ تقابل کرتے ہیں تو جہاں جہاں جاپان میں انھیں کوئی چیز ایسی معلوم ہوتی ہے جس سے تعجب ہوتا ہے تو فوراً ہندستانی معاشرے سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس میں سماجی طنز کی ہلکی سی آمیزش سے ان کی ترقی اور اپنے یہاں کی پس ماندگی کے مضحک پہلوؤں کو بے نقاب کرتے جاتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر ان کے دل کا درد بھی جھلکتا ہے لیکن اس کے دیکھنے کے لیے نظر چاہیے۔ جہاں جاپان کی گاڑیوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی تعریف کی ہے تو دیکھیے کہ تقابل اور طنز سے کیا لطف پیدا کیا ہے۔ خاص طور سے دیکھیے کہ ایسے موقعوں پر طنز میں الفاظ کے معنی کس طرح بالکل الٹ دیے جاتے ہیں اور تحریر میں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے:

"جاپانیوں کو سفر کرنا بالکل نہیں آتا۔ اس معاملے میں یہ لوگ ہم سے بہت پیچھے ہیں۔ صرف آرام دہ ریل گاڑیاں بنانے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ سفر کرنے کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں جس سے جاپانی بالکل واقف نہیں ہیں۔ ہمیں جاپانی ریل گاڑیوں سے یہ شکایت بھی ہے کہ یہ بہت ٹھیک وقت پر چلتی ہیں۔ انتظار میں جو لذت ہوتی ہے اس کا مزہ جاپانیوں کو کیا معلوم۔ ایسے ہی کئی معاملات ہیں جن میں جاپانی ہم سے بہت پیچھے ہیں، آپ یقین کریں کہ ہمیں ٹوکیو میں کسی بھی اسٹیشن پر ٹرین کے لیے دو منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک ٹرین جاتی ہے تو دوسری اس کے پیچھے آجاتی ہے اور پھر ان کی رفتار بھی ایسی تیز کہ آدمی کا کلیجہ منہ کو آجائے۔ پتہ نہیں انھیں کہاں جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہماری ریل گاڑیاں اسٹیشن میں داخل ہونے سے پہلے بیرونی سگنل کے پاس ضرور رکتی ہیں۔ سیٹیاں بجاتی ہیں اور مسافر کھڑکیوں میں سے جھانک کر سگنل کو دیکھتے ہیں۔ کتنا مزہ آتا ہے۔ لگتا ہے جاپانی ریل گاڑیوں کا کوئی سگنل ہی نہیں ہوتا۔ بس منہ اٹھائے کسی بھی اسٹیشن میں گھس جاتی ہیں۔"

یہ سفرنامہ بھی ہے اور مزاح کی کتاب بھی۔ اردو میں اس سے پہلے اس کی نظیر صرف ابن انشا کی تحریروں میں ملتی ہے یعنی "چلتے ہو تو چین کو چلیے" یا "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" یا دیگر اس طرح کی تحریریں۔ اگرچہ اب سفرنامہ باقاعدہ ایک صنف کے طور پر لکھا جا رہا ہے بالخصوص پاکستان میں اس طرف خاصی توجہ ہے اور بہت سے لوگوں نے سفرنامے لکھے ہیں لیکن ایسا سفرنامہ جس میں مزاح کا عنصر غالب ہو، کم از کم میری نظر سے ابن انشا کے بعد اس طرح کی کوئی تحریر نہیں گزری۔ ملاحظہ ہو محض ایک لفظ سے اور لفظ بھی نہیں محض صیغۂ تانیث سے ایک پورا باب 'یونیسکو کی چھتری' مزاح کا شاہکار بن گیا ہے۔ یہ جملے دیکھیے:

"وہ ہمیں ٹوکیو میں دوسرے دن ملی اور ہم نے اسی دن اپنی بیوی کو خط لکھا "وہ ہمیں آج ملی ہے دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔ اب ہمیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گزارنے ہیں۔ اسی کے سائے میں رہنا ہے۔"

ہر ہر جملے کی تانیثیت چھتری کی طرف بھی راجع ہے اور محبوبہ کی طرف بھی۔ مبتدا میں ایک بار ذکر کرکے مزاح نگار اس کو گول کر دیتا ہے۔ بیوی کے خط میں لفظ چھتری لکھنے سے رہ گیا ہے اور اس طرح ابہام سے شبہ پیدا ہوا۔ اس کے بعد میاں بیوی میں جو نوک جھونک ہوتی ہے وہ قاری کے لیے تفنن طبع کا سامان فراہم کر دیتی ہے۔ یہ بار بار وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ بی بی میں نے تو چھتری کے بارے میں لکھا تھا اور میں لفظ چھتری لکھنا بھول گیا تم کس تصور میں غرق ہو۔ لیکن وہ بالکل نہیں مانتی۔ یہ اس کے سر کی قسم کھاتے ہیں۔ وہ کہتی ہے:

"اچھا تو میرے سر کی عزت کرتے ہو تبھی تو میرے سر پر ایک نئی چھتری لا رہے ہو۔"

یہ سارا کا سارا باب شگفتگی کا شاہکار ہے۔ صورت حال (Situation) کا مزاح

بھی جگہ جگہ انھوں نے پیدا کیا ہے۔ ہلکا سا اشارہ اس کی طرف کروں گا کہ مزاح کا ایک خاص حربہ مبالغہ بھی ہے۔ مبالغے کا عنصر جب تک مزاح نگار داخل نہ کرے، مزاح، مزاح نہیں بنتا۔ جس طرح آپ ہر روز کارٹون میں دیکھتے ہیں۔ شکل کو کچھ بگاڑا جاتا ہے اور فیچرز کو تھوڑا exaggerate کیا جاتا ہے۔ مصافحہ کا ذکر چل رہا ہے، جاپانی آداب کا ذکر کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''ہماری تربیت کچھ ایسی ہوئی ہے کہ نہ صرف مصافحہ کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ موقع ملے تو ملاقاتی سے گلے مل کر اس کی پسلیوں کی مضبوطی کا امتحان بھی لیتے ہیں۔ ہم سے دو چار دنوں تک یہ بدتہذیبی سرزد ہوتی رہی کہ دھڑا دھڑ جاپانیوں سے مصافحہ کرتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ جس کسی سے مصافحہ کرتے وہ فوراً اپنے ہاتھ دھونے کے لیے بھاگتا تھا۔ آخر کو سمجھدار آدمی ہیں تاڑ گئے کہ ہمارے مصافحے اور بغل گیری ضائع جارہی ہیں۔ ہم نے بھی ملاقات کے جاپانی آداب اختیار کر لیے۔ جاپانی جب بھی کسی شناسا کو دیکھتا ہے تو دو تین گز دور کھڑا ہو جاتا ہے اور ساٹھ درجہ کا زاویہ بنا کر تعظیماً جھک جاتا ہے گویا کہنا چاہتا ہے کہ بھیا تمھیں دور ہی سے سلام۔''

پھر لکھتے ہیں کہ:

''تعظیماً جھکنے کے اور بھی کئی ذیلی آداب ہیں۔ پتہ چلا کہ ملاقاتی کی عمر اور رتبہ کے لحاظ سے آپ کو جھکنے کے زاویہ کا تعین کرنا پڑتا ہے۔ کتنی مرتبہ آپ کو جھکنا ہے اس کا انحصار بھی کئی باتوں پر ہوتا ہے جو شخص جھکنے میں پہل کرتا ہے وہ جتنی مرتبہ جھکے اتنی ہی مرتبہ آپ کو بھی جھکنا پڑتا ہے۔ ایک بار ہم نے اپنے جاپانی دوست کے آگے جھکنے میں پہل کی تھی وہ جھکا تو ہمیں احساس ہوا کہ ہمیں اور بھی جھکنا چاہیے! اب جو ہم دونوں کے بیچ جھکنے کا سلسلہ شروع ہوا تو رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔''

کیونکہ انھیں معلوم ہی نہ تھا کہ رکنا بھی ان ہی کو ہے۔ آخر میں میں اشارہ کرنا چاہوں گا مزاح کی ایک اور قوت کی طرف جو مجتبیٰ حسین کی تحریروں سے جھلکتی ہے اور وہ ہے کردار نگاری۔ کوئی مزاح نگار اگر ایسے کرداروں کو خلق نہیں کرسکتا جن کی پوری شخصیت مزاح سے بھرپور ہو اور جن کی ہر بات میں شگفتگی ہو، اس وقت تک وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ مجتبیٰ حسین کے خاکوں اور مضامین کے مجموعوں میں بہت سے ایسے کردار ملتے ہیں اور اس سفرنامے میں بھی کئی دلچسپ کردار ایسے ہیں۔ آخری باب میں لنکا کے جس مندوب سے انھوں نے ملاقات کرائی ہے جیا کوڈی سے، وہ تو ایسا زبردست کردار ہے کہ الگ سے اس کو خاکوں کے مجموعے میں بھی شامل کر لینا چاہیے۔ کہتے ہیں کہ وہ مندوب ہمیشہ کہا کرتا تھا:

''مجھے سری لنکا کے وزیر اعظم نے بطور خاص اس سمینار میں شرکت کے لیے نامزد کیا ہے۔ ہر دم وزیر اعظم سری لنکا سے اپنے گہرے روابط و مراسم کا ذکر کرتے اور ہم سے پوچھتے رہتے کہ ہندوستان کی وزیر اعظم سے ہمارے مراسم کیسے ہیں۔ ہمیں بھی جواباً کہنا پڑتا تھا کہ ہمیں بھی ہندوستان کی وزیر اعظم نے بطور خاص اس سمینار میں شرکت کے لیے بھیجا ہے اور یہ کہ ہم بھی وزیر اعظم ہندوستان کے خاص آدمی ہیں اور ہمارے مشورے کے بغیر حکومت ہند کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔ ہم جاپان میں ہیں تو حکومت کے سارے کاروبار ٹھپ ہو گئے ہیں۔ ہم اپنی دانست میں یہ سمجھتے تھے کہ جیا کوڈی چونکہ صرف ڈینگ ہانکتے ہیں اس لیے ہمیں بھی ڈینگ ہانکنے کا حق حاصل ہے۔ مگر ان ہی دنوں جب وزیر اعظم سری لنکا، جاپان کے سرکاری دورے پر آئے تو یہ ہمیں اپنے وزیر اعظم سے ملانے کے لیے گئے۔ ملاقات سے پہلے ہمیں پابند بھی کیا کہ ہم ان کے وزیر اعظم کی دو چار کتابیں پڑھ کر چلیں اور ان کے بارے میں رائے بھی دیں۔ ہمیں دیکھ کر تعجب ہوا کہ وزیر اعظم سری لنکا سے جیا کوڈی کے سچ مچ نہایت گہرے اور بے تکلفانہ مراسم ہیں۔ جیا کوڈی یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان اور سری لنکا کے بیچ چند نزاعی امور ہیں تو ان کو سلجھانے کے لیے ہم اپنے اثرات اور رسوخ کو کام میں لے آئیں۔ کہتے تھے میں اپنے وزیر اعظم کو سمجھاتا ہوں تم اپنی وزیر اعظم کو سمجھاؤ۔ جیا کوڈی نے ہمیں سری لنکا آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ کہتے تھے کہ تمہارا سرخ قالین والا خیر مقدم کراؤں گا مگر وہ تو خدا کا شکر ہے کہ ان کے سری لنکا اور ہمارے ہندوستان واپس آنے کے چند ہی دنوں بعد مسٹر پریم داسا کی حکومت ٹوٹ گئی جس حکومت کے مشیر جیا کوڈی ہوں اس کا یہ حشر تو ہونا ہی تھا۔''

مجتبیٰ حسین نے جیا کوڈی کے بہت سے مزاحیہ پہلو ابھارے ہیں، سب کے ذکر کی گنجائش نہیں اور بہت سے واقعات ہیں۔ صرف ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کروں گا:

''جیا کوڈی بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ کبھی ہم لوگ کسی مقام سے دو ٹیکسیاں لے کر اپنے ہوٹل پر پہنچتے تھے تو وہ بڑے غور سے دونوں ٹیکسیوں کے میٹر کا مطالعہ ضرور کرتے تھے اور اس بات پر گھنٹوں اظہار حیرت کرتے رہتے تھے کہ دونوں ٹیکسیوں کا میٹر ایک ریڈنگ دے رہا ہے۔ کم از کم میرے ملک میں تو ایسا نہیں ہوتا۔''

آخر میں ایک مزے کی بات لکھی ہے اور اس کے بغیر یہ حوالہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ ایک دن جیا کوڈی نے پوچھا کہ ہندوستان میں شائستہ سلام کے لیے آپ کے یہاں کون سا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے کہا کہ 'نمستے' کہا کیجیے۔ بولے ''نمستے تو میں جانتا ہوں کوئی اور مہذب سلام سکھاؤ''، مجتبیٰ حسین نے 'آداب عرض' کا نسخہ تجویز کیا۔ بولے ''یہ بھی نہیں چلے گا کوئی ایسا سلام سکھاؤ جو

بہت ہی مہذب ہو۔''مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''ہمیں مذاق سوجھا اور ہم نے انھیں ایک نا قابل اشاعت گالی سکھا دی۔ بہت خوش ہوئے اور ہر صبح کو اسی گالی سے ہمارا استقبال کرنے لگے۔ ہم بھی جی ہی جی میں خوش ہوتے رہے کہ چلو دیارِ غیر میں کوئی ہمیں گالی دینے والا بھی ہے۔ ایک دن ہم لوگ گنزہ کے ایک ہندستانی ریستوران میں کھانا کھانے گئے۔ جیا کوڈی نے اتنی محبت سے ہم سے یہ سلام سیکھا تھا۔اس نادر موقع کو بھلا کس طرح ہاتھ سے جانے دیتے۔سوانھوں نے ہندستانی بیرے کو بلا کر نہایت ادب کے ساتھ اپنی دانست میں ہمارا سکھایا ہوا سلام عرض کر دیا۔ ہم چپ چاپ بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ بیرے نے منیجر سے شکایت کی اور جب منیجر ان سے باز پرس کرنے کے لیے آیا تو جیا کوڈی نے جھک کر پھر وہی سلام ان کی خدمت میں بھی پیش کر دیا۔ منیجر سمجھدار آدمی تھا۔ اس نے جان لیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔اس نے الگ لے جا کر جیا کوڈی کو سلام کے معنی ومفہوم سے آگاہ کیا۔ جیا کوڈی ٹیبل پر واپس آئے تو نہایت غیر مہذب لہجے میں یہی سلام ہماری خدمت میں پیش کرتے ہوئے بولے۔''تم بہت سنگین مذاق کرتے ہو۔ وہ تو اچھا ہوا کہ منیجر شریف آدمی تھا۔اگر کوئی دوسرا ہندستانی ہوتا تو نہ جانے اس سلام کا جواب مجھے کس طرح ملتا۔ بعد میں جیا کوڈی نے بہت چاہا کہ ہم بھی سنہالی زبان میں ان سے سلام کرنے کے مہذب اور شائستہ کلمات سیکھ لیں مگر ہم نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔''

تو مجتبیٰ حسین کے فن کے بہت سے پہلو ہیں اور باتیں کرنے کو بہت ہیں لیکن وقت کم ہے اور میں نے مختصراً تعریض، تقابل، مبالغہ، صورت حال کے مزاح یا کردار نگاری کے مزاح کی طرف یا سماجی طنز کی طرف کچھ اشارہ کیے۔ آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ کوئی بھی شخص جو مزاح لکھتا ہو یا شگفتہ تحریریں لکھتا ہو یا دوسروں کو ہنستا ہنساتا ہو، کہیں کہیں اس کے دل میں کوئی نہ کوئی چھپا ہوا درد ضرور ہوتا ہے۔ مجھے بھی یقین ہے کہ مجتبیٰ حسین کی آنکھوں سے تنہائی میں بھی کوئی آنسو ضرور ٹپکتا ہوگا اور کوئی نہ کوئی چوٹ دبی ہوئی ان کے دل میں ایسی ضرور ہوگی جو انھیں خود بھی ہنسنے اور دوسروں کو بھی ہنسانے پر مجبور کرتی ہے۔ اس دعا کے ساتھ اور نیک تمناؤں کے ساتھ کہ ان کا سفر جس طرح سے خوب سے خوب تر کی تلاش میں جاری ہے، جس طرح اپنی تحریروں پر انھوں نے ضبط رکھا ہے اگر چہ وہ بہت لکھ رہے ہیں کچھ زیادہ لکھ رہے ہیں اور زیادہ لکھنے والے کو ہمیشہ خطرہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے معیار سے گر نہ جائے لیکن مجتبیٰ حسین نے جس طرح معیار کے معاملے میں اب تک نگہداشت کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مزاحیہ ادب میں اونچا مقام حاصل کریں گے۔

غزل

کیا کہوں، کل رات، خالی گھر میں کیا جلتا رہا
ایک میں جلتا رہا، یا اک دیا جلتا رہا

بجھ گئے اک ایک کر کے رات کے سارے چراغ
اک چراغ ایسا بھی تھا، بجھتا رہا جلتا رہا

نذرِ آتش کر رہا تھا جب میں خود اپنا جہاز
سیلِ برق و باد ساحل پر کھڑا جلتا رہا

میرے گلشن میں لگائی جب کسی دشمن نے آگ
میں نے دیکھا، وہ بھی خود بے دست و پا جلتا رہا

لوگ نیرو کی طرح مصروف نَے دیکھے گئے
اور میں جیسے کوئی روم تھا، جلتا رہا

اُس کے نقشِ پا سے بچ کر، رہگذارِ شوق میں
ایک انگارہ سا میرے زیرِ پا جلتا رہا

آئے تو احباب، لیکن خالی مشکیزے لئے
اور ان کے سامنے شہرِ وفا جلتا رہا

گھر کے اندر، کچھ نہ لکھ پایا میں بجلی کے بغیر
اور باہر بلب اک بے فائدہ جلتا رہا،

داستاں یہ ہے خیالؔ اپنی کہ اوروں کے لئے
عمر بھر یونہی دھواں دیتا رہا، جلتا رہا

○

خیال آفاقی
(کراچی)

مدیر ''نقوش'' سے عزیز احمد کی سودے بازی

رؤف خیر

(حیدرآباد دکن)

یہ ادب کا بہت بڑا المیہ ہے کہ اب خطوط لکھے ہی نہیں جا رہے ہیں۔ادب ہی کیا کسی بھی فن کے نابغہء روزگار کے خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔تحریر کا حسن اور واقعیت خطوط ہی سے تو جھلکتی ہے جو لکھنے والے کا ذہن پڑھنے میں مدد کرتی ہے۔ادب کے حوالے سے ہم جائزہ لیں تو غالبؔ کے خطوط جہاں اردو نثر کے ارتقاء کا اہم حصہ سمجھے جاتے ہیں وہیں غالب کے دور کے حالات کے غماز بھی ہیں غالب کے شاگردوں اور چاہنے والوں کے حوالے سے ان کے علاقوں کی صورت حال اور غالب سے ان کے تعلقات کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔مراسلے کو مکالمہ بنانے کی روایت بھی تو غالب نے ڈالی تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اسی بہانے غبارِ خاطر کو قول فصیل کی صورت دی۔کلام کے ساتھ ساتھ خطوط نے اقبالؔ کو زندہ رود بنا ڈالا۔حتیٰ کہ بعض قلم کاروں نے اپنی اقبال مندی کی خاطر اپنی ٹکسال میں مراسلت کے سکے ڈھالے جن پر تحقیق جاری ہے کہ یہ کہاں تک قلب ساوی کے مظہر ہیں۔

پنڈت جی نے اپنی بیٹی کے نام خطوط لکھے تو قاضی جی نے لیلیٰ کے خطوط ڈھونڈ نکالے جس کے جواب میں مجنوں کی ڈائری منظر عام پر آئی۔

غرض ادب کا انمول سرمایہ یہی خطوط سمجھے جاتے ہیں۔آج بھی اگر شیکسپیئر، غالبؔ یا اقبالؔ کا کوئی خط کہیں سے دستیاب ہو جائے تو ہزاروں ڈالروں اور روپیوں میں اسے تولا جاسکتا ہے۔

کئی رسالوں نے ادیبوں شاعروں کے خطوط پر مبنی نمبر نکالے اور ان کی شخصیت اور ذہنیت سے روشناس کروایا۔کئی ادیب شاعر اپنے خطوط کی وجہ سے سرخرو ہوئے تو کئی مشاہرین نے اپنے ہی قلم سے اپنی قبریں بھی کھودی ہیں۔

آیئے اپنے دور کے ایک مشہور وممتاز ادیب' شاعر' مفکر کے خطوط کا جائزہ لیں۔

عزیز احمد اردو ادب کی ایک مشہور وممتاز شخصیت کا نام ہے۔یہ جب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں زیر تعلیم تھے تب ہی سے شعر وادب سے وابستگی کا ثبوت دینے لگے تھے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''عزیز احمد ایک جائزہ'' میں لکھا ہے کہ عزیز احمد ۱۱، نومبر ۱۹۱۳ء کو بارہ بنکی میں پیدا ہوئے جب کہ خود عزیز احمد نے اپنے فکر وفن پر ریسرچ کرنے والی شمیم افزاء قمر کو اپنے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا کہ وہ ۱۹۱۴ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔عزیز احمد کی پہچان ایک حیدرآبادی ہی کی طرح قائم رہی۔ان کی ابتدائی تعلیم عثمانیہ ہائی اسکول عثمان آباد میں ہوئی جو نظام ہفتم میر عثمان علی خاں کے نام پر آباد تھا اور ممالک محروسۂ عالی کا حصہ تھا۔پولیس ایکشن کے بعد لسانی بنیادوں پر علاقوں کی تقسیم عمل میں آئی تو یہ مقام مہاراشٹرا میں شامل کر دیا گیا۔ابتدا میں وہ عزیز احمد عثمان آبادی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔پندرہ سال کی عمر میں عزیز احمد کا ایک افسانہ ''کشاکش جذبات'' کے عنوان سے مجلّہ مکتبہ حیدرآباد کے نومبر ۱۹۲۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔انھوں نے انیس سال کی عمر میں رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک کہانی کا ''پجارن'' کے عنوان سے ترجمہ کیا جو ''نیرنگ خیال'' ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ان کی نظمیں مجلّہ عثمانیہ میں شائع ہوئیں۔انھوں نے کئی افسانے اور مضامین بھی لکھے جو مختلف اخبار و جرائد میں چھپتے رہے۔چونکہ عثمان آباد بعد میں مارا شٹرا میں شامل کر دیا گیا تھا، اسی لیے ''مرہٹواڑہ اور اردو افسانہ ایک جائزہ'' پیش کرتے ہوئے عنایت علی نے عزیز احمد کا تفصیلی تعارف کرایا ہے۔(ملاحظہ ہو مرہٹواڑہ کے اردو افسانے کی ایک انتھالوجی ''مٹی میرے دریا کی'' مرتبہ عنایت علی، اورنگ آباد) عزیز احمد پچاسوں کتابوں کے مصنف تھے جن میں افسانوں کے پانچ مجموعے (رقص ناتمام، بیکار دن بیکار راتیں، آب حیات، میٹھی چھری اور کایا پلٹ) اور ''دس ناول ہوس، مرمر اور خون، گریز، آگ، ایسی بلندی ایسی پستی، شبنم، مثلث، تری دلبری کا بھرم، خدنگِ جستہ اور جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں (تاریخی ناول) مشہور ہیں۔ابتدائی دو ناول ہوس اور ''مرمر اور خون'' کو خود عزیز احمد اپنے کمزور ناول سمجھتے تھے تاہم ''ہوس'' کا دیباچہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا۔ڈاکٹر یوسف حسین خان کی زیر نگرانی نکلنے والے رسالے ''سیاسیات'' میں عزیز احمد سیاسی اور تاریخی نوعیت کے مضامین لکھا کرتے تھے۔اقبال فہمی کے سلسلے میں ''اقبال نئی تشکیل'' عزیز احمد کو ماہرین اقبال میں شمار کراتی ہے۔عزیز احمد کی تحریریں ہند و پاک کے معیاری رسائل میں شائع ہوتی تھیں جیسے سویرا' ہمایوں' ادبی دنیا' نقوش وغیرہ ان کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کا انگریزی ترجمہ The Shore and Waves کے نام سے ''رالف رسل'' نے کیا جو لندن سے چھپا۔

عزیز احمد صرف فکشن ہی میں ممتاز نہ تھے بلکہ وہ ایک کامیاب منفرد شاعر بھی تھے۔ان کی طویل ڈرامائی نظمیں ''ماہ لقا''۔عمر خیام، فردوس برروئے زمین۔سنوریا اور آخری دور کی دردناک غزلیں جب وہ کینسر (سرطان) کے شکار موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا تھا ''صیدِ تن و شکنجہء خرچنگ دوستو'' ہیں اور آخر کار ۱۶؍دسمبر ۱۹۷۸ء کو چونسٹھ برس کی عمر میں وہ اس کشاکش زندگی سے آزاد ہو گئے۔

عزیز احمد نے بڑی خوش حال زندگی گزاری۔ جامعہ عثمانیہ سے جب بی اے میں امتیازی حیثیت سے ساری یونیورسٹی کا نام روشن کیا تو سرکاری وظیفے پراعلیٰ تعلیم کے لیے انھیں لندن بھیجا گیا جہاں سے انگریزی ادب میں بی۔ اے آنرز ۱۹۳۸ء میں کامیاب کر کے لوٹے تو عثمانیہ یونیورسٹی میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۴۱ء تک انگریزی کے لکچرر رہنے کے بعد وہ شہزادی درشہوار کے پرائیویٹ سکریٹری بنائے گئے۔ یہ خدمت انھوں نے ۱۹۴۶ء تک انجام دی۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے مسائل اور پھر پولیس ایکشن کے اثرات نے انھیں پاکستان پہنچادیا جس میں ان کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کا دخل بھی سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ حکومت پاکستان کے محکمۂ مطبوعات وفلم سازی Department of Advertising Films and Publication میں پہلے اسسٹنٹ ڈائریکٹر، ڈپٹی ڈائریکٹر اور پھر ۱۹۵۳ء میں ڈائرکٹر ہوگئے۔ ۱۹۵۷ء میں لندن یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر کے طور پر بلائے گئے اور ۱۹۶۲ء تک وہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۲ء میں ٹورنٹو کینیڈا میں اسلامیات کے اسوسیئٹ پروفیسر مقرر ہوئے ۱۹۶۸ء میں پروفیسر ہوگئے۔ انھوں نے انگریزی میں بھی کئی کتابیں لکھیں۔ خاص طور پر سسلی تاریخ لکھنے پر انعام و اکرام سے بھی نوازا گیا۔ ان کی ہمہ جہت علمی حیثیت کے اعتراف میں لندن یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی تھی۔ ادھر اختر اورینوی کی زیرنگرانی شمیم افزاء قمر نے عزیز احمد کی ناول نگاری پر مقالہ لکھ کر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

عزیز احمد کے کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ انھوں نے زندگی کے ایک ایک لمحے کی اہمیت محسوس کی۔ جم کر لکھا اور خوب لکھا۔ اس مضمون میں ان کی ذہانت اور ذہنیت کی ایک ہلکی سی جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کے خالق کے نشیب وفراز کی داستان ان کے خطوط سے جھانکتی دکھائی دیتی ہے جو انھوں نے مدیر ''نقوش'' محمد طفیل کے نام لکھے ہیں۔ ''نقوش'' کوئی سرکاری رسالہ نہیں تھا اس کے باوجود وہ اپنے لکھنے والوں کو ان کی تحریروں کا معاوضہ بھی پیش کرتا تھا۔ ویسے ''نقوش'' ایسا معیاری رسالہ تھا کہ لکھنے والے اس میں اپنی تخلیقات کے چھپ جانے ہی کو بہت بڑا انعام سمجھتے تھے۔ نقوش کے معیاری ضخیم نمبر تاریخی و دستاویزی حیثیت کے حامل شمار ہوتے ہیں جیسے ادبی معرکے نمبر، رسول نمبر، خطوط نمبر، افسانہ نمبر، ناولٹ نمبر وغیرہ وغیرہ۔ خود محمد طفیل نے ''جناب'' اور ''صاحب'' کے عنوان سے اہم اہم شخصیات پر دلچسپ خاکے بھی لکھے ہیں۔

عزیز احمد نے مدیر ''نقوش'' سے اپنی تحریروں کے معاوضے کے سلسلے میں جو سودے بازی کی ہے وہ چونکاتی ہے۔

محمد طفیل نے ادارہ ''نقوش'' سے مشہور ناول ''امراؤ جان ادا'' چھاپا تھا۔ دراصل انھوں نے ''سلسلہ روح ادب'' کے تحت کلاسیکی ادبی سرمائے کا نشاۃ ثانیہ کا بیڑہ اٹھایا تھا جو کافی مقبول ہوا۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

''بہرحال آپ نے یہ سلسلہ شروع کر دیا ہے تو اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ اسے World's Classic کی طرح جاری رکھیے۔ ایک اور بڑا بے مثل ناول ''نشتر'' ہے جو امراؤ جان ادا سے بھی پہلے لکھا گیا اور جس کا شمار اردو کے بہترین ناولوں میں کیا جا سکتا ہے۔ آپ کہیں تو اسے Edit کر کے مقدمے کے ساتھ آپ کے پاس بھیج دوں مقدمہ Editing وغیرہ کا جملہ معاوضہ مجھے دوسو روپے -/Rs.200 دینا ہوگا جو ایسا زیادہ نہیں ہے۔ اور بھی اس سلسلے میں کیا پروگرام ہے؟ اگر میں کوئی مدد کر سکتا ہوں تو حاضر ہوں۔

فقط عزیز احمد (خط مورخہ ۲۶ فروری ۱۹۵۰ء)

خطوط نمبر۔ G.C.U لاہور ''تحقیق نامہ''

اس عرصے میں عزیز احمد کا ایک مضمون اور ایک افسانہ ''نقوش'' میں شائع ہوا تھا۔ مگر محمد طفیل صاحب کی طرف سے ان کا معاوضہ بھیجنے میں تاخیر ہوگئی تھی۔ چنانچہ کراچی سے عزیز احمد انھیں لکھتے ہیں:

مکرمی جناب طفیل صاحب۔

آپ نے اب تک مضمون وغیرہ کے معاوضے کے -/65 روپے نہیں بھیجے۔

''نشتر'' پر میں نے کافی کام شروع کر دیا ہے۔ دو ہفتے میں آپ کے پاس بھیج دوں گا۔

فقط عزیز احمد (خط مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۵۰ء)

اس دوران عزیز احمد کا تبادلہ کراچی سے راولپنڈی ہوگیا۔ وہاں سے انھوں نے مدیر ''نقوش'' کے نام خط لکھا:

مکرمی طفیل صاحب تسلیمات۔

نقوش کا نیا پرچہ دیکھنے کو ملا۔ خود مجھے نہیں ملا۔ شاید اس لیے کہ میں تبادلہ ہو کے راولپنڈی آ گیا ہوں۔ ایک پرچہ روانہ فرمائیں اور نیز معاوضہ چالیس -/40 روپے بھی...... ''نشتر'' مع اصلاح و دیباچہ کب تک مطلوب ہے تحریر فرمائیے۔

فقط عزیز احمد (خط مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۵۰ء)

اپنی تحریر کے معاوضے کے لیے وہ اس قدر تاؤلے ہو رہے تھے کہ پانچ دن بعد ایک اور خط لکھا:

مکرمی جناب طفیل صاحب تسلیمات عرض ہے۔

گرامی نامہ ملا۔ براہ کرم آپ چالیس -/40 روپیہ مجھے خود براہ راست فوراً بھیج دیجیے۔ آپ کے کراچی کے آفس کو میرا پتہ نہیں معلوم ہے اس کے علاوہ میں معاوضے میں تاخیر نہیں چاہتا۔ میرا دوسرا افسانہ ''آخرکار'' آپ بلا

معاوضہ قطعاً نہیں شائع کر سکتے۔ میں اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ بجائے چالیس-/40 کے اس کا معاوضہ آپ سے تیس-/30 روپیہ لوں۔ اس سے زیادہ رعایت نہیں ہو سکتی۔ یہ منظور نہ ہو تو افسانہ مجھے فوراً واپس بھیج دیں۔ تقاضہ اور تکرار خوشگوار چیز نہیں۔

''نشتر'' عنقریب تیار ہو جائے گا۔ مگر یہ خیال رہے کہ اس کا معاوضہ فوراً مل جائے۔

فقط عزیز احمد (خط مورخہ ۲۱ء جولائی ۱۹۵۰ء)

ادبی دنیا میں ''نقوش'' کا معیار و مرتبہ مسلمہ تھا۔ محمد طفیل کی اپنی ادبی شناخت بھی مسلمہ تھی۔ انھوں نے عزیز احمد کے افسانے کا معاوضہ ادا کرتے ہوئے ان کا دوسرا افسانہ واپس کر دیا اور ''نشتر'' شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ تب شاید عزیز احمد کو کچھ احساس زیاں ہوا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

مکرمی جناب طفیل صاحب تسلیمات عرض ہے۔

چالیس-/40 روپیہ اور ''آخر کار'' کا مسودہ واپس مل گئے۔ بہت بہت شکریہ ''نشتر'' کی حد تک مجھے حیرت ضرور ہوئی لیکن جو آپ کی مرضی۔ اس کا شائع ہو جانا ہی میرے لیے ایک طرح کا انعام اور معاوضہ ہے۔ اس کا دیباچہ میں لکھ چکا تھا۔ لیکن خیر۔ اور کوئی کام اگر میرے لائق ہو تو پس و پیش نہ کیجیے گا۔ معاوضہ کا معاملہ البتہ بالکل کاروباری قسم کا ہونا چاہیے''

فقط عزیز احمد (خط مورخہ ۱۰ء اگست ۱۹۵۰ء)

اسی زمانے میں جلال الدین احمد تین نئے ناول کے عنوان سے قسط وار ایک ایک ناول کا تفصیلی جائزہ لے رہے تھے۔ جس کی دوسری قسط قرۃ العین حیدر کے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' (مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور ۱۹۴۹ء) پر مشتمل تھی جو ''نقوش'' کے سالنامہ (دسمبر ۱۹۵۰ء) میں شائع ہوئی۔ تیسری قسط اعلان کے مطابق عزیز احمد کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' پر شائع ہونے والی تھی۔ چنانچہ عزیز احمد نے محمد طفیل کو لکھا:

جناب طفیل صاحب' اسلام علیکم۔

نقوش کا سالنامہ ملا۔ بہت پسند آیا۔ آپ کو اور وقار صاحب کو مبارک ہو۔ احمد ندیم قاسمی کی کہانی بہت خوب ہے۔ میرے خیال میں تو یہ ان کی بہترین کہانی ہے۔ نقوش کا اس طرح ناغہ نہ کیا کیجیے۔ پابندی سے شائع ہو تو رسالے کا مارکیٹ بندھا ہوا رہتا ہے۔ اور کوئی خدمت میرے لائق ہو تو تحریر فرمائیں۔

''نقوش'' کے آئندہ نمبر میں جلال الدین احمد کے مضمون کی تیسری قسط کا انتظار رہے گا جو غالباً میرے ناول پر ہے......

فقط عزیز احمد (خط جنوری ۱۹۵۱ء)

اس سالنامے کے بعد محمد طفیل ''نقوش'' کا ایک ''ناولٹ نمبر'' شائع کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے عزیز احمد سے بھی لکھنے کی فرمائش کی۔ جواباً عزیز احمد نے جو شرائط پیش کیں وہ ان کے مزاج کی عکاسی کرتے ہیں:

مکرمی و محبی جناب طفیل صاحب۔ تسلیمات عرض۔

میں ضرور آپ کے ناولٹ نمبر کے لیے ایک طویل مختصر افسانہ لکھنے کو تیار ہوں بشرطیکہ:

(۱) اس کی ضخامت ''نقوش'' کے تیس ۳۰ صفحے کے لگ بھگ ہوگی نہ کہ ساٹھ صفحے۔ نقوش کے ساٹھ صفحے چھوٹی تقطیع (کذا) کے ۱۲۰ صفحوں سے بھی زیادہ ہو جائیں گے جن کا معاوضہ مجھے عام طور پر ہزار روپیہ ملا کرتا ہے۔

(۲) اس کو آپ نقوش میں شائع تو کر سکیں گے۔ نقوش ہی کے دوسرے ایڈیشن میں بھی اسے شامل کر سکیں گے لیکن اسے کتابی صورت میں نہ شائع کر سکیں گے۔

(۳) اس کا معاوضہ دو سو روپے-/200 مسودہ ملتے ہی مجھے ارسال فرمادیں گے۔

اگر یہ منظور ہو تو فروری کے ختم تک انشاء اللہ طویل مختصر افسانہ یا ناولٹ بھیج دوں گا......

فقط عزیز احمد (خط مورخہ ۲۵ء جنوری ۱۹۵۱ء)

مدیر ''نقوش'' نے ناولٹ کے لیے دو سو روپے-/200 ادا کرنے کی حامی بھر لی تھی مگر نقوش کے تیس صفحات کے بجائے ساٹھ صفحات پر مشتمل ناولٹ پر اصرار کیا تھا۔ چنانچہ عزیز احمد انھیں خط لکھتے ہوئے تیقن دلاتے ہیں:

''ناولچہ میں ضرور لکھ دوں گا اور کوشش کروں گا کہ پچاس ساٹھ صفحے کا ہو مگر اس کا معاوضہ وہی ہوگا جو آپ خود متعین کر چکے ہیں یعنی محض نقوش کے ایک یا ایک سے زیادہ ایڈیشن کے لیے دو سو روپے-/200 اس میں کمی کا امکان نہیں۔ اور کوئی خدمت۔

فقط عزیز احمد (خط مورخہ ۳۰ء جنوری ۱۹۵۱ء)

شاید اس دوران مدیر نقوش کی طرف سے یاد دہانی کرائی گئی تھی۔ عزیز احمد نے بڑے دوٹوک انداز میں محمد طفیل صاحب کو خط لکھا:

مکرمی و محبی جناب طفیل صاحب۔ السلام علیکم۔

گرامی نامہ کا شکریہ۔ آپ کو ناولٹ ''نقوش'' کے لیے مل جائے گی اور مجھے دو سو روپیہ معاوضہ جو خود آپ کا تجویز کیا ہوا ہے۔ اس لیے بحث ختم...... ناولٹ نمبر ہی میں جلال الدین احمد کے بقیہ مضمون کو بھی شامل فرما دیجیے۔ جو 'ایسی بلندی ایسی پستی' پر ہے۔ اور سب خیریت ہے۔

فقط عزیز احمد (خط مورخہ ۶ء فروری ۱۹۵۱ء)

مگر اپریل ۱۹۵۱ء تک بھی عزیز احمد ناولٹ لکھ نہ سکے۔ حالانکہ ۲۵ء

جنوری ۱۹۵۱ء کے اپنے خط میں اپنی شرائط پیش کرتے ہوئے انھوں نے فروری کے ختم تک ناولٹ بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔اب وہ محمد طفیل کو لکھتے ہیں:

مکرمی ومحبی جناب طفیل صاحب۔

گرامی نامہ کا شکریہ۔ناولٹ نہ بھیج سکنے کا افسوس ہے لیکن میں نے آپ سے حتمی وعدہ تو نہیں کیا تھا۔کوشش کرنے کے لیے لکھا تھا۔باوجود کوشش کے میں اس کی تکمیل نہ کر سکا اور نہ مستقبل قریب میں اس کے مکمل ہو سکنے کی کوئی توقع ہے۔ بتائیے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے کوشش تو بہت کی کہ آپ کی فرمائش کی تکمیل کروں۔لیکن کام کی چیز لکھنے کے لیے وقت درکار ہے اور وقت آپ نے ہمیشہ بہت کم دیا۔اگر آپ نے بجائے فروری کے مجھے اپریل تک شروع ہی میں مہلت دی ہوتی تو بہت اچھا ناولٹ اب تک تیار ہو گیا ہوتا۔اب آپ کا جی چاہے تو میرا انتظار کیے بغیر ناولٹ نمبر شائع کر دیں۔ یا مجھے کم از کم ایک ماہ کی مہلت دیں۔

مخلص۔عزیز احمد

(اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے مگر قارئن سے یہ اوائل اپریل ۱۹۵۱ء کا لگتا ہے)

مئی ۱۹۵۱ء میں ''نقوش'' کا ناولٹ نمبر شائع ہو گیا۔رقمی معاوضے کے علاوہ اب عزیز احمد اس پر اصرار کرنے لگے کہ ان کے ناول کے بارے میں جلال الدین احمد کا لکھا ہوا مضمون ''نقوش'' میں شائع کیا جائے۔ان کا ایک خط بڑا حیران کن ہے:

مکرمی ومحبی طفیل صاحب۔تسلیمات عرض

آپ سے ایک چھوٹی سے شکایت بھی ہے۔جلال الدین احمد کے مضمون ''تین نئے ناول'' کے دو حصے تو آپ نے شائع کیے لیکن تیسرا حصہ جو ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کے متعلق تھا آپ نے اب تک شائع نہیں کیا۔اس ناراضی کا باعث کیا ہے؟ یہ حصہ شائع ہو لے تو پھر میں بھی ''نقوش'' کے لیے کچھ لکھوں گا اور پہلی چیز جو میں آپ کے لیے لکھوں گا بلا معاوضہ ہو گی لیکن اس کے لیے مجھے جلال الدین کے مضمون کا انتظار رہے گا۔جنھیں خود شکایت ہے۔

کم ترین۔عزیز احمد (خط مورخہ ۶ جنوری ۱۹۵۲ء)

ایک عرصے تک عزیز احمد نے ''نقوش'' کے لیے کچھ نہیں لکھا۔ایسا لگتا ہے اندر اندر وہ مدیر ''نقوش'' سے خفا خفا سے تھے۔ان کی فرمائش کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

مکرمی ومحبی جناب طفیل صاحب۔السلام علیکم۔

آپ کے دو خط ملے ایک شکایت کا دوسرا میرے خط کے جواب میں۔میں آپ کو مضمون یا افسانہ ضرور بھیجوں گا۔اس کا حتمی وعدہ کرتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ پہلے آپ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' پر جلال الدین احمد والا مضمون شائع کریں۔آخر آپ نے مجھ سے یہ امتیاز کیوں برتا؟ اگر مجھ سے ''نقوش'' کے لیے لکھنے میں تاخیر ہوئی تو احسن فاروقی اور قرۃ العین نے اتنا بھی نہیں لکھا جتنا میں نے لکھا۔اگر آپ اب تک ''نقوش'' کے لیے کچھ نہ بھیجنے کی وجہ پوچھتے ہیں تو عرض ہے کہ وجہ محض یہی تھی کہ آپ نے ایک مضمون کا محض وہ حصہ شائع کرنے سے اجتناب کیا جو مجھ سے متعلق تھا اور یہ تضاد میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک طرف تو مجھ سے مضمون کا تقاضا اور اخلاص کا دعویٰ اور دوسرے میرے ہی خلاف ایسا امتیازی سلوک! اس لیے میں آپ کو ایک نہیں کئی مضامین یا افسانے بھیجنے کو تیار ہوں جن میں سے صرف پہلا بلا معاوضہ ہو گا لیکن اگر آپ کو اپنے اخلاص کا دعویٰ سچا نظر آتا ہے تو آپ کو بھی میرے خلاف یہ قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا اور اب یہی صورت ہو سکتی ہے کہ پہلے آپ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' والا مضمون شائع فرمائیں۔میں اس کو پڑھ لوں۔اس کے بعد کے شمارے کے لیے افسانہ یا مضمون بھیجنے کا میرا حتمی اور پکا وعدہ ہے۔مجھے نقوش سے کوئی بیر نہیں۔ ہمدردی ہے کیونکہ آپ اس ناموافق زمانے میں اتنی گراں قدر ادبی خدمت انجام دے رہے ہیں......

مخلص۔عزیز احمد (خط مورخہ فروری ۱۹۵۲ء)

عزیز احمد حکومت پاکستان کے Department of Advetisting,Films and Publications میں ڈپٹی ڈائرکٹر اور پھر ڈائرکٹر ہو گئے تھے۔۱۹۵۰ء میں یعنی آج سے ساٹھ برس پہلے کے تیس چالیس روپے آج کے تیس چالیس ہزار روپیوں کے برابر تھے۔ایک ناولٹ کے لیے عزیز احمد کا دو سو روپے طلب کرنا گویا دو لاکھ روپے کا مطالبہ کرنا ہے۔مدیر ''نقوش'' کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ اپنے لکھنے والوں کو ایسی کثیر رقم بطور معاوضہ دینے پر قادر تھے۔

عزیز احمد کو روپے پیسے کی کبھی کمی نہیں رہی۔حیدرآباد میں وہ بادشاہ کی بہو۔درشہوار کے پرائیویٹ سکریٹری رہے جو بہت باعزت منصب تھا۔پاکستان میں بھی وہ اہم عہدوں پر اچھے خاصے مشاہرے کے حامل رہے۔اس کے باوجود اگر مدیر نقوش سے سودے بازی کرتے دکھائی دیتے ہیں تو دراصل وہ اپنے قلم کی اہمیت جتانا چاہتے تھے۔

اشاریات:

۱۔ ''تحقیق نامہ'' معاصرین کے مکاتیب۔(مدیر نقوش: محمد طفیل کے نام) خصوصی شمارہ۔۰۶۔۲۰۰۵ء شعبہ اردو جی۔سی۔یونیورسٹی لاہور۔

۲۔ ''مٹی مرے دیار کی''۔مرتبہ عنایت علی۔دارالمصنفین۔ اورنگ آباد۔مارچ ۲۰۰۱ء

۳۔ ''سوغات''۔۶ بنگلور۔(مدیر: محمود ایاز) مارچ ۱۹۹۴ء

☆

ڈرامہ

آدھی گھروالی

گلزارجاوید (راولپنڈی)

سین نمبر۱

کردار:عذرا

(گھر کے ٹی وی لاؤنج میں ٹیلی فون کی گھنٹی سن کر داخل ہوتی ہے)

عذرا: ہیلو......کون......؟ اوئی اللہ......نورین کی بچی......کم بخت تجھے میری یاد کیسے آ گئی۔ چل جھوٹی......ہاں ہاں میں تجھے بہت مس کرتی ہوں......سوشل ورک تو ہوتا ہی رہتا ہے......اللہ کا کرم ہے۔ بڑی عزت دی ہے اس نے......ارے واقعی! تو مذاق تو نہیں کر رہی۔ مجھے کالج کا زمانہ آج بھی یاد ہے۔ تیز طرّار لڑکوں اور اچھے بھلے پروفیسروں کو بیوقوف بنا دیا کرتی تھی......صاف کہے دیتی ہوں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں میں......سچ......پکی بات......پرسوں شام چھ بجے اور ہاں! میرے ہوتے ہوئے کسی بھی قسم کی فکر کو ذہن میں لانے کی کوئی ضرورت نہیں......میں اور شکیل ٹھیک چھ بجے پہنچ جائیں گے......خدا حافظ

سین نمبر۲

کردار:عذرا۔شکیل

(سٹڈی کے بک شیلف میں شکیل کتابیں درست کر رہا ہے۔ جہاں عذرا داخل ہوتی ہے)

عذرا: خوشخبری لائی ہوں تمہارے لئے......سنو گے تو بس......

شکیل: تمہاری خوشخبری میں ہمیشہ میری شامت کو دخل ہوتا ہے......

عذرا: یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو......؟

شکیل: سسپنس پیدا کرنے کی ضرورت نہیں، فون پر تمہاری گفتگو سن چکا ہوں......

عذرا: بڑے جھکّی قسم کے انسان ہو تم، بھئی میری سب سے پکی دوست، نورین آ رہی ہے۔ اس کے شوہر کا تبادلہ یہاں......اسلام آباد ہو گیا ہے اور تمہیں ذرا بھی......

شکیل: سچ مچ مارے گئے......پہلے کم شامت آتی ہے میری، تمہارے سوشل ورک کی بدولت، اب یہ محترمہ وارد ہونے والی ہیں۔ لگتا ہے میری قسمت کے سارے برے دن یکجا ہونے والے ہیں۔

عذرا: (اٹھلاتے ہوئے) کمال کرتے ہو تم، پتا ہے! پرسوں آ رہے ہیں وہ دونوں اور اس سے اگلے دن ہماری Marriage Anniversary ہے (خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے) کتنا مزہ آئے گا......

سین نمبر۳

کردار:شکیل۔عذرا۔نورین۔نورین کا شوہر مختار

(آؤٹ ڈور، کار میں سفر کرتے ہوئے)

مختار: شکیل صاحب! آپ سے مل کر جی باغ باغ ہو گیا۔ قطعاً محسوس نہیں ہو رہا کہ ہم پہلی بار مل رہے ہیں۔

شکیل: اس زندگی میں......؟

مختار: (حیران ہوتے ہوئے) اس زندگی سے مراد......؟

شکیل: اماں! جس طرح ہماری بیگمات پکی سہیلیاں ہیں ہو سکتا ہے پچھلے جنم میں ہم دونوں اس سے بھی پکے دوست رہے ہوں......(زوردار قہقہہ)

سین نمبر۴

کردار:عذرا۔نورین

(ڈرائنگ روم کے صوفے پہ بیٹھیں محوِ گفتگو)

نورین: تم ہر سال اسی دھوم دھام سے شادی کی سالگرہ مناتی ہو......؟ کہاں سے آتا ہے اتنا پیسہ......؟

عذرا: (نورین کے سر پر چپت لگاتے ہوئے) بنو جی! سوشل ورک کرنا خالہ جی کا گھر نہیں ہے......بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے، کچھ نہ کچھ تو لگانا ہی پڑتا ہے......

نورین: مثلاً......کیا حاصل ہوتا ہے ان پارٹیوں سے......؟

عذرا: پی آر......میری جان! پی آر......جتنی آپ کی پی آر Strong ہو گی اتنا ہی ریٹرن ملے گا......یعنی معاملہ گڑ اور مٹھاس کا ہے۔

نورین: کافی تبدیلیاں دیکھ رہی ہوں تیرے اندر......پہلے تو اتنی چالاک نہ تھی تُو......

عذرا: یہ تو صرف ٹیلر ہے حضور......دیکھنا ہے تو کل پارٹی میں دیکھنا......

سین نمبر۵

کردار:عذرا۔شکیل۔نورین۔مختار۔غلام رسول۔اللہ دتہ۔مرزا منور۔بھٹی صاحب۔شیخ آفتاب اور بہت سے مہمان

(وسیع ڈرائنگ روم میں پارٹی کا منظر اور کھانے پینے کا زور)

عذرا: اسلام علیکم ملک صاحب......کیسے ہیں آپ! جب سے الیکشن جیتے ہیں نظر ہی نہیں آتے۔

ملک غلام رسول: کیوں شرمندہ کرتی ہیں بیگم صاحب......ہم تو یہیں آپ کے قدموں میں ہیں......

عذرا: (اپنے پیروں کی جانب دیکھتے ہوئے) میرے قدموں میں

ملک غلام رسول: جناب! آپ تو محاورہ بھی نہیں سمجھتیں......(عذرا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے)

عذرا: (قہقہہ مار کر طنزیہ انداز میں) محاورہ بھی استعمال کرنے لگے ہیں آپ......ان سے ملئے یہ میری بہت پیاری سہیلی نورین مختار ہیں ان کے شوہر کا اسلام آباد میں تبادلہ ہوا ہے۔ پرسوں ہی آئی ہیں۔

ملک غلام رسول: (خوشی سے للچاتے ہوئے) سبحان اللہ جی...... ماشاءاللہ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر......خیر سے کہاں کام کرتے ہیں آپ کے شوہر......؟

نورین: جی واپڈا میں ایکسین ہیں......

ملک غلام رسول: بہت خوب جی' بہت خوب (نزدیک ہوتے ہوئے سرگوشی میں) یہاں کا چیف انجینئر میرا یار ہے...... بڑی منتیں کرتا ہے' ملک صاحب! کوئی کام بتائیں' کوئی حکم کریں میں کہتا ہوں بھئی تاؤلے کیوں ہوتے ہو کام ہوگا تو تم نے ہی کرنا ہے اور کون کرے گا......آپ کہیں تو آپ کے شوہر کا......؟

نورین: نہیں نہیں ملک صاحب......میرے شوہر کا ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔ اگر کبھی ہوا تو آپ کو ضرور زحمت دوں گی......

ملک غلام رسول: نہیں جی......آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے......میں لیتا دیتا کچھ نہیں فی سبیل للہ کام کرتا ہوں......

نورین: میرا مطلب......تکلیف دینے سے ہے......

ملک غلام رسول: چھوڑیں جی......میں خوب سمجھتا ہوں...... پڑھا لکھا بندہ ہوں (مزید قریب آتے ہوئے' راز داری سے) آپ اس طرح تو نہ ٹرخائیں۔ کچھ تو موقع دیں پھر دیکھیں میرے اختیارات......؟

نورین: (زچ ہوتے ہوئے) اب میں آپ کو کیا کام بتاؤں میں تو خود اس شہر میں نوارد ہوں......

ملک غلام رسول: (نورین کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے) کچھ بھی جناب......کچھ بھی......ہاتھ کنگن کو آرسی کیا......آپ حکم تو کریں۔

نورین: (ٹھہر کر کچھ سوچتے ہوئے) ہاں ...... ایک کام ہے ملک صاحب...... پر وہ آپ کے اختیار............؟

ملک غلام رسول: سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی کام صاحب ملک غلام رسول صاحب کے اختیار سے باہر ہو۔

نورین: (ہنسی ضبط کرتے ہوئے) میری بہن ہے زبیدہ......

ملک غلام رسول: (جملہ اچکتے ہوئے) آپ سے چھوٹی ہیں......؟

نورین: جی......مجھ سے چار سال چھوٹی ہے (غلام رسول کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتے ہوئے) اچھا بھلا لاہور میں پڑھاتی تھی اس کا تبادلہ چکوال کر دیا گیا ہے......اگر آپ......

ملک غلام رسول: آپ پڑھے لکھے لوگ اگر مگر بہت استعمال کرتے ہیں......بس جی آپ جناب کام ہوا سمجھیں اپنی بہن کا نام اور......

نورین: زبیدہ......

ملک غلام رسول: جی......زبیدہ......اوران کا حدود اربعہ......

نورین: (ناگواری سے) کیا فرمایا آپ نے......؟

ملک غلام رسول: (ہکلاتے ہوئے) میں...... میں ...... میرا مطلب جی ان کے کوائف سے ہے۔

عذرا: (اچانک نورین کا بازو گھسیٹتے ہوئے آہستگی سے) کمال کرتی ہو تب سے اس چپکو کے ساتھ کھڑی ہو...... بھئی وہ تو تھے ہمارے موجودہ کونسلر (آواز اونچی کرتے ہوئے) ان سے ملو یہ ہمارے علاقے کے سابقہ کونسلر الحاج اللہ دتہ صاحب ہیں......اللہ دتہ صاحب! ان کا ذکر تو میں آپ سے پہلے ہی کر چکی ہوں......

اللہ دتہ: بس جی......بیگم شکیل نے اتنا اشتیاق بڑھا دیا تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

نورین: (سوچوں سے چونک کر) کیا نہیں کر سکتے......؟

اللہ دتہ: شیخیاں بہت بگھارتا ہے...... بہت تڑیاں لگاتا ہے لوگوں کو...... میں یہ کرادوں گا۔ وہ کرادوں گا۔ مگر میں جانتا ہوں کتنے پانی میں ہے یہ فراڈیا......

نورین: کس کی بات کر رہے ہیں آپ حاجی صاحب............؟

اللہ دتہ: (لقمہ دیتے ہوئے) الحاج صاحب

نورین: جی جی......الحاج صاحب

اللہ دتہ: اجی اس بڑبولے کی جس کے پاس آپ اپنا وقت ضائع کر رہی تھیں......فراڈیا ہے......ایک نمبر کا بے ایمان......عین گنتی کے وقت بجلی بند نہ کرائی ہوتی تو میں اس بار بھی اس کی ضمانت ضبط کرا دیتا......لیکن جناب عزت دینے والا تو بڑا بے نیاز ہے۔ بہت عزت دی ہے اس نے مجھے......یہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا......یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھ لیجئے......چٹکی بجاتے میں آپ کا مسئلہ حل نہ کرادوں تو الحاج اللہ دتہ کی بجائے چُوڑا کہیئے گا......چُوڑا......

نورین: (معنی خیز ہنسی پر قابو پاتے ہوئے) الحاج صاحب! کام تو ہے...... اگر آپ............

اللہ دتہ: (غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے) اگر سے کیا مراد ہے آپ کی...... آپ کام ہوا سمجھیں (چٹکی بجاتے ہوئے) بس آپ کام کی تفصیل بتائیں فٹا فٹ......

نورین: میری چھوٹی بہن ہائی سکول میں پڑھاتی ہے اس کا تبادلہ لاہور سے چکوال ہو گیا ہے......

اللہ دتہ: (ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے) یہ بھی کوئی کام......؟ میں تو سمجھا

تھا کوئی پرمٹ پلاٹ یا لائسنس وغیرہ...... جس میں آپ کے ساتھ ہمارا بھی......؟

نورین: جی......؟

اللہ دتہ: کچھ نہیں جی' کچھ نہیں......بس آپ کام ہوا سمجھیں......اپنی بہن سے کہیں بستر باندھ رکھیں بلکہ ٹکٹ بھی کٹالیں......

شکیل: (اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے) کب سے ڈھونڈ رہا ہوں آپ کو...... میرے ساتھ آیئے مختار بھائی کو تو ملوا چکا ہوں اب آپ کو اپنے باس لطیف بھٹی سے ملوانا ہے......سر......سر یہ......

لطیف بھٹی: (انگلی کے اشارے سے منع کرتے ہوئے) بھئی کچھ ہمیں بھی بولنے دو گے کہ نہیں......؟

شکیل: جی سر! آپ باتیں کیجئے میں دیگر مہمانوں کو دیکھتا ہوں......

لطیف بھٹی: عجیب بھلکڑ آدمی ہیں یہ اپنے شکیل صاحب......تین مرتبہ تفصیلی تعارف کروا چکے ہیں اور پھر الف سے شروع ہو رہے تھے......

نورین: تین مرتبہ......میرا تعارف......یقین نہیں آتا......

لطیف بھٹی: یقین آتا نہیں' دلایا جاتا ہے اور میں یہ فریضہ بخوشی انجام دے رہا ہوں......اور سنایئے دل لگ گیا آپ کا......ہمارے شہر میں......

نورین: مجبوری ہے جناب......لگانا تو پڑے گا ہی......

لطیف بھٹی: بصد شوق' بصد شوق...... آپ تو ماشاء اللہ بڑی باذوق خاتون ہیں......آپ کہاں ان تیسرے درجے کے سیاستدانوں میں وقت ضائع کر رہی تھیں...... یہ سب ہمارے آگے ناک رگڑنے والے لوگ ہیں......آپ کو کسی دقّت یا پریشانی کا سامنا ہو تو بندہ حاضر ہے (نورین کے سامنے سر جھکاتے ہوئے) آپ کا ارشاد ہمارے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔

نورین: (آنکھوں میں شرارت بھرتے ہوئے) واقعی......؟

لطیف بھٹی: آزمائش شرط ہے......

نورین: بھٹی صاحب...... (ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے) کیا عرض کروں......میری چھوٹی بہن لاہور میں ٹیچر تھی اس کا چکوال ٹرانسفر ہو گیا ہے اگر آپ چکوال سے کہیں اچھی جگہ......

لطیف بھٹی: یہ تو کوئی کام نہ ہوا......آپ کا حکم ہے تو سمجھئے' آپ کی ہمشیرہ کا ٹرانسفر ہوا کہ ہوا۔

عذرا: ایکسیوز می......سر میں ذرا...... (نورین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

لطیف بھٹی: Sure, Sure......

عذرا: (آہستگی سے) اس چغد کو اتنی لفٹ کرانے کی کیا ضرورت ہے بھلا......؟

نورین: نمونے تم نے پال رکھے ہیں میں نے نہیں۔

شیخ آفتاب: بیگم شکیل......کیسی ہیں آپ......؟

عذرا: جی بالکل ٹھیک ہوں...... آپ سنایئے! آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں۔ غالباً کل کے اخبار میں آپ کی تصویر چھپی تھی...... چندہ دیتے ہوئے۔

شیخ آفتاب: لاکھ کوشش کرتا ہوں' شہرت سے بچنے کی......کم بخت پیچھا ہی نہیں چھوڑتی۔

عذرا: ان سے ملئے......یہ میری عزیز ترین دوست نورین مختار ہیں......

شیخ آفتاب: جانتا ہوں......

نورین: (حیرت سے) جانتے ہیں......؟ مگر میں تو آپ سے پہلی بار مل رہی ہوں۔

شیخ آفتاب: پہلی بار نہیں' دوسری بار (انگلی کے اشارے سے دو کا ہندسہ بناتے ہوئے) پہلی بار ہماری ملاقات' غلام رسول صاحب کے پاس ہوئی تھی۔ میں بھی نزدیک ہی کھڑا تھا۔ آپ برا نہ منایئے گا' میں نے آپ کی تمام باتیں سنی ہیں۔ آپ بھی کہاں' نالی موری ٹھیک کرانے اور کچرا اٹھانے والوں کو منہ لگا رہی تھیں۔ غلاظت اٹھاتے اٹھاتے ان کی ذہنیت بھی غلیظ ہو چکی ہے......ان کا تو کام ہی لوگوں کو لارے لگانا ہے......ویسے منسٹر آف ایجوکیشن میرا دوست ہے......

نورین: (خوشی کا اظہار کرتے ہوئے) آپ کا دوست ہے......؟ وزیر تعلیم......؟

شیخ آفتاب: دوست نہیں' لنگوٹیا کہئے لنگوٹیا...... وہ بیچارہ تو میرے احسانوں کے نیچے دبا رہتا ہے......کہتا ہے! آفتاب یہ تم ہی ہو جس نے مجھے وزارت تک پہنچایا ہے......

نورین: واقعی......؟ مجھ سے تو بڑی بھول ہوئی......

شیخ آفتاب: ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا......آپ حکم تو کریں میں منسٹر کو کان سے پکڑ کر آپ کا کام کرا سکتا ہوں......

نورین: اُف شیخ صاحب......میں بیان نہیں کر سکتی کہ آپ نے میرا کتنا بڑا مسئلہ......

شیخ آفتاب: Particular مجھے دیں اور بے فکر ہو جائیں......الٰہ دین کے چراغ کے جن سے پہلے آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی۔

عذرا: (مرزا منور کے ساتھ قریب آتے ہوئے) نورین ان سے ملو یہ ہماری پارٹی کے مقامی صدر منور مرزا صاحب ہیں......یقین مانو میرے کریئر میں ان کی بڑی سپورٹ حاصل رہی ہے مجھے......

مرزا منور: کیوں شرمندہ کر رہی ہیں......اپنا تو کام ہی یہ ہے کہ جہاں بھی ٹیلنٹ دستیاب ہو (بصد غور نورین کا جائزہ لیتے ہوئے) اس کی حوصلہ افزائی کی

جائے...... یہ سب کچھ میں' پارٹی کے مفاد میں کرتا ہوں......میری بات لکھ لیں وزارت آپ کے دروازے پر دستک دے رہی ہے......

عذرا: (جھینپ کر) ابھی تک لیڈی کونسلر تو بن نہ سکی وزیر خاک بنوں گی......

مرزامنور: تھوڑا وقت دیں مجھے' پھر دیکھیں...... میں نے بادشاہ بننے کے بجائے ہمیشہ بادشاہ گر بننا پسند کیا ہے حالانکہ پرائم منسٹر صاحب بار ہا زور دے چکے ہیں......''منور تم جیسے ذہین آدمی کی مجھے سخت ضرورت ہے جو بھی وزارت چاہو' لے لو' مگر میں ہر بار یہی کہتا ہوں (سینہ پھلا کر) ''سر میں اقتدار کا بھوکا نہیں ہوں آپ کا متوالا ہوں......''

نورین: پھر تو آپ بڑی آسانی سے اسمبلی کے ممبر منتخب ہوجاتے ہوں گے......؟

مرزامنور: (گھبراتے ہوئے) کئی بار...... بلکہ ہر بار پارٹی مجھے ٹکٹ آفر کرتی ہے اور میں ہر بار کسی دیرینہ کارکن کو پرپوز کردیتا ہوں......مرکزی کابینہ میں تین وزیر میرے برخورداروں میں ہیں......

نورین: تب تو آپ کے لئے ایک تبادلہ کرانا مشکل نہ ہوگا......؟

منورمرزا: تبادلہ......؟

نورین: میری چھوٹی بہن لاہور میں پڑھاتی تھی......

منورمرزا: آپ نے بتایا کیوں نہیں اب تک تو آپ کی بہن لاہور واپس پہنچ چکی ہوتیں......آپ ان کے کوائف مجھے دیں فوراً سے پیشتر اور جلدی سے پہلے آپ کی ہمشیرہ کا تبادلہ ان کی من پسند جگہ پر ہوجائے گا۔

مختار: (مہمانوں کو رخصت کرتے ہوئے) آج تو جناب بڑی مصروف ہیں......کیا آپ کا ارادہ بھی سوشل ورکر......

نورین: نابابانا......یہ تو عذرا کا ہی حوصلہ ہے میرے بس کا روگ نہیں۔

سین نمبر٦

کردار: شکیل

(ڈرائنگ روم کے صوفے پر مطالعے میں مصروف اور فون کی گھنٹی پر متوجہ ہونا)

شکیل: جی......شکیل عرض کررہا ہوں......عذرا تو شام تک آئیں گی...... بیگم مختار......؟ وہ لوگ تو کل ہی شفٹ کر گئے ہیں۔اپنے گھر میں......نہیں نہیں نزدیک ہی لین نمبر۲ مکان نمبر ۳۴۲......فون......نہیں جی فون ابھی نہیں لگا...... خداحافظ

(کچھ دیر بعد فون کی گھنٹی پھر بجتی ہے)

شکیل: جی' اسلام علیکم...... وہ تو نہیں ہیں گھر پر...... میں شکیل عرض کر رہا ہوں......اوہو......شیخ صاحب......کیسے مزاج ہیں آپ کے......انہیں دفتر کی طرف سے گھر مل گیا ہے......فون ابھی نہیں لگا۔ پتہ لکھ لیجئے......

(کچھ دیر وقفے کے بعد فون کی گھنٹی پھر بجتی ہے)

شکیل: ہیلو......جی جی پہچان رہا ہوں......اللہ کا بڑا کرم ہے......وہ لوگ تو اپنے نئے گھر میں شفٹ ہوگئے ہیں......جی جی درست فرمایا آپ نے......

سین نمبر۷

کردار: شکیل۔عذرا۔مختار۔نورین۔لطیف بھٹی۔اللہ دتہ۔شیخ آفتاب۔غلام رسول۔مرزا منور

(عذرا اور شکیل پھولوں سمیت داخل ہوتے ہیں)

عذرا: ہائے اللہ......کتنا پیارا ہے آپ لوگوں کا گھر......مبارک ہو۔

شکیل: ہاں بھئی' عذرا ٹھیک کہہ رہی ہیں۔مبارکباد وصول کرو اور شاندار ضیافت کا اہتمام کرڈالو۔

مختار: یار سیٹ تو ہونے دو ضیافت کا اہتمام بھی ہوجائے گا۔سرِ دست ہماری بیگم کو ٹیلیفون کا غم کھائے جارہا ہے......ان کا کچھ علاج کرو۔

نورین: مہنگا ترین......مہنگا ترین علاقہ سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ بھئی علاقہ مہنگا ہے تو ہوا کرے میں کیا کروں......آج کل کے دور میں فون کے بغیر زندہ رہا جاسکتا ہے بھلا......! آپ کو اندازہ ہے میری دوستوں کی پریشانی کا......؟

(کال بیل کی آواز پر مختار دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے)

مختار: (واپسی پر) ارے بھئی! وہ آئے ہیں......وہ......آپ کے باس (شکیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)......

شکیل: بھٹی صاحب اور یہاں......؟

نورین: (سامان سمیٹتے ہوئے) جلدی سے اندر بلایئے انہیں......

مختار: سوری......سوری......(دروازے کی طرف جاتے ہوئے)

لطیف بھٹی: السلام علیکم...... اسلام علیکم ......ارے آپ یہاں کیا کر رہے ہیں (شکیل کی طرف ناگواری سے دیکھتے ہوئے) کیسی ہیں آپ......؟ (عذرا اور نورین کے قریب ہوتے ہوئے)

نورین: آپ کیسے ہیں......؟

لطیف بھٹی: فسٹ کلاس......ایک دم فسٹ کلاس......(جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے)

(کال بیل پھر بجتی ہے اور شکیل کے ساتھ اللہ دتہ برآمد ہوتے ہیں)

اللہ دتہ: واہ جی واہ لطف آگیا......(لطیف بھٹی کی طرف ناگواری سے دیکھتے ہوئے) مہمان آئے ہوئے ہیں......

لطیف بھٹی: لیجئے بیگم صاحبہ...... (نورین کی طرف فخریہ انداز میں کاغذ بڑھاتے ہوئے) آپ کا کام دستی کرا کرلایا ہوں......

(کال بیل کی آواز پر مختار باہر جاتا ہے اور اس کے ساتھ شیخ آفتاب وارد ہوتے

ہیں)

شیخ آفتاب: بھئی بہت خوب......کیا کہنے...... بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے ہیں...... میں ذرا جلدی میں ہوں......سیدھا لاہور سے آ رہا ہوں......ٹرانسفر آرڈر لے کر......

مختار: (حیرت سے) ٹرانسفر آرڈر......؟

(کال بیل پھر بجتی ہے)

شکیل: (بیٹھے بیٹھے بلند آواز میں) آجایئے......دروازہ کھلا ہے۔

غلام رسول: سلام علیکم (اندر داخل ہوتے ہوئے) کیا خوب موقع پر آیا ہوں...... ہوں تو بن بلایا مہمان پر آپ کے لئے (نورین کے قریب ہوکر، جو بدحواس لگ رہی ہے) خوشخبری لایا ہوں...... یہ کیسے ہوسکتا ہے بھلا کہ آپ بقلم خود صاحب ملک غلام رسول صاحب سے کہیں اور وہ آپ کا کام نہ کرے۔

(دروازہ کھلا دیکھ کر مرزا منور بیل بجائے بغیر ہی داخل ہوتے ہیں)

مرزا منور: اسلام علیکم بھٹی صاحب......اسلام علیکم مختار صاحب......اسلام علیکم ملک صاحب......اسلام علیکم دتہ صاحب......(سب سے ہاتھ ملاتے ہوئے) کیسے ہیں آپ لوگ......اور آپ کیسی ہیں بیگم صاحبہ (عذرا کی طرف رخ کرتے ہوئے جو نروس دکھائے دے رہی ہے) خدا کا شکر ہے کہ یہاں سب خیریت ہے......میں تو دروازہ کھلا دیکھ کر ڈر ہی گیا تھا......آیا تو میں اقبال کی طرح لیٹ ہوں پر کام سولہ آنے پکّا کرا کر آیا ہوں......یہ لیجئے......(کاغذات نورین کی طرف بڑھاتے ہوئے) گجرات کا ٹرانسفر آرڈر لایا ہوں......

لطیف بھٹی: آپ بھی......ٹرانسفر آرڈر لائے ہیں......کمال ہے......؟

غلام رسول: آپ بھی سے کیا مراد ہے......؟

اللہ دتہ: پتا نہیں آپ لوگ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں......مس زبیدہ کا اصل ٹرانسفر آرڈر تو میرے پاس ہے......اوکاڑہ جیسے صحت افزا مقام کے لیے۔

لطیف بھٹی: پر جناب......میں تو بذاتِ خود......؟

شیخ آفتاب: میں نے اگر مگر کو درمیان میں آنے ہی نہیں دیا سیدھا سیدھا جہلم کا ٹرانسفر آرڈر لے آیا ہوں......

(نورین عذرا کا ہاتھ پکڑ کر سب لوگوں کے درمیان سے کھسک رہی ہے)

مختار: بھئی نورین! یہ کیا ماجرا ہے کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے......

عذرا: (پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے) آپ لوگ تشریف رکھیں ہم چائے لے کر ابھی آتی ہیں۔

اللہ دتہ: ضرور ضرور...... چائے بھی ہونی چاہیے پہلے ٹرانسفر کا فیصلہ تو کریں......فیصلہ کیا جی اوکاڑہ سے زیادہ صحت کے لئے کوئی مقام مفید ہو ہی نہیں سکتا......

غلام رسول: چپ کر یار...... کیا اوکاڑہ، اوکاڑہ کی رٹ لگائی ہوئی ہے......

گوجرانوالہ کے پائے کھائے ہیں کبھی......؟

مرزا منور: کمال کرتے ہیں آپ لوگ......؟ سوہنی، مہیوال کے عشقیہ شہر کو چھوڑ کر فضول شہروں کا ذکر کئے جارہے ہیں......

شیخ آفتاب: میں نہیں مانتا...... ہرگز، ہرگز نہیں مانتا...... پاکستان تو کیا پورے ایشیا میں جہلم سے اچھی آب وہوا کسی بھی شہر کی نہیں......

لطیف بھٹی: کس قسم کی فضول گفتگو کر رہے ہیں آپ لوگ......جس کی بہن راولپنڈی جیسے سوہنے شہر میں بستی ہو اسے گوجرانوالہ، گجرات، جہلم یا اوکاڑہ میں دھکّے کھانے کی کیا ضرورت ہے بھلا......

مختار: (سب کی گفتگو سے تنگ آ کر) آپ سب لوگ میرے لئے قابلِ احترام ہیں مگر آپ یہ بھول رہے ہیں کہ اس گھر کا سربراہ میں ہوں...... مجھے بھی تو پتہ لگے کہ آپ سب لوگ کس کا ٹرانسفر کرانے کے چکر میں ہیں......؟

لطیف بھٹی: زبیدہ بیگم کا اور کس کا......؟

مختار: (حیران ہوکر) زبیدہ بیگم......؟

مرزا منور: آپ کی ہمشیرہ نسبتی......اور کون زبیدہ بیگم......؟

مختار: (پریشان ہوکر) میری Sister in Law......؟

اللہ دتہ: اور نہیں تو کیا Brother in Law......؟

شیخ آفتاب: آپ کی ان سے ناراضگی ہے کیا......؟

مختار: (جھنجلاتے ہوئے) کون سی ناراضگی......؟ کس سے ناراضگی......؟

غلام رسول: بھئی آپ کی سالی......زبیدہ بیگم سے......اور کس سے......؟

مختار: (کافی لمبا وقفہ دے کر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے) میرے بزرگوں ...... مجھے اپنی سالی سے اٹکھیلیاں اور چونچالی کرنے کی بڑی آرزو تھی......کیونکہ سالی آدھی گھر والی ہوا کرتی ہے......وائے قسمت دل کی حسرت دل ہی میں رہی......

لطیف بھٹی۔مرزا منور۔اللہ دتہ۔شیخ آفتاب۔غلام رسول۔ ہیں جی......(بیک آواز)

مختار: ہاں جی......میری بیگم صاحبہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہیں...... سمجھے آپ......!(ڈانٹنے کے انداز میں)

مرزا منور۔شیخ آفتاب۔لطیف بھٹی۔اللہ دتہ۔غلام رسول: اچھا جی......(بیک آواز)

مختار: آپ سب کے......خالی سروں کی قسم......

(پانچوں کردار شرم سے پانی پانی اور دونوں خواتین بالکنی میں کھڑی خوش ہو رہی ہیں۔)

☆

''گورِ غریباں''

تلوک چند محرومؔ (●)

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہِ نور جہاں ہے
مدّت ہوئی وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے
اٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے

جلووں سے عیاں جن کے ہوُا طور کا عالم
تربت پہ ہے اُن کے شبِ دیجور کا عالم

اے حسنِ جہاں سوز! کہاں ہیں وہ شرارے
کس باغ کے گل ہوگئے کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے
ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے

یا ہوگئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے
قابل ہی تو تھے عاشقِ دلگیر کے دل کے

تجھ سی ملکہ کے لئے یہ بارہ دری ہے
غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالمِ بے چارگی اے تاجوری ہے
دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسری ہے

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہے مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

تعویذِ لحد ہے زبر و زیر یہ اندھیر
یہ دورِ زمانے کے اُلٹ پھیر یہ اندھیر
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر یہ اندھیر
اے گردشِ ایّام ! یہ اندھیر یہ اندھیر

ماہِ فلکِ حسن کو یہ بُرج ملا ہے
اے چرخ! تری ہیچ نوازی کا گلا ہے

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا
ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا
اُٹھتے ہیں شرر آہِ شرر بار سے کیا کیا

یہ عالمِ تنہائی یہ دریا کا کنارہ
ہے تجھ سی حسینہ کے لئے ہُو کا نظارہ

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر
آرام لیا کرتے ہیں اس روضے میں آ کر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپّر
اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں دروبام پہ چکّر

معمور ہے یوں محفلِ جانانہ کسی کی
آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی

آراستہ جن کے لئے گلزار و چمن تھے
جو نازکی میں داغ دہِ برگِ سمن تھے
جو گل رُخ و گل پیرہن و غنچہ دہن تھے
شاداب گل تر سے کہیں جن کے بدن تھے

پژمردہ وہ گل دب کے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خاروخس و خاشاک کے نیچے

رہنے کے لئے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے
جو پیکرِ ہستی کے لئے روحِ رواں تھے
محبوبِ دلِ خلق تھے، جاں بخش جہاں تھے
تھے یوسفِ ثانی کہ مسیحائے زماں تھے

جو کچھ تھے کبھی تھے مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجر سے پڑے زیرِ زمیں ہیں

دنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دلِ ناداں!
ہاں بھُول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ نہ وہ قصر نہ ایواں
آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں

ٹوٹا ہوا اک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

○

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید

(راولپنڈی)

بھائی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

تازہ چہارسُو دستیاب ہوا۔ میں رسالے کے اس خاص نمبر کی کیا تعریف کروں کہ مجھ سے متعلق ہے۔ میں آپ کو منع کرتا آیا ہوں، جیسے اور بہت سے صاحبان کو، کہ میرے لیے زحمت کرنے سے دوسرے بہت سے کام آپ کے وقت کے زیادہ مستحق ہیں۔ بہر حال آئندہ وقتاً فوقتاً جو طلباء، طالبات اس سلسلے میں مجھے سوالنامے بھیجیں گے میں انہیں چہارسو کے اس شمارے کو پڑھنے کا مشورہ دوں گا اور مزید مشورے کے لیے آپ کا پتہ لکھ بھیجوں گا۔ آپ کا سوالنامہ بڑا بامعنی اور پُر مغز تھا۔ جزاک اللہ۔

بھائی میرے ادبی کام سے کہیں زیادہ آپ کا ادبی کام ہے جو اردو ادب کی دنیا میں ہر لحاظ سے منفرد ہے اور شاید دوسری زبانوں میں بھی اس طرح کا کام کسی اور نے نہیں کیا کہ پابندی سے اچھی ضخامت کا رسالہ مع خوبصورت سرورق کے چھاپنا، اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک اپنے خرچ پر پڑھنے والوں کو مسلسل روانہ کرتے رہنا، آپ ہی بتلایئے کسی اور نے کبھی ایسا اہم کیا ہے؟ نہیں صاحب میرا ادبی کام آپ کے ادبی کارنامے کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔ خداوند تعالیٰ آپ کو صحت دے اور آپ کے اشاعتی کام میں آپ کی مدد فرمائے۔ آمین

حسن منظر (حیدرآباد)

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب!

سلام مسنون۔ ''چہارسُو'' مجھے باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ میں آپ سے نادم ہوں کہ سابقہ چند پرچوں کی رسید بروقت نہیں دے سکا۔ تاخیر کا باعث یہ ہے کہ میں دسمبر ۲۰۰۹ سے دائیں ٹانگ میں شیائیکا پین میں جسے اردو میں ''عرق النساء'' کہتے ہیں، مبتلا ہوں اور شدید تکلیف اور پریشانی سے گزر رہا ہوں۔ یوں سمجھئے ''قحطِ دمشق'' میں لوگ عشق کرنا بھول گئے تھے۔ اس درد نے مجھے ادب کا فراموش گار بنا دیا ہے۔ میں آپ کا ناشکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ''چہارسو'' سے کبھی غیر حاضر نہیں ہونے دیا۔ اور ''قرطاسِ اعزاز'' پانے والے نامور اصحاب کی ادب شناسی میں مجھے شامل رکھا ہے۔ اس کی ایک مثال مئی جون ۲۰۱۰ کا حالیہ شمارہ ہے جس میں ''قرطاسِ اعزاز'' جناب حسن منظر کو پیش کیا گیا ہے۔ اور میری حاضری محترمہ عطیہ سکندر علی نے میرے ایک خط سے لگوادی ہے جو میں نے ۲۸ اپریل ۲۰۰۰ کو جناب حسن منظر کو لکھا تھا۔ اس خط کی بازیافت میرے لیے مسّرت کا باعث ہے کہ میں نے دس سال قبل اردو کے اس بے مثل افسانہ نگار اور انوکھے ناول نویس حسن منظر کو خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ یہ خط پڑھ کر خود مجھے حیرت ہوئی ہے۔

حسن منظر کے کردار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ شہرت کا تعاقب کرنے والے ادیب نہیں ہیں۔ وہ کسی سے اپنے فن پر مضمون لکھنے کی فرمائش نہیں کرتے۔ اپنے تخلیقی کام میں مگن رہتے ہیں اور وقفوں وقفوں سے میرے جیسے غائبانہ مدّاح کو اپنی نئی کتاب سے متعارف کرا کے حیرت زدہ کر دیتے ہیں اگر اس دور کے شہرت پسند معاصر افسانہ نگار ناراض نہ ہوں تو میں بلا خوف تردید یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ بھارت میں اپنے اندر کی آواز پر افسانہ تخلیق کرنے والے اب صرف جوگندر پال ہیں اور پاکستان میں یہ رتبۂ بلند جناب حسن منظر کو حاصل ہے۔ اردو ادب کی یہ خوش قسمتی ہے کہ وہ افسانے کے علاوہ اب ناول کی طرف بھی راغب ہو گئے ہیں۔ ''العاصفہ'' میں انہوں نے مشرقِ وسطیٰ کی حالیہ دور کی تہذیبی، معاشرتی اور سماجی تصویر پیش کی اور اس سچ کو بازیافت کیا جو ہماری عقیدتوں میں گم ہو چکا ہے ''دھنی بخش کے بیٹے'' میں داخلی سندھ کے ''وڈیرہ کلچر'' کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ مجھے اندرونِ سندھ جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ یہ ناول پڑھ کر میں نے حقیقی سندھ سے ملاقات کی ہے جس نے ترقی کے اس دور میں بھی اپنی قدامت کو راسخ مزاجی سے قائم رکھا ہوا ہے۔ ناول ''وبا'' ایک ہسپتال کے تناظر میں لکھا گیا ایک ایسا ناول ہے جس نے مجھے اختر اورینوی کا افسانہ ''کلیاں اور کانٹے'' اور اشفاق احمد کا افسانہ ''شب خون'' یاد دلایا۔ حسن منظر نے یہ ناول زمانۂ حال کے گردوپیش میں لکھا ہے۔ میں نے اس کا ذکر انور محمود خالد صاحب سے کیا تو انہوں نے بھی میری تائید کی کہ اختر اورینوی اور اشفاق احمد کے افسانے زندگی کی قاشیں ہیں لیکن حسن منظر نے زندگی کے پورے ''کُل'' کی عکاسی کی ہے اور اس میں ہسپتال سے باہر کی ''واقعاتی حقیقت'' بھی سما گئی ہے۔ مراد ''کرپشن'' سے ہے جو ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ گئی ہے۔ ''ہبر شیبا کی لڑکی'' اور ''ماں بیٹی'' دو طویل افسانے ہیں جن کی وسعت کو ناول کا عنوان بھی دیا جا سکتا ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں ڈاکٹر آصف فرخی صاحب کا مضمون ''اجنبی سرزمینوں سے.....'' ان دونا ولوں کے بارے میں ہی ہے۔ اور اس کی جتنی تحسین کی جائے کم ہے۔ مجھے افسوس یہ ہے کہ میں ان سب ناولوں پر الگ الگ مضمون لکھنا چاہتا ہوں لیکن درد کی شدت میری اس خواہش کی تکمیل میں حائل ہے۔

اب مجھے یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ پاکستان نے حسن منظر کو دریافت کرنے اور ان کے فن کی تحسین کرنے میں تاخیر کی ہے۔ انہیں سب سے پہلے

بھارت کے رسالہ ''نیاورق'' نے ان کے شایانِ شان طریق سے متعارف کرایا۔ اس کے بعد احمد زین الدین نے اپنے رسالہ ''روشنائی'' میں حسن منظر پر ایک گوشہ پیش کیا۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان کی کتاب ''خاک کا رتبہ'' پر ایوارڈ پیش کیا۔ میں درد کی شدت کے باوجود بیساکھی لے کر دسمبر ۲۰۰۹ میں اہلِ قلم کانفرنس اسلام آباد پہنچا کہ حسن منظر سے ملاقات ہوگی لیکن انہوں نے اپنی بے نیازی قائم رکھی اور اپنا ایوارڈ لینے کے لیے کانفرنس میں تشریف نہ لائے۔ اب ''چہارسوٗ'' نے انہیں ''قرطاسِ اعزاز'' پیش کیا ہے تو مجھے بے پایاں خوشی ہوئی کہ ''چہارسوٗ'' ایک سچے ادیب کی پذیرائی میں پیش پیش ہے۔ اس حصّے کے سب مضامین میں نے دلچسپی سے پڑھے ہیں۔ بالخصوص حسن منظر کا انٹرویو متعدد نئی معلومات کا خزینہ ہے۔ میں اس گوشے کی اشاعت پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

میں پہلے بھی متعدد مرتبہ لکھ چکا ہوں اور اب پھر اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ ''چہارسوٗ'' کے ادیبوں پر گوشے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے سکالروں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہیں۔ میرے ادبی کام میں یہ گوشے اور بالخصوص آپ کے انٹرویوز ہمیشہ معاون بنے ہیں۔ آپ نے انٹرویوز کی ایک کتاب شائع کر کے عمدہ خدمت انجام دی ہے۔ میری درخواست ہے کہ اس سلسلے کو آگے بڑھایئے اور انٹرویوز کی دوسری کتاب اور تیسری کتاب بھی پیش کیجیے۔ میں اس وقت حسن منظر کے فن کے سحر سے مسحور ہوں۔ جتندر بلّو کے افسانے ''آخری پڑاؤ'' شکیلہ رفیق کے افسانے ''آموختہ'' اور افسانہ ''بجھا ہوا سورج'' (یٰسین احمد) اور ''پیا ملن کی آس'' (گلزار جاوید) کا تجزیہ کرنے کا آرزومند ہوں۔ لیکن فی الوقت مجبور ہوں کہ یہ کام کسی اگلی صحبت پر ملتوی کر دوں کہ ریڑھ کے آخری مہرے سے ''شیا ٹیکا پین'' آغاز کر رہا ہے اور میرے دائیں ٹخنے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔ اپنے ایک ذاتی صدمے کو آپ نے جس صابرانہ انداز میں برداشت کیا ہے وہ بے مثل ہے۔ ''چہارسوٗ'' کے قارئین کو علم بھی نہیں ہونے دیا کہ آپ پر کیسی قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ خدا آپ کی حوصلہ مندی کو قائم رکھے۔

انور سدید (لاہور)

برادرِ عزیز و مکرم گلزار جاوید صاحب! سلام مسنون۔

ڈاکٹر حسن منظر کے لیے بھی قرطاسِ اعزاز اچھا لگا۔ میں انہیں ۱۹۵۲ء سے جانتا ہوں۔ میں اُن دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور کا جائنٹ سیکرٹری تھا اور انجمن کے اجلاس نکلسن روڈ پر مظہر علی خاں مرحوم ایڈیٹر ''پاکستان ٹائمز'' کے گیراج میں ہوتے تھے۔ خدیجہ مستور لاہور شاخ کی سیکرٹری تھیں۔ ہفتہ وار پروگرام مرتب کرنا اور اجلاس کا بندوبست کرنا میری ذمہ داری تھی۔ جمعہ کی سہ پہر اجلاس ہوتے تھے۔ میں ذرا جلد پہنچ کر گیراج کے سامنے ایک بوسیدہ سی دری جھاڑ پونچھ کر بچھا دیتا اور دو ٹوٹی پھوٹی کرسیاں یہاں ایک مفلوک الحال میز کے سامنے رکھ دیتا اور وقتِ مقررہ پر اجلاس شروع کروا دیتا۔ وہیں حسن منظر بھی کبھی کبھی آ جاتے تھے۔ صفدر میر ان کی بہت حوصلہ افزائی کرتے لیکن حسن منظر اُس وقت بھی ایک اچھے افسانہ نگار تھے اور قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ کنگ ایڈورڈ کالج میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور میں ان دنوں ایل ایل بی کر رہا تھا۔ وہ کم آمیز تھے مگر انجمن اُنھیں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' کی پیش گوئی کی جا چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب مجھ سے چار سال چھوٹے ہیں۔ گویا ''برخوردار'' ہیں۔ آپ کی نگاہِ انتخاب نے صحیح شخصیت ڈھونڈی۔ ''چہارسوٗ'' میں اُن کی تصویر دیکھی تو چہرے پر بڑی بھلمنساہٹ نظر آئی۔ اللہ آپ دونوں کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے۔

امین راحت چغتائی (راولپنڈی)

محترم گلزار صاحب

چہارسو کا تازہ شمارہ بھیجنے کا شکریہ۔ حسبِ امید نظم و نثر کی اعلیٰ قدروں سے لبریز۔ آپ کسی شمارے میں مایوس نہیں کرتے۔ افسانے سارے بہت معیاری تھے۔ شکیلہ رفیق بہت منجھی ہوئی مصنفہ ہیں۔ اور پھر پڑوسن بھی (کینیڈا) میں۔ اُن کے افسانے کا اختتام خصوصاً قاری کو متجسس رکھتا ہے۔ آپ کو اللہ نے بیانیے پر خوب عبور دیا ہے۔ جس سے آپ وہ سماں باندھتے ہیں کہ قاری کو محسوس ہو وہ واقع کا حصہ ہے یا کہانی اسکی آنکھوں کے سامنے چل رہی ہے۔ اس فن کا مظاہرہ آپ نے ''پیا ملن کی آس'' میں بھی کیا ہے۔ اس بظاہر سامنے کی کہانی کے پس منظر میں ایک اور کہانی چل رہی تھی جو افسانے میں مصنف اور اسکی بیوی کے درمیان تناؤ اور ازدواجی مسائل کی کہانی ہے۔ افسانہ ''کانگریس ہاؤس'' کا اختتام عام اور متوقع تھا۔ افسانے ''ضمیر کے بندھن'' میں خاص کردار کا نام بار بار بدلتا ہے کبھی فریدہ ہو جاتا ہے کہیں فرخندہ۔ اس بظاہر معمولی سے غلطی سے قاری کا ذہن بٹتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ مدیر نے نہ مصنفہ نے کہانی کو دہرایا ہے۔ سب سے زیادہ جتندر بلّو ''آخری پڑاؤ'' پسند آیا۔ افسانے کا عنوان بہت اچھا ہے۔ مصنف نے ایک بہت اہم اور حالیہ ضرورت پر قلم اٹھایا ہے۔ اس مشکل موضوع کو بہت خوبی سے افسانے میں بُنا گیا ہے۔ شعبہ طب میں ہونے والی ترقی نے جہاں انسانی زندگی کو طوالت دی ہے وہیں ان گنت مسائل کو جنم دیا ہے جن میں سے ایک بڑی خوبی سے اس افسانے میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ ایشائی خاندان جو مغرب کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں لیکن اپنی مشرقی اقدار پر پابند رہتے ہیں وہ زیادہ پریشان ہوتے ہیں۔ یہاں مغرب میں پھیلے ہوئے خاندان کی بنیاد اتنی مضبوط نہیں کہ اس پر کچی دیواریں کھڑی رہ سکیں، اگر گھر کا کوئی بزرگ مفلوج ہو جائے تو ہماری اقدار اور معاشرت ''نرسنگ ہوم'' کی موافق نہیں۔ گھر پر اتنی مدد بھی مہیا نہیں ہوتی کہ آپ گھر پر خدمت کر سکیں۔ نئی معاشرت، اقتصادی حقیقتوں اور بڑھتی ہوئی عمر نے

جو مسائل پیدا کئے ہیں ہمارے معاشرے نے ابھی ان پر بحث نہیں کی۔ نئے ''نارمل'' اور قابل قبول حل نہیں نکالے۔ قلمکاروں کو ان اہم مسائل پر ضرور لکھنا چاہیے۔ مامون ایمن میرے مربی ہیں۔ شمالی امریکہ کے اہم قلم کار۔ شمالی امریکہ میں اردو کے پھلنے پھولنے میں ان کا اہم کردار ہے۔ ان کا ''عبداللہ جاوید'' کے فن پر بہت پُر مغز اور جاندار مقالہ ہے۔ ڈاکٹر حسن منظر میرے اپنے شہر حیدر آباد کے نامور سائیکاٹرسٹ ہیں۔ آپ نے ان کی نظم ونثر کا بہت اچھا عمومی جائزہ لیا ہے۔ آپ کی انٹرویو کی تکنیک، بہت برجستہ، گہری اور معنی خیز ہے۔ اس کا مظاہرہ آپ پچھلے شمارے میں ڈاکٹر طوق آر کے انٹرویو اور آپ کی کتاب ''براہِ راست'' کے تمام انٹرویوز میں بھی کر چکے ہیں۔ شاعری عموماً بہت اچھی تھی۔ بہت سے اشعار پسند آئے خاص کر ڈاکٹر رضی کا یہ شعر

ایسا بھی نہیں کہ نہیں کرتا میں خطائیں
اک بار جو کرلوں وہ دوبارہ نہیں کرتا

ڈاکٹر سید محمد رضی غالباً پبلک اسکول حیدر آباد میں ایک سال مجھ سے جونیئر تھے۔ اگر میری یہ تحریر ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گزرے تو وہ ضرور مجھ سے رابطہ کریں۔

سید سعید نقوی (نیویارک)

حیات جاوید کے گل وگلزار! السلام علیکم۔

ڈاک کے آئے جائے میں کھنڈت پڑی ہوئی تھی۔ سلسلہ بحال ہوا تو ''چہارسُو'' کا منہ دیکھا گویا مثنوی گلزارِ نسیم کا ساسماں دیکھنے کو ملا۔ آپ کا رقعہ ملفوف تھا۔ ان چند سطروں کا مزہ کچھ اور تھا۔ اس ''پارہ کاغذ'' میں اخلاص و مروّت کا ایک جہاں آباد تھا۔ ''چہارسُو'' کے مضمرات حسبِ دستور دل نشیں و کیف آفریں ہیں۔ سارا رسالہ تو ابھی نہیں پڑھا۔ جو جو دیکھا وہ وہ خوب پایا۔ سب سے پہلے خطوط پڑھے۔ پروین کمار اشک صاحب نے اس ناچیز کو بھی مذکور کیا ہے۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔ پٹھان کوٹ کی سرزمین سے اپنی بھی یاد اللہ رہی ہے۔ دھرم شالہ کے پاس ایک موضع ہے ''رہلو''۔ بس وہاں ہمارے جرال عزیز تھے جو ہجرت کر کے لاہور آ گئے تھے۔ کچھ عزیز وزیر آباد (ثمن برج) میں ہیں۔ (میرا ننھیال) قرطاسِ اعزاز' حسن منظر!! خوب! بھائی خوب، ان کی قلمی معجز نمائیاں اپنی نظر میں ہیں۔ خوب لکھتے ہیں۔ آپ نے ''چہارسُو'' کی ادبیت کو جس انداز سے یکسو کیا ہوا ہے وہ کچھ آپ ہی کا حصہ ہے۔

آصف ثاقب (ایبٹ آباد)

بھائی گلزار جاوید صاحب' السلام علیکم۔

تازہ ''چہارسُو'' (مئی/ جون ۲۰۱۰ء) نظر نواز ہوا جس میں حسن منظر کے نام قرطاسِ اعزاز دیکھ کر اور ڈاکٹر صاحب کے بارے میں تفصیلی وتخلیقی تعارف جان کر مسرت ہوئی۔ میں اس سے پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ شعر وادب کی سربرآوردہ شخصیتوں کو ادبی تاریخ میں ڈھونڈ نکالنا اب آہستہ آہستہ آپ نے اپنا فریضہ سمجھ لیا ہے بلکہ آپ کا یہ شوق ایک کارِ جنوں کے مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ اللہ آپ کو مزید توانائیاں و وسائل عطا کرے۔ آمین! فروری ۱۹۸۱ء سے لے کر اپریل ۱۹۹۸ء تک کے مشاہیر کے خطوط ہوں یا ادب کے نامی گرامی افراد کی آراء براہِ راست میں موصوف کا مکالمہ ہو یا رابندر ناتھ ٹیگور کی تحریر ''آرٹ کا مفہوم'' کا ترجمہ سارے مضامین ڈاکٹر حسن منظر کی ادبی جہتوں کو الگ الگ زاویوں سے منکشف کرتی ہیں اور یہی آپ کے قرطاسِ اعزاز کی خصوصیت کہلاتی ہے۔ مبارک ہو۔ افسانے' اس شمارے میں زیادہ تر مختصر ہیں لیکن خوب ہی نہیں بہت خوب ہیں۔ سب سے پیارا افسانہ گلزار جاوید کا ''پیا ملن کی آس'' تھا جس میں موڈرن عہد کے ایک عاشق کی کبیر داس کے ایک دوہے کے چوتھائی حصے کے ذریعے آپ نے عنوان کی برجستگی برقرار رکھی!

کا گا سب تن کھائیو' سو چُن چُن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو' انہیں پیا ملن کی آس

اس کے علاوہ ڈاکٹر سید سعید نقوی کا ''سراب'' ایک دل دہلا دینے والا افسانہ تھا جس میں انسان کے بھرم کو سفاکی سے توڑ دینے والی تلخ حقیقت چیخ رہی تھی۔ پھر ''کانگریس ہاؤس'' میں مراق مرزا کا عکسِ ممبئی اور یاسین احمد کا ''بجھا ہوا سورج'' بڑے شہروں میں جنم لینے اور ایسے امراضِ متعدی ہیں جن کا علاج شاید کینسر اور ایڈز جیسے امراض سے بھی مشکل ہو۔

غالب عرفان (کراچی)

برادرِ عزیز گلزار جاوید' السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ۔

چہارسوآ تا ہے تو مجھے راولپنڈی کے شب وروز یاد آ جاتے ہیں' جن کی خوشبو رسالے میں رچی ہوئی ہوتی ہے۔ مضامین' نثر و نظم دونوں ہی میرے لئے بے حد دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں اس لئے کہ ان کے انتخاب میں آپ کے حسن ادارت کا کمال شامل ہوتا ہے۔ مشکور حسین یاد کی غزل میں لفظ ''مقدمہ'' ایسا وارد ہوا کہ میں تذبذب میں رہا' مجھے آپ سے یہ معلوم کرنا ہے ''مقدمہ'' دال پر تشدید ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ ان کے مصرع کی ساخت میں یہ لفظ تشدید کے بغیر استعمال ہوا ہے۔ اور یوں ہے:

مقدمہ فوجداری عدل دیوانی میں لائے ہیں

مفاعلین کے اوزان کے تحت ''مقدمہ'' اگر دال پر تشدید کے ساتھ پڑھا جائے تو بے وزن ہو جاتا ہے۔ اعتراض نہیں' مجھے اپنی کم علمی کا اعتراف ہے میں صرف اپنے علم میں اضافے کا خواہشمند ہوں' براہ کرم اس کی وضاحت ضرور کیجیے گا۔ حسن منظر صاحب کی تخلیقات جو چہارسو میں شائع ہوئیں وہ کارآمد اور دلچسپ ضرور ہیں لیکن افسوس کہ اردو پر ان کی گرفت نہایت کمزور ہے۔ البتہ ان کے بارے میں مضامین اچھے لکھے گئے ہیں۔

نقشبند قمر بھوپالی (امریکہ)

محترمی گلزار جاوید صاحب' السلام علیکم۔

''چہارسوُ'' برابرمل رہا ہے۔''کس منہ سے شکر کیجیے اس لطف خاص کا'' مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ برصغیر کے جن چند محدود رسائل کے ہر نئے شمارے کا مجھے بے صبری سے انتظار رہتا ہے ان میں ''چہارسُو'' سرفہرست ہے۔ اس کے ہر شمارے کے مطالعہ سے سیرابیٔ ذوق کا ایک نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی نظر سدا بہتر سے بہتر کی طرف رہتی ہے۔ ماشاءاللہ۔ چشم بددور۔ ہمارے عصر کے بلند قامت افسانہ نگار حسن منظر صاحب کی شخصیت وفن کی بابت عمدہ اور بھرپور پیشکش پر مبارک باد قبول کیجیے۔

غلام مرتضٰی راہی (فتح پور' بھارت)

برادرِ محترم گلزار جاوید صاحب' السلام علیکم۔

مئی جون ۲۰۱۰ء کا شمارہ کافی عرصہ پہلے موصول ہوا تھا لیکن نا سازیٔ طبع کی بنا پر نہ اُس کی وصولیابی سے مطلع کر سکا اور نہ ہی فون پر آپ سے کوئی بات ہو سکی جس کی معذرت کا خواستگار ہوں۔ کل ہی ایک غزل ہوئی ہے جو سلام رُوستائی کے طور پر ارسال ہے پرچہ حسبِ معمول صُوری و معنوی ہر دو لحاظ سے دقیع اور جاذبِ فکر و نظر ہے۔ ڈاکٹر حسن منظر کے فن اور انکی شخصیت سے متعلق ''چہارسوُ'' کا گوشہ منسوب کر کے آپ نے بہت بڑا فرض ادا کیا ہے جوان کا اردو ادب و زبان پر بڑے عرصے سے واجب تھا اللہ تعالےٰ ان کو علم و ادب اور زبان کی خدمت کے لئے زندہ و سلامت رکھے ایسے ہی بے لوث ادبی کارکنوں سے اردو ادب کا گلشن شاداب اور تر و تازہ ہے۔

اللہ کرے ذوقِ ادب اور زیادہ

چہارسو کی وساطت سے مہندر پرتاپ چاند صاحب نے سلام بھیجا ہے اور تحقیقی پروجیکٹ میں ان کی اعانت کرنے پر شکریہ ادا کیا ہے جس کے لئے جوابی طور پر ان کا بہت بہت شکریہ۔ وہ بڑے پُر خلوص اور وضعدار انسان ہیں اور میرے آبائی شہر میں رہائش پذیر ہیں خداوند کریم انہیں سلامت رکھے دنیا ایسے ہی پُر خلوص بے لوث اور وضعدار انسانوں کے دم سے آباد ہے۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ:

آدمیّت اِحترام آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

اور۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو!!
ورنہ اطاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

سرور انبالوی (راولپنڈی)

محترمی و مکرمی گلزار جاوید صاحب' سلام و رحمت!

بہت دن ہوئے ہیں چہارسو کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اس کا کچھ حصہ پڑھا پھر گھر میں کہیں رکھ کر بھول گیا۔ شکر الحمدللہ آج دوبارہ شمارہ سامنے آیا ہے تو یہ سطور قلمبند کرنے بیٹھ گیا ہوں۔ اس مرتبہ کا قرطاسِ اعزاز حسن منظر کے نام ہے جو نہایت موزوں اور برمحل ہے۔ واقعی ہمارا یہ تخلیق کار اس بات کا سزاوار ہے کہ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ افسانوی ادب میں ان کی خدمات قابلِ تحسین ہیں بالخصوص ان کا ناول ''دھنی بخش کے بیٹے'' میرے لیے یہ بات باعث افتخار ہے کہ وہ ''Formanite'' ہیں۔ میں اپنے اردو شعبے کے احباب کو اُن سے متعلق ''چہارسوُ'' کے صفحات کا ضرور دیدار کراؤں گا۔

غفور شاہ قاسم (لاہور)

مدیرِ محترم' سلام و رحمت۔

نجانے کن نیک ساعتوں میں ''چہارسوُ'' ادبی جریدے کے لئے تجویز کیا گیا ہوگا جو آپ کی بے حساب محبتوں و بے پناہ محنتوں سے روز بروز سجتا' سنورتا اور نکھرتا چلا جا رہا ہے جس کے چرچے چارسُو ساری سمتوں تعریف و توصیف اور پوری خدائی میں پذیرائی......اللہ اللہ! ترقی کے نامور شیدائی اُردو جناب خلیل طوق آر سے منسوب خصوصی گوشہ یقیناً کارہائے نمایاں میں رہا ہوگا اس کی سوفٹ کاپی سے مستفید ہو کے ای۔میل کرونگی۔ ڈاکٹر حسن منظر صاحب کے نام ''قرطاسِ اعزاز'' کو بھی بہت عمدہ نگارشات و تاثرات سے مزین پایا' پوئیٹری سینئر ڈائریکٹر کا ڈاکٹر صاحب کے نام مکتوب گرانقدر اعزاز و افتخار محسوس ہوا کہ فکشن پرائز کیلئے اُن کی غیر معمولی تصنیف کا انتخاب ہوا اور اسقدر سراہا گیا' حلقہ دام خیال' میں بھی جملہ معتبرین و معاصرین نے اُن کے افسانوی اسلوب و بیان کے اوصاف کا بھرپور اعتراف کیا ہے اور ''براہِ راست'' نے کچھ کہنے سننے' جاننے و کھوجنے کے معرکتہ الآرا مراحل ہمیشہ ہنرمندی و کامیابی سے طے کئے ہیں......نقشِ لاثانی، متاعِ غنچہ وگل' رشتے راشن کارڈ نہیں کے عنوانات سے شعر و سخن کے حصے کو شعری لطافتوں و ادبی نزاکتوں سے مرصّع پایا۔ ''داستان حیات'' سے سوانحی خاکوں کی شروعات کا احساس ہوا ابھی پیش و گفتار (ہوا کے دوش پر) کو جستہ جستہ پڑھنے سے لگا کہ سوانح نگار غیر معمولی شخصیات کے زمرے میں آتے ہیں غالباً ''کسرِ نفسی سے ایسا کہہ گئے وگرنہ عام لوگوں کے پاس کہنے لکھنے کو یہ سب کچھ کہاں......ورثے میں ''سرزمین زرفشاں'' کو مادرِ علمی کی تحسین کے حوالے سے بہت خوب پایا' اچھی کہانیاں بھی ذہن کیلئے کسی تواضع سے کم نہیں ہوتیں مگر ابھی ''پیا ملن کی آس'' ہی پڑھی اور ریل کے سفر و روح کی آواز کے مابین بُنے تانے بانے، سوچنے وڈھونڈنے کی کوشش جاری ہے۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

بھائی گلزار جاوید! السلام علیکم۔

چہارسو کے تازہ شمارے پر ڈاکٹر حسن منظر کی تصویریں دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ آپ نے ایک سنجیدہ اور منفرد تخلیق کار کو ''قرطاسِ اعزاز'' پیش کر کے ایک اور کارنامہ انجام دیا ہے۔ بہت خوب! ڈاکٹر حسن منظر اردو کے تر وتازہ افسانہ نگار ہیں اُن کے ناول بھی پسند کیے گئے ہیں۔ ''براہ راست'' میں آپ کے سوالات اور ڈاکٹر صاحب کے جوابات معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ کچھ اختلافی سوالات مثلاً آپ کا انداز تحریر نامانوس اور رائج اردو بیانیے سے ہٹا ہوا ہے یا کچھ لوگ آپ کو ابہام سے پاک افسانہ نگار قرار دیتے ہیں کچھ کے نزدیک آپ پر باب کنگ کے اثرات نمایاں ہیں ''ضمیر کو جگانے والی کہانیاں'' اُن کے چوتھے مجموعے ''سوئی بھوک'' کی کہانیوں کا تجزیہ نفسیاتی پیمانوں سے کیا ہے۔ سہیل احمد خاں نے ''انسان کا دیش'' کا جائزہ لسانی اور موضوعات کے حوالے سے کیا ہے اور نہایت ذہانت سے ایک ایک جملے میں موازنے کی کیفیت پیدا کی ہے۔ مثلاً ''حسن منظر کے اندازِ تحریر کو مظہریاتی PHENOMENOLOGICAL قرار دیا ہے'' ''مظہریت منٹو کے ہاں عروج پر ہے'' بہت اہم مضمون ہے۔ مسکین احمد منصور کا مضمون ''اشکوں میں رعنائی'' ڈاکٹر صاحب کے ناول ''العاصفہ'' کا تفصیلی تجزیہ ہے۔ یہ ناول پچھلے دنوں خاصا زیرِ بحث رہا ہے اور دونوں قسم کے تبصرے سامنے آئے ہیں۔

''ہوا کے دوش پر'' (ایک عام آدمی کی داستانِ حیات) میں فیروز عالم کا انداز اور واقعات کا انتخاب لاجواب ہے۔ کس سادگی اور سچائی سے کہانی نذر قرطاس کی ہے یہ داستان آگے چلنی چاہیے۔ غالب عرفان اور احسان احمد شیخ کی نعتوں سے سیرت و کردار کی صفات سامنے آتی ہیں۔ سید مشکور حسین یاد صاحب کی غزل انفرادیت و تر وتازگی لیے ہوئے ہے۔ امین راحت چغتائی، جمیل یوسف، ولی عالم شاہین (غالب کی زمین میں) سید معراج جامی، اکرام تبسم، اختر رضا سلیمی، ڈاکٹر سید رضی محمد اور منظور ثاقب کی غزلیں عصری شعور کے ساتھ ساتھ روایت کی پاس دار بھی ہیں۔ ڈاکٹر نثار ترابی، حمیرا راحت، ندیم ہاشمی، عظمیٰ صدیقی، اسد بیگ، سیف الرحمان سیفی نے چھوٹی بحر میں خوب صورت شعر نکالے ہیں۔ ڈاکٹر نثار ترابی ''غزل آشنا'' اور منفرد شاعر ہیں۔ منظور ثاقب کا مطلع اچھا لگا۔

میں تیری یاد میں الجھا مقدمے کی طرح
مگر تو مجھ سے رہا دُور فیصلے کی طرح

نظموں میں گلزار کی ''بارش آنے سے پہلے'' ''وقت کو جتنا گوندھ سکے ہم۔۔۔'' ندا فاضلی کی نظم ''وہ اور میں'' فیصل عظیم کی ''شام ڈھلے'' محمد عثمان جامعی کی ''فسادیوں سے'' اپنے خاص اسلوب اور فکری زاویے کے حوالے سے مختلف نظمیں ہیں۔ ڈاکٹر سید سعید نقوی کا افسانہ ''سراب'' افسانہ کی ایک پرانی طرز ''خط'' کے انداز میں تحریر کردہ پر کشش افسانہ ہے۔ دو دوستوں کے خطوط کے تبادلے میں امریکا اور پاکستان کی معاشرت اور سیاسی ماحول پر طنز اور دو دوستوں کی محبت کی داستان ہے اختتام چونکا دینے والا ہے۔ ''ضمیر کے بندھن'' میں روحی فرخ نے دو کرداروں کے ذریعے ''خیر اور شر'' کو نمایاں کیا ہے۔ یہ معاشرہ ایک بیوہ یا طلاق یافتہ خواتین پر زندگی کی رونقیں کیوں ختم کر دیتا ہے اُن کے جذبات واحساسات کا خیال کیوں نہیں رکھا جاتا بلکہ مجبور اُنھیں غلط راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جاتا یا آزادی دے دی جاتی ہے جو چاہیں کریں۔ افسانہ ''کانگریس ہاؤس'' بہتر ہے۔ محترمہ شکیلہ رفیق کا افسانہ اپنی گرفت میں نہیں لے سکا۔ گلزار بھائی! آپ افسانے میں جس مہارت سے جزئیات پیش کرتے ہیں وہ آپ ہی کا حصّہ ہے آپ نے کیفیات کو ''پیا ملن کی آس'' میں ڈھالا ہے ''غزالہ'' کا کردار اچھا تخلیق کیا ہے۔ شہناز خانم عابدی کا افسانہ ''سجدہ'' اسم بامسمیٰ ہے۔ اللہ پر کامل یقین، خلق خدا کے کام آنا اور صبر وشکر کی زندگی اپنانا' افسانے پر بڑی محنت کی ہے۔ عطیہ سکندر علی نے ''حلقۂ دام خیال'' کو زمانی لحاظ سے ترتیب دیا ہے۔ حسن منظر صاحب کی نگارشات کا حُسن ''چہارسو'' کی معنویت میں اضافہ کر رہا ہے۔ رس رابطے میں سرور انبالوی، حسن عسکری کاظمی اور فیروز عالم کے خطوط اہم ہیں۔

نوید سروش (میر پور خاص)

برادرم گلزار جاوید! آداب۔

چہارسُو کا شمارہ مئی جون اپنے دامن میں ادب کے پھول لئے موصول ہوا۔ ڈاکٹر حسن منظر کو قرطاسِ اعزاز سے سرفراز کر کے آپ نے بہت نیک کام کیا ہے۔ ''دامِ خیال'' میں تاثرات پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ کتنے بڑے بڑے جغادری ادیب ان کے حلقۂ احباب میں شامل رہے ہیں۔ ہمیشہ کی مانند اس بار بھی آپ نے براہِ راست کی ذریعے صاحبِ قرطاسِ اعزاز کی شخصیت وفن سے بھر پور تعارف کرایا ہے۔ منظر صاحب کی نسبت تحریر کیے گئے تمام مضامین بہت معلوماتی اور پُر مغز ہیں۔ خاص کر حسن منظر کی کہانی ''تابوت'' لاجواب چیز ہے۔ جتندر بلّو کا ''آخری پڑاؤ'' شکیلہ رفیق کا ''آموختہ'' اور مراق مرزا کا ''کانگریس ہاؤس'' بہت اچھے افسانے ہیں۔ آپ کی کہانی ''پیا ملن کی آس'' اپنی فنکارانہ صلاحیت کے باعث قاری کے تجسس کو آخر تک برقرار رکھنے میں کامیاب ہے۔ حصہ شاعری میں مشکور حسین یاد، کرشن کمار طور، امین راحت چغتا ئی، ندا فاضلی، سیفی سرونجی، سُرور انبالوی، غلام مرتضٰی راہی، غالب عرفان، مہندر پرتاپ چاند، تشنہ بریلوی، معراج جامی، شباب للت، کوثر صدیقی اور زہیر کنجاہی کی تخلیقات نے بہت متاثر کیا۔ ڈاکٹر رینو بہل نے امرتا پریتم کی نظم کا ترجمہ اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ نظم اصل معلوم ہوتی ہے جیسے اُردو میں لکھی گئی ہو۔

نارنگ ساقی (دہلی، بھارت)

☆

پنجاب ساحر کلچرل اکیڈمی کی جانب سے دعوت نامہ

قلم قبیلے میں شامل دوستو۔

سرزمینِ پنجاب جو کبھی اردو زبان و ادب کا گہوارہ تھی۔ ادب کی وہ زرخیز دھرتی آج بنجر ہوتی جا رہی ہے۔ گلشنِ اردو میں مہکتے ہوئے جو چند گلاب آج بھی فضا کو معطّر کر رہے ہیں ان میں ایک پنجاب ساحر کلچرل اکیڈمی ہے جس نے گذشتہ اڑتیس برسوں سے عالمی ادبی منظر نامے پر اپنی ایک خاص پہچان قائم کی ہے۔ سالانہ جشنِ ساحر، عالمی مشاعرہ، ساحر و ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ، ساحر میموریل لیکچر سیریز، منٹو کہانی سیمینار، پوئیٹری فیسٹیول اور اُردو، ہندی و گورمکھی زبانوں میں اُردو ادب کی اشاعت اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے اکیڈمی کی چند مخلصانہ کوششیں ہیں۔ ساحر کلچرل اکیڈمی کے زیرِ اہتمام اُردو ادب کا عالمی جریدہ سہ ماہی ''ادیب انٹرنیشنل'' کا اجراء اسی حوالے سے اُردو کے لئے اکیڈمی کی ایک اور کوشش ہے۔

اطلاعاً عرض ہے کہ ''ادیب انٹرنیشنل'' کا پہلا شمارہ (خاص نمبر) نہایت آب و تاب کے ساتھ ماہ اکتوبر میں منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ اُردو ادب کا یہ سہ ماہی جریدہ ایک جلد میں بیک وقت اردو اور دیوناگری (ہندی) رسم الخط میں شائع ہوگا۔ اس کا مقصد جہاں باذوق اردو قارئین کو بھرپور تخلیقی ادب کے مطالعے کی دعوت دینا ہے وہاں اردو زبان و ادب کی بے پناہ کشش اور شیرینیت کو ہندی کے اُن قارئین تک پہنچانا ہے جو اُردو ادب کے مطالعے میں دلچسپی تو رکھتے ہیں لیکن اردو رسم الخط سے ناواقف ہیں۔

بھارت پاک دوستی ہمارا ایک دیرینہ خواب ہے اور اس خواب کی تعبیر کے لیے خلوص، محبت، امن اور دوستی کی چاہتوں کے ساتھ ہم جریدہ ''ادیب انٹرنیشنل'' بھارت پاک دوستی کے نام منسوب کرتے ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ دونوں دیشوں میں تخلیق ہو رہے اردو ادب کو یکساں طور پر دونوں ممالک کے قارئین تک پہنچایا جائے۔ پہلے اور آئندہ ہر شمارے میں بھارت اور پاکستان سے نمائندہ تخلیق کاروں کی نمائندگی یکساں طور پر ہوگی۔ اردو کی نئی عالمی بستیوں کے تخلیق کار بھی ادب کے اس کارواں کا اہم حصہ ہوں گے۔

بہترین نئی اور پُرانی کہانیاں، تخلیق کاروں کے ادبی و ذاتی زندگی نامے، عہدِ حاضر اور عہدِ ماضی کے قلمکاروں کے دلچسپ خاکے، مکالمہ، کسی ایک ادبی موضوع پر کھلی بحث، اردو کی عالمی بستیوں میں مقیم اہم ادبی شخصیات کا تذکرہ، طنز و مزاح، غزلیں، نظمیں، گیت، نئی کتابوں کا باتصویر جائزہ، عالمی سطح پر علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں اور قارئین کی چوپال کے ساتھ جریدہ ''ادیب انٹرنیشنل''، تخلیقی ادب سے بھرپور، کتابی سائز میں ہر صفحہ گرافک ڈیزائن سے مزیّن، آرٹ پیپر پر دیدہ زیب رنگا رنگ طباعت، لکیر سے ہٹ کر ایک منفرد پیشکش جو نہ صرف آپ کو دعوتِ مطالعہ دے گا بلکہ آپ کے بک شیلف کو بھی باوقار بنائے گا۔

ہماری دِلی خواہش ہے کہ اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے آپ ہماری اس مہم کا حصّہ بنیں۔ اُردو کو آج آپ کی ہمیشہ سے زیادہ ضرورت ہے۔ ہم آپ کو اس کاروانِ ادب میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔

جریدہ ''ادیب انٹرنیشنل'' کا اوّلین شمارہ اعزازی طور پر حاصل کرنے اور دیگر امور کے لئے رابطہ کریں۔

ڈاکٹر کیول دھیر .... چیئرمین: ساحر کلچرل اکیڈمی

Dr. KEWAL DHEER, Chairman SAHIR CULTURAL ACADEMY

B-116, B.R.S.NAGAR, LUDHIANA-141012 INDIA

E mail: adeeb@Shaircultural academy.com ......dr.kewaldheer@slfy.com

Phone: 0091-161-4628500, Cell: 0091-9815655805

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہار سو
راولپنڈی
میرے منتخب افسانے
ستیہ پال آنند
میری منتخب نظمیں
ستیہ پال آنند
ستیہ پال آنند
کی
نظم نگاری
یہ بات کسی سے اب پوشیدہ نہیں کہ ہمارے معاشرے بالخصوص اُردو دنیا میں کتاب کا کردار تیزی سے سمٹ اور سکڑ رہا ہے۔ ایک سبب اس کا اگر مادّی دنیا کی تیز رفتاری اور تیز تر طلب گاری ہے تو دوسرا سبب ادب اور ادیب کا محدود و مخصوص ہونا بھی ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ فیصلہ آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے کہ آپ اپنی نوجوان نسل کو الیکٹرانک میڈیا کے بے رحم ہاتھوں میں دے کر بے بس و بے کس رہنا چاہتے ہیں یا اپنی تہذیب ' ثقافت ' علمی و ادبی ورثے کی نگہبانی کا فریضہ سونپ کر انھیں مہذب ' مفید اور شائستہ انسان بنانے کے خواہش مند ہیں۔ آپ کا فیصلہ اگر اپنی تہذیب ' ثقافت اور علمی ورثے کے تسلسل کا غماز ہے تو نامور دانشور ' ادیب اور شاعر ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی درج بالا تینوں کتب آپ کی توجہ ' اشتیاق اور استحقاق کی نمائندگی کا فریضہ بحسن و خوبی نبھانے اور آپ کی توقعات کو مقام اولیٰ تک پہنچانے کے تمام تر خزینوں سے مالا مال ہیں۔
رابطہ: F-14/21-D ' کرشن نگر ' دہلی 110051 ' بھارت۔